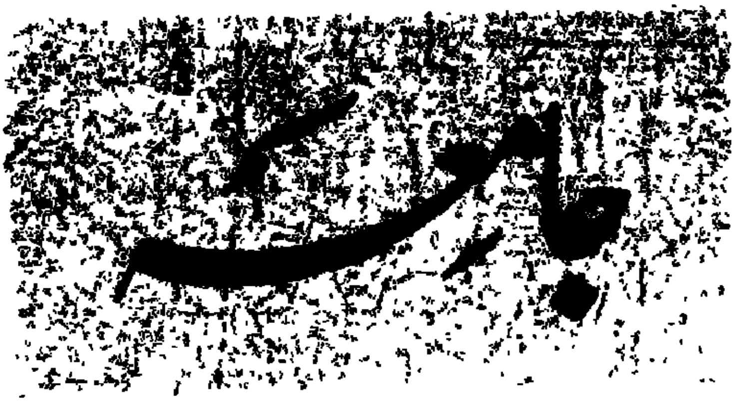
۷

جوڈی – دسمبر ۲۳ء

جلد ۲۸ (۶-۱)



مـ

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت، ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۲	جولائی ۳۲ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ ۔ فی پرچہ ۸

(پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔)

مُسلمانانِ ہند کا نصب العین

قوموں کی زندگی کسی نصب العین کو پیشِ نظر رکھے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ انسان اور حیوان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ انسان کسی مقصد کی تکمیل چاہتا ہے حیوان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ حیوان میں صرف جبلت اور فطری خواہشات ہوتی ہیں۔ انسان میں بھی بحیثیت ایک حیوان کے یہ چیزیں ضرور ہوتی ہیں لیکن وہ انھیں ایک عقلی نظام کے تحت لاتا ہے کہ متعینہ مقصد حاصل کر سکے۔ جن افراد اور اقوام کے پیشِ نظر کوئی مقصد نہیں ہوتا وہ چوپاؤں کی طرح زندگی گذارتی ہیں۔

مسلمانانِ ہند اگر چوپاؤں کی طرح زندگی نہیں گذارنا چاہتے تو انھیں اپنی زندگی کا مقصد متعین کرنا چاہیئے۔ انھیں وہ نصب العین واضح کر لینا چاہیئے جس کے حصول کے لئے ان کی تمام جد وجہد مخصوص ہے۔

نصب العین کا تعین آسان کام نہیں۔ اس کے متعین کرتے وقت ہمیں بہت سے عناصر پر نظر رکھنی چاہیئے۔ سب سے اہم تو وہ عناصر ہیں جو انسانی زندگی میں ازلی اور ابدی ہیں۔ جن پر تمام انسانیت اور تمام کائنات کی بنیادیں قائم ہیں یہ انسانی زندگی کے ایزدی عناصر ہیں دوم ہر قوم کی ایک مخصوص تاریخ ہوتی ہے وہ اپنے نفسی خواص کی بنا پر اس تاریخی عہد میں ایک خاص انداز پر نشو ونما پاتی ہے۔ اس تاریخی ماحول سے قوم کو کلیتاً علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی زندگی کو اگر اس ماحول سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ اسی طرح سوکھ جاتی ہے جس طرح ایک پودا دوسری ناسازگار زمین میں اگانے سے مرجھا جاتا ہے

۱۔ اسلام | کائنات کے ازلی اور ابدی قوانین کو دوسرے الفاظ میں اسلام کہا جاتا ہے۔ اسلام خالق اور کائنات میں رشتے کا نام ہے۔ وہ بندے اور اس کے پیدا کرنے والے کے درمیان

مضبوط کڑی ہے۔ وہ اطاعت کلی کا نام ہے۔ اس ہمہ گیر قانون کا جو فرش و عرش۔ آسمان و زمین۔ چاند سورج۔ دن رات غرض فطرت کے ہر مظہر اور قدرت کی ہر نیرنگی میں جاری و ساری ہے۔

کوئی فرد اور کوئی قوم جب تک اس فطری قانون کی پیروی نہ کرے دنیا و آخرۃ میں سرخروئی حاصل نہیں کرسکتی۔ قرآن میں مسلم کی دعا ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً

بنیاد کے بغیر انسانی زندگی اور تمدن کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی جس قدر شدت کے ساتھ اقوام عالم کو اس حقیقت اعلیٰ کا احساس ہوگا اسی قدر اصل ترقی و سرخروئی حاصل کریں گی جس قدر وہ اس ازلی روشنی سے دور ہونگی اسی قدر تاریکی کے ہیبت ناک غاروں میں جا گریں گی۔

مسلمانان ہند کو اس کا شدت سے احساس ہونا چاہیئے کہ وہ مسلم ہیں خدا کے اطاعت گذار بندے ہیں۔ وہ اس قانون کے پیرو ہیں جس کی تلقین انسانیت کے رہنما ازل سے کرتے آئے ہیں۔ وہ آدم و ابراہیم۔ رام و کرشن۔ بدھ اور کنفوشس۔ عیسیٰ و موسیٰ اور محمدؐ کے پیغام کے حامل ہیں۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ روحانیت کا ایک عالمگیر نظام اس مادی دنیا میں جاری و ساری ہے وہ ایک ایسی عالمگیر روح یعنی خدا کو تسلیم کرتے ہیں جو اس کائنات میں موجود بھی ہے اور اس سے ماوری بھی۔

۲۔ <u>اسلامی تمدن</u> اس روحانی بنیاد پر اسلام کے موسس آخر آنحضرت محمدؐ نے تمدن کی ایک عمارت قائم کی تھی۔ مقاصد روحانی کی تکمیل کے لئے انسان کو جد و جہد اور عمل کی ضرورت ہے۔ اسلام ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ نجات انسانی کے لئے غاروں اور پہاڑوں میں گوشہ نشینی کی تلقین نہیں کرتا اس کا تصور کائنات ثبوتی ہے۔ وہ زندگی میں یقین رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی قوتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے تاکہ کائنات کے ہر ذرہ میں جو مخفی قوتیں ہیں ابھریں اور نشو و نما پائیں۔ وہ اسی لئے عقل اور سائنس کا بہت بڑا موید ہے۔ اسلامی تمدن عقلی قوانین پر قائم ہے۔ تجربی سائنس کی بہت بڑی خدمت کرنے والے عرب تھے وہ دوسرے تمدنوں سے متاثر بھی ہوئے

تو ان کے صرف اُن ہی عناصر سے جو عقلی تھے افلاطون سے زائد ارسطو مسلمانوں میں مرغوب ہوا۔ مابعد الطبیعات سے زائد علوم طب کے چرچے مسلمانوں میں رہے۔ جدید مغربی عقلی تمدن، عرب تمدنی تحریک کا صرف ایک سلسلہ ہے۔

لیکن مادی اور عقلی ترقی کی اسلام میں کوئی بالذات حیثیت نہیں وہ اسے انسان کا خادم بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہ سائنس کا مخالف ہے اور نہ مشینوں کا لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انسان کا اخلاقی اجتماعی احساس بھی ترقی کرتا جائے۔ پھر انسان کو بھی وہ صرف انسان نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اس کی نشو و نما کے امکانات لامحدود ہیں۔ وہ انسانوں کو صفات اللہ سے متصف کرنا چاہتا ہے۔ وہ ان میں رحم، عدل، انصاف اور قوت پیدا کرنا چاہتا ہے اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ نے تمدن اسلامیہ کے اصول مرتب کئے۔

سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی غرض تمدن کے تمام شعبوں کے لئے اسلامی اصول مرتب کئے گئے ہیں۔ یہ ان اداروں میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ ان اصولوں پر جو ڈھانچہ کھڑا کیا گیا ہے وہ شریعت اسلامیہ ہے یہ شریعت بقول شاہ ولی اللہؒ کسی قوم کے خصائص ذاتی۔ اس کی تاریخ۔ اس کی روایات اس کی ذہنی سطح کے معیار غرضکہ اس زمانہ کے پورے ماحول کی پابند ہوتی ہے۔ رسول اللہ نے عرب قوم کے ان تمام خصائص کا خیال رکھتے ہوئے ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کی تھی تاکہ پھر وہ دوسری اقوام کے لئے مثال کا کام دے سکیں۔

اس زمانہ کے عرب کی اخلاقی زندگی مسلمانوں کے لئے بمنزلہ مثال کے ہے جس کا اتباع ہم سب پر فرض ہے۔

ان اخلاقی اصولوں پر جو تمدن گذشتہ تیرہ سو برس میں قائم کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے بے بہا عناصر ہیں جو اس وقت تک ہمارے لئے مفید ہیں اور ان کو برقرار رکھنا ہمارا فرض ہے۔

اسلام اور اسلامی تمدن کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کے

مسائل کو ان کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہمارا وجود انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو۔

لیکن انسانیت سے ہمارا واسطہ براہ راست نہیں ہے۔ پہلے ہم ایک ملک یعنی ہندوستان کے باشندے ہیں اور اس ذریعہ سے انسانیت کے ایک رکن ہیں۔

۳۔ ہندوستانی قومیت | ہندوستانی قومیت کا مسئلہ ہمارے لئے اسی واسطے بہت اہم ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق مسلمانان ہند میں جس قدر ذہنی انتشار ہے اس کا بیان بھی نہیں کیا جا سکتا بعض حضرات قومیت کے تصور ہی کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بعض قومیت کے نشے میں اس قدر سرشار ہیں کہ اسلام کو اس کے مقابلے میں ایک غیر ضروری چیز سمجھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ حضرات جب ان مسائل پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو نہ تو اسلام کا صحیح مفہوم ان کے ذہن میں ہوتا ہے اور نہ قومیت کا۔

بے شک وہ تصورِ قومیت جو بالذات مقصد اعلیٰ سمجھا جائے جو قوم کے مفاد کے لئے انسانیت۔ اخلاق اور مذہب کو برباد کر ڈالنا چاہے اسلام کے خلاف ہے۔ قومیت کے ایسے ہی غلط تصور کے باعث دنیا میں کشت و خون ہوتا ہے، خونخوار اقوام جامۂ انسانیت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں، دنیا صرف حرص و آز کی جولانگاہ بن جاتی ہے، بڑی طاقتور اقوام غریب اور کمزور اقوام کو خاک و خون میں ملا دیتی ہیں۔ انسانیت شہنشاہیت اور معاشی دست و برد کی بلا میں مبتلا ہو جاتی ہے جس سے مفتوح اور فاتح اقوام کے اخلاق برباد ہو جاتے ہیں۔ فاتح مغرور و متکبر ہو جاتے ہیں مفتوح بزدل اور خوشامد پسند۔ اس قسم کی قومیت کے تصور کی تلقین یورپ میں میکاولی نے کی تھی اور اقوام یورپ اب تک اسی پر عامل ہیں۔

لیکن قومیت کا ایک تصور ایسا بھی ہے جو اس کے بالکل خلاف ہے۔ اس تصور کے تحت ملک و قوم صرف ایک ذریعہ ہے انسانی خدمت کا۔ چونکہ تمام انسانوں کی خدمت انسان بیک وقت نہیں کر سکتا اس لئے اُسے اپنی جد و جہد اپنی قوم و ملک تک محدود کر دینی چاہئے۔ جس طرح

مختلف اجزاء ۔ قبائل اور خاندان ہیں اسی طرح مختلف اقوام بھی ہیں ۔ اور افراد کی طرح اقوام کی حرص و آز کو بھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ قومیت کا ثبوتی اخلاقی تصور اس تمام ظلم و جور کا مخالف ہے ۔ قومیت کے اس اخلاقی تصور اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ اسی قسم کی ایک قومیت کی تشکیل رسول اللہ نے عرب میں کی تھی جس کے ذریعہ انھوں نے تمام قبائل کے اختلافات کو مٹا کر ایک متحدہ عرب قومیت کی تعمیر کی تھی جس کی اساس اسلام تھی ۔ وطن کی اس محبت کو اسلام میں مستحسن قرار دیا گیا ہے بلکہ وہ تو مسلمان کے ایمان کا ایک جزو ہے ۔ اس اخلاقی قومیت کے تصور کے علمبردار عہد جدید میں فرانس میں روسو ۔ جرمنی میں فشٹے ۔ اٹلی میں میزینی عالم اسلامی میں جمال الدین افغانی ۔ چین میں سن یت سین اور ہندوستان میں گاندھی ٹیگور ۔ ابوالکلام اقبال ہیں ۔

اسلام اور قومیت کے اس ثبوتی اخلاقی روحانی تصور میں کوئی تضاد نہیں ۔ قومیت کے اس تصور کو پیش نظر رکھ کر ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان سے محبت کریں ۔ ہم کو ہندوستان اسی طرح عزیز ہونا چاہئے جس طرح رسول اللہ کو عرب تھا ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اقبال اگر صحیح قومیت کے جذبے سے سرشار ہو کر یہ گل فشانی کرتا ہے تو وہ حق بجانب ہے ۔ اس میں جارحانہ مذموم قومیت کا گذر تک نہیں ۔

پھر اقبال قومیت کے درجہ سے آگے بڑھ کر بین الاقوامیت کے رنگ میں ڈوب کر کہتا ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ ہندوستان کی صحیح قومیت کے تصور سے انکار نہیں کرتا بلکہ وہ بحیثیت انسان اور زیادہ ہمہ گیر ہونا چاہتا ہے ۔ انسانیت کی محبت میں اس کے نزدیک ہندوستان کی محبت لازماً شامل ہے ۔

اقبال کا تصورِ قومیت روحانی اور اخلاقی ہے ۔ البتہ وہ میکاولی کی جارحانہ مذموم قومیت کا مخالف ہے ۔ اسلام اقبال کے لئے کائنات کی روحانی بنیاد ہے جس پر قومیت کو استوار ہونا چاہیئے ۔ قومیت کے اس اخلاقی روحانی تصور کے لئے ہمیں اپنی جانیں تک قربان کر دینی چاہئیں ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہندوستان کو جلد از جلد غلامی سے نجات دلائیں ۔

ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں میں بمشکل ایک چوتھائی ایسے ہوں گے جن کے آباواجداد دوسرے ممالک سے آئے تھے پھر ان میں بھی بیشتر نے یہیں کی عورتوں سے شادیاں کی تھیں ۔ بقیہ مسلمان یا تو ہندو تھے یا بدھ مت کے پیرو جنھوں نے اسلام کو قبول کر لیا تھا ۔

پچھلے ہزار برس میں ان مسلمانوں نے بھی جو باہر سے آئے تھے ہندوستان کو اپنا دیس بنا لیا ہمارا اس ملک پر اسی قدر حق ہے جس قدر کہ آریاؤں کا جو مرکزی ایشیا سے آکر یہاں آباد ہوئے جس قدر ہمارا حق اس ملک پر ہے اسی قدر اس کی محبت بھی ہمیں کرنی چاہیئے ۔ ہمیں یہ اسی طرح عزیز ہونا چاہیئے جس طرح عرب عربوں کو ۔ ترکی ترکوں کو یا ایران ایرانیوں کو ۔

پچھلے سینکڑوں برس میں مسلمانانِ ہند نے ایک نئے عظیم الشان ہندی مسلم تمدن کو قائم کیا ہے جس سے ہندوستان کی زندگی بحیثیت مجموعی مالامال ہو گئی ہے ۔ صناعی ۔ تعمیر ۔ موسیقی ۔ علم ۔ ادب سیاست معیشت ۔ مذہب غرض تمدن کا ہر شعبہ مسلمانوں کے فیض سے سیراب ہوا ہے ۔

بیشک اس تاریخی دور میں ظلم و جور کی بھی داستانیں ملتی ہیں ۔ مگر کونسی ایسی قوم ہے جس کے صفحات ان واقعات سے خالی ہوں ۔ ہندوستان کے مسلمان ہندی ہیں اور ہندی بن کر رہے ۔ وہ یہاں کی دولت لوٹ کر باہر نہیں لے گئے ۔ چند فاتحوں نے باہر سے آکر ہندوستان کو ضرور لوٹا مگر اس کا مقابلہ جس طرح ہندوؤں نے کیا اسی طرح مسلمانوں نے بھی ۔ ان کے نظامِ حکومت میں ہندو اور مسلمانوں کا برابر کا حصہ تھا ۔ بیشک طرزِ حکومت جمہوری نہ تھا لیکن جمہوریت کا باقاعدہ نظام تو صرف دو سو برس سے قائم ہوا ہے ۔ ہندوستان میں اس وقت جو شخصی حکومت قائم تھی وہ دنیا کی دوسری حکومتوں سے بدرجہا بہتر تھی ۔

نصب العین کے تعین میں ان تاریخی واقعات پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ مختصر یہ کہ مسلمانان ہند کو اس ہندی مسلم تمدن پر فخر کرنا چاہیئے جو صرف اسلامی ہی نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل میں ہندوؤں کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔

ہندوستانی اخلاقی روحانی قومیت کی تشکیل کا در اصل یہ پہلا دور تھا۔ تمدن کے مشترک عناصر کے علاوہ اس وقت ہندوستان کے ہندو مسلمان ایک ہی سیاسی اور معاشی لعنت میں مبتلا ہیں غلامی اور غربت نے دونوں کو قلاش کر دیا ہے۔ صرف معاشی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بھی۔ معاشی زندگی برباد ہو گئی ہے۔ قومی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اب اخلاق اور مذہب کا بھی خاتمہ ہوا جا رہا ہے۔ غیر ممالک کی سطحی مادی تحریکات ہماری قومی زندگی کی مضبوط اخلاقی اور روحانی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا چاہتی ہیں۔

بحیثیت مسلمان اور بحیثیت ہندوستانی ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستانی قومیت کے تمام اجزا درست کریں۔ چاہے معاشی ہوں یا سیاسی، اخلاقی ہوں یا روحانی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس تحریک میں اپنی قوم کے شایان شان حصہ لیں اس قومیت کی تعمیر کے لئے سب سے اولین شرط آزادی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم حریت کی اس راہ میں اپنی زندگیاں نچھاور کر دیں۔ صرف اسی طرح ہماری قوم میں زندگی اور طاقت پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسی طاقت جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی سلطنت بھی نہ کر سکے گی۔

<u>۔ انسانیت</u> | اسلام اور اخلاقی روحانی قومیت کے تصور کے تحت میں ہم منفی جارحانہ تصور قومیت تسلیم نہیں کر سکتے ہم مسلمانان ہند اور ہندوستان کے تمام فرقوں کی اس لئے خدمت کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں وہ طاقت پیدا ہو کہ وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیں ہم قومیت ہند کی ایک سربفلک عمارت اور بنیاد پر کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ہم دوسروں پر ظلم کریں۔ ان کے حقوق غصب کریں بلکہ اس لئے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے سکیں۔ ہمارے لئے قومیت بین الاقوامی مفاہمت کے لئے صرف ایک زینہ ہے۔ ہمیں کسی سے نفرت نہیں ہے۔ لیکن ہم

یہ بھی نہیں چاہتے کہ کوئی ہم سے نفرت کرے ہم کسی کو حقارت سے نہیں دیکھتے لیکن ہم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی ہمیں حقیر نظروں سے دیکھے۔ ہندوستان کے مسلمان قومیت اور بین الاقوامیت کے درمیان سب سے بڑا رشتہ ہیں۔ ایک طرف بحیثیت ہندوستانی وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں دوسری طرف بحیثیت مسلمان وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں شہنشاہیت کا جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ دوسری ہمسایہ اقوام پر نظر رکھے۔ وہ عالم اسلام اور ہندوستان میں رشتہ اتحاد و محبت کا وسیلہ ہیں۔

غرضیکہ مسلمانان ہندوستان کے نصب العین کے تین عناصر ہیں۔

۱- اسلام

۲- قومیت اور

۳- انسانیت

مسلمانان ہند کا فرض ہے کہ وہ اس نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ غریب ہندوستان کی دکھ بھری آواز ان سے التجا کر رہی ہے۔ مظلوم انسانیت ظلم و جور سے تنگ آکر ان سے امداد کی طالب ہے۔ اسلام کی ازلی و ابدی روح ان کو چیخ چیخ کر خواب غفلت سے ہوشیار کرنا چاہتی ہے۔ زندگی کے ساز نغمہ پیدا کرنے کے لئے بے تاب ہیں وہ صرف مرد مومن کے مضراب عمل کے تشنہ ہیں۔

جدید اُردو شاعری کے بعض میلانات

(بقیہ سلسلہ گذشتہ)

غرض اقبال کا درجہ اُردو شاعری میں صرف اُن کی لفظ تراشی اور جدید ترکیبوں کی وجہ سے بلند نہیں ہے حالانکہ اُس میں بھی وہ اُردو کے کسی شاعر حتیٰ کہ غالب تک سے کم نہیں۔ بلکہ اس وجہ سے بلند ہے کہ وہ مفکر بھی ہیں۔ وہ اپنے سامعین کو جس راستے پہلے جانا چاہتے ہیں اس کے تمام خطرات و مصائب سے آگاہ ہیں۔ جوش اُن کے برخلاف شاعرِ شباب ہیں اور چونکہ وہ شاعرِ شباب ہیں اس لئے شاعرِ انقلاب بھی ہیں۔ وہ جوانی کے اس لئے دلدادہ ہیں کہ اس سے لہو میں روانی آتی ہے اور پیری کے اس وجہ سے خلاف ہیں کہ اُس کی کمر خم ہے، حالانکہ جوانی اور پیری۔ جدیدیت اور قدامت دونوں میں محض نام کی وجہ سے ایک گردن زدنی اور دوسرا سر پر بٹھلانے کے قابل نہیں ہے، لیکن جوش کا خیال یہی ہے۔ نعرۂ شباب میں فرماتے ہیں ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب ✿ میرا نعرہ، انقلاب و انقلاب و انقلاب
دیکھکر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے ✿ موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے
الاماں کبڑی ریا آلودہ پیری الاماں ✿ اب کوئی کستی ہے تیرے سر پر جوانی کی کماں
تیرے جھوٹے کفر دایاں کو مٹا ڈالوں گا میں ✿ دھجیاں اُس کفر دایاں کی اڑا ڈالوں گا میں
ڈال دوں گا طرح نو اجیرا در برپا گ میں ✿ جھونک دونگا کفر دایاں کو دہکتی آگ میں
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں ✿ ثبت ہو گا جس کی نذریں جلد پر مہرِ جواں

یہ غیظ و غضب جو بڑھ کر ہذیان کی صورت اختیار کر لیتا ہے فن کارانہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جوش صحیح معنوں میں انقلابی نہیں ہیں۔ وہ انقلاب کے حقیقی تصور تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ انقلاب کے انقلاب کی وجہ سے قائل ہیں۔ نئے زمانے کی وجہ سے نہیں۔ وہ انقلاب کے ظاہری اور غارت گر پہلو سے خوش

ہو لیتے ہیں۔ اُن کی نظر اُس خاک و خون سے گذر کر آنے والے سماجی نظام اور اس کے غیر معمولی حسن تک نہیں پہنچتی جس کے سامنے خاک و خون کا کھیل کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ میں شاید اپنے آپ کو اچھی طرح واضح نہیں کر سکا، بغاوت کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام ۔ میری گردش اہلِ زر کے حلقوں میں قتلِ عام
الاماں والحذر میری کڑک میرا جلال ۔ خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار ۔ بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوار
موت ہے خوراک میری موت پر جیتی ہوں میں ۔ سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں لہو پیتی ہوں میں
پیاس سے باہر نکل پڑتی ہے جب میری زباں ۔ بہنے لگتی ہیں سرِ میداں لہو کی ندیاں

اور اس بغاوت کی ابتدا ملاحظہ ہو ؎

جب ازل میں سجدۂ آدم کا اٹھا تھا سوال ۔ ہاں اسی ہلچل کے موقع پر کہ تھا وقتِ زوال
خود خدائے برتر و قہار سے افلاک پر ۔ کی تھی میں نے گفتگو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

اس بھیانک بلکہ کریہ المنظر تصور کے بعد، اقبال کے ابلیس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ دونوں شعرا کا خیال ایک ہی جگہ پر پہنچا ہے مگر دونوں کے اندازِ بیاں میں کتنا فرق ہے ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو ۔ میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر ۔ کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا ۔ میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے ۔ قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح ۔ تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

جوش کی اُن نظموں میں جن میں وطن کی آزادی کا تصور پیش کیا گیا ہے "آثارِ انقلاب" سب سے کامیاب ہے۔ یہ نظم باوجود مختصر ہونے کے اپنی جگہ پر مکمل ہے لیکن اس میں بھی محض انقلاب کی آمد کی خبر دی گئی ہے اور کچھ نہیں بتایا گیا ؎

قسم اس دل کی چسکا ہے جسے صہبا پرستی کا ۔ تو ۔ یہ دل چھانتا ہے جو مزاج ہستیائے ہستی کا
قسم اُن تیز کانوں کی کہ ہنگام قدح نوشی ۔ تو ۔ سنا کرتے ہیں جو ناقوس کو تکبیر کی سرگوشی
قسم اُس روح کی خوہو جسے فطرت پرستی کی ۔ تو ۔ گِنا کرتی ہے راتوں کو جو ضربیں قلب ہستی کی
قسم اُس حس کی جو پہچان کر تیور ہواؤں کے ۔ تو ۔ سناتی ہے خبر طوفان کی طوفان سے پہلے
قسم اُس نور کی کشتی جوان آنکھوں کی کھیتا ہے ۔ تو ۔ جو نقش پا کے اندر عزم رہرو دیکھ لیتا ہے
قسم اس فکر کی سوگند اس تخئیل محکم کی ۔ تو ۔ جو سنتی ہے صدائیں جنبش مژگانِ عالم کی

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا زنجیر شب ٹوٹی ۔ تو ۔ وہ دیکھو پو پھٹی غنچے کھلے پہلی کرن پھوٹی

اٹھو چونکو بڑھو منہ ہاتھ دھو آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

حقیقت یہ ہے کہ جوش کی نظر صرف اشیا کی خارجی حیثیت پر رہتی ہے ۔ اُن کی منظر نگاری بھی اسی نوع کی ہے ۔ وہ استعارات و تشبیہات سے کھیلتے ہیں ۔ الفاظ کے ہجوم سے جوش و گرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ چونکہ ان کا خیال مسلسل ، مربوط اور گہرا نہیں ہوتا اس لئے انکی نظمیں " وقتی اور ہنگامی " کی حد سے نہیں بڑھتیں ۔ اُن میں وہ گہرائی نہیں جو شعر کو ابدی بناتی ہے ۔ جو فرق آرٹ اور پروپگینڈے میں ہے ۔ وہی فرق اقبال اور جوش کی شاعری میں ہے ۔ آرٹ بہترین پروپگینڈا ہوتا ہے ، پروپگینڈا بلند ہو کر بھی آرٹ نہیں ہو سکتا ۔

مذہبی رنگ ہماری شاعری میں ابتدا سے نمایاں ہے ۔ حمد و نعت اور مراثی و مناقب کا تو کوئی شمار نہیں لیکن صوفیانہ خیالات بھی اس ذیل میں آتے ہیں ۔ مگر مجھے اس وقت ان سب کا فرداً فرداً ذکر کرنا نہیں ہے بلکہ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مذہبی حالت کا ذکر جدید شاعری میں کہاں تک ملتا ہے ۔ اور اُس کے کس کس پہلو پر زور دیا گیا ہے ۔

اس ذیل میں سب سے پہلے تو مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر ضروری ہے۔ جس کا رونا شروع سے رویا گیا ہے۔ اور اب تک رویا جاتا ہے۔ ہمارے شعر و شاعری کا ایک بڑا حصہ قابل فخر ماضی اور شرمناک حال کی داستان بیان کرنے میں صرف ہوا ہے۔ اس قسم کی نظموں میں اسلام کے دور اول کے کارنامے بڑے جوش سے بیان کئے جاتے ہیں۔ کبھی دور اول کی سادگی پر زور دیا جاتا ہے کبھی اسلامی فتوحات پر۔ کبھی قرطبہ و غرناطہ کا قصیدہ پڑھا جاتا ہے تو کبھی بغداد و مصر کا اور آخر میں اس کا موازنہ حال کی پست حالت سے کرکے ملت اسلامیہ کو جوش دلایا جاتا ہے یہ ہے مختصر طور پر مرکزی خیال اُن بیشمار نظموں کا جو ستر اسی برس سے لکھی جا رہی ہیں۔ اس قسم کی نظمیں کسی گہرے اور منظم خیال کے ماتحت نہیں لکھی جاتیں اُن کی تہ میں زیادہ تر جذبات ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر ان کی مدد سے، اس ماضی کا خاکہ مرتب کیا جائے جو یہ واپس لانا چاہتے ہیں تو اس میں تمام شعراء کے یہاں یکرنگی نہ ملے گی لیکن حال کی مصوری اور موجودہ پستی کا ذکر سب کے یہاں بڑا جوش۔ صداقت اور واقعیت لئے ہوئے ہے۔

حال کی مصوری میں پہلے مسلمانوں کی بے بسی، اُن کی اخلاقی پستی، اُن کے قوائے عمل کی سستی، اُن کی غفلت کا رونا رویا جاتا ہے۔ اب ان میں اور کئی چیزیں شامل ہوگئی ہیں۔ ایک مذہب کے قدیم تخیل کے بدلنے کی ضرورت کا اظہار، اور دوسرے مولوی اور ملا کے خلاف جہاد۔ سرسید نے اپنے زمانے میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج مغربی تعلیم کی دوا سے کرنا چاہا تھا۔ لیکن چونکہ وہ جانتے تھے کہ پہلے مذہبی خیالات میں اصلاح ضروری ہے اس لئے انھوں نے سائنس اور مذہب کو گلے ملوانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس اتحاد کی زد قدرتی طور پر اس طبقہ پر پڑتی تھی جو علما کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ سرسید کے خلاف جو کفر کے فتوے دئے جاتے تھے یہ اُن کا جواب تھا۔ اس طبقہ نے اصلاح کی کوششوں میں رخنے ڈالے اور مسلمانوں کو عذاب آخرت سے ڈرایا اور اس وجہ سے ہمارے مصلح شاعر ان کے درپے ہوگئے چنانچہ مولوی اور ملا اور شیخ جی اور واعظ کے خلاف جدید شاعری کا جہاد ایک واقعیت لئے ہوئے ہے اور فارسی شعرا کی طرح محض پگڑی اچھالنے کے شوق کا نتیجہ نہیں۔ حالیؔ نے اپنے کلام میں ان علما پر برابر چوٹیں کی ہیں جو سرسید کی تکفیر کرتے تھے۔ مگر اُن کا لہجہ شروع سے آخر تک مودبانہ تھا۔ شبلیؔ بھی جب اُس کی طرف

اشارہ کرتے ہیں تو اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ ؎

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر ؎ بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

مگر آگے چل کر اکبر کے یہاں اس جنگ کے دونوں رخ ملتے ہیں۔ وہ ایک طرف مولوی اور ملا پر بھی آوازے کستے ہیں۔ اور شیخ جی اور ان کے بیٹوں کے انجام پر بھی پھبتیاں کستے ہیں اور دوسری طرف اُس بڑھتی ہوئی بے دینی کا بھی مقابلہ کرتے ہیں جو اُن کے دیکھتے دیکھتے سرسید کی تحریک کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔

ہندوستان میں اسلام کا جو حشر ہوا اس کے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے لیکن یہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ صدیوں سے رہن سہن، معاشرت اور تعلیمات کے بعد مذہب کے احکام کے گرد ایک اور دائرہ رسوم و رواج کا کھینچ دیا گیا تھا۔ اور مذہب اب ان رسوم کی پابندی کا بھی نام ہو گیا تھا۔ اس دائرے کو نیک نیت اصحاب نے شرع سے خارج از بحث سمجھا۔ مثلاً حالی چپ کی داد اور مناجات بیوہ میں اُن مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے رہے جو مذہب کی آڑ میں عورتوں پر توڑے جاتے ہیں۔ اکبر کا مذہب جس کا شیرازہ دیکھتے دیکھتے جدیدیت کی رو میں بکھرا جا رہا تھا رسوم پر بھی مشتمل تھا۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں وہ نیک نیت بھی تھے اور تنگ نظر بھی اس لئے اگر ایک طرف وہ مذہبی جذبہ کی کمی کا ماتم اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں اُنکو ؎ دعا منھ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

تو اس کے ساتھ ساتھ اُن کی آنکھیں اس نظارے سے بھی نمناک ہو جاتی ہیں ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں ؎ میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

اس اثنا میں علما اور عوام کے درمیان جو خلیج تھی وہ اور بھی وسیع ہوتی گئی۔ پہلے صرف طنز کافی سمجھی جاتی تھی اب کھلم کھلا چوٹیں ہونے لگیں۔ اور جنگ عظیم کے بعد کی شاعری میں مولوی اور ملا کے خلاف بہت کچھ مواد موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی بے دینی کو اگر ایک طرف مذہبی تہذیب و تمدن اور سائنس کے جدید نظریات سے مدد ملتی ہے تو دوسری طرف مولویوں اور ملاؤں نے ہدایت سے گریز کر کے ایک لاعلم

دروازہ عوام پر بند کر کے۔ اور مذہب کا ایک کاروباری اور مفادی تصور پیش کر کے اس کے لئے میدان تیار کیا ہے۔ ایسے نام نہاد مولوی اور ملا جب جنت کے فضائل بیان کرتے ہیں تو ان کی نظر خوشنودی باری تعالیٰ پر نہیں رہتی جتنی لذائذ جسمانی پر! اور انھوں نے ہر مذہبی تصور کو جسمانی رنگ دیکر بے غرض خدمت اور بے لاگ سیوا کا سوال ہی اٹھا دیا ہے۔ شبلی نے اس ضرورت کو محسوس کر کے ندوے کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ حالات زمانہ سے واقف اور حریت پسند عالم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی کوشش کا جو حشر ہوا وہ اظہر من الشمس ہے۔ اب روز بہ روز یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ نام نہاد مولویوں اور ملاؤں نے نور ہدایت کی مشعل پر اپنی تنگ نظری اور عصبیت کی گرد اس قدر ڈال دی ہے کہ اصل روشنی بھی مدھم ہو چکی ہے۔ بلکہ انھوں نے جو نصب العین پیش کیا اس کی طرف خود بھی گام زن نہ ہوئے۔ یا اکثر مذہب کی آڑ میں اپنے ذاتی اغراض کو پورا کرنے کی ٹھان لی۔ غرض ان تمام باتوں کی وجہ سے جو بیگانگی اس طبقہ کی طرف سے پائی جاتی ہے اس کا اظہار جدید شاعری میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ جوش لکھتے ہیں ؎

ہوئی اک مولوی سے کل ملاقات ⁂ شبیہ مسجد و محراب و ممبر
وہی ہوں گے جو فردوس بریں میں ⁂ خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر
وضو کے فیض سے شاداب داڑھی ⁂ خدا کے خوف سے چہرہ گل تر
ارم کے تذکرے کس کس مزے سے ⁂ حنائی ریش مٹھی میں پکڑ کر
نظر گہوارۂ انوار یزداں ⁂ زباں آئینۂ خلق پیمبر
مگر آنکھوں میں ہنگام تبسم ⁂ ریا کی جشکیں اللہ اکبر

مگر جوش کی اس نظم میں مولوی پر ایک یہ بھی الزام ہے کہ وہ مولوی کیوں ہے۔ اقبال جب ملا اور صوفی اور مولوی پر اعتراض کرتے ہیں تو در حقیقت اس ذہنیت پر نکتہ چیں ہوتے ہیں جو تصوف کے پردے میں غلامی اور محکومی پر قناعت سکھاتی ہے۔ اور در اصل مذہب کی حقیقی تعلیم کے منافی ہے ؎

اے مرد خدا تجھکو وہ قوت نہیں حاصل ؎ جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید ؎ جسکا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ؎ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ؎ ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب ؎ کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

بال جبریل میں اقبال ماتم کرتے ہیں ؎

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی ؎ رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

اور دوسری جگہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں ؎

کرگئی داور محشر کو شرمسار اک روز ؎ کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

اس رنگ میں اُن کا ایک اور خاص شعر ملاحظہ ہو ؎

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے ؎ عشق بیچارہ تو ملا ہے نہ صوفی نہ کلیم

ضرب کلیم میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو ؎ تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال ؎ تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے ؎ قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے ؎ اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

دوسرے الفاظ میں جب اقبال ملا پر طعنہ زن ہوتے ہیں تو اس کا مقصد اس ذہنیت پر اعتراض ہوتا ہے جس کی وجہ سے زندگی اور مذہب میں فصل پیدا ہوگیا ہے۔ اور جس کے ماتحت انسانوں میں رہ کر انھیں انسانیت کا درس دینے کے بجائے خانقاہوں میں دنیا سے بے تعلقی کا درس دیا جاتا ہے۔ اقبال

اس حرارت کے قایل ہیں جو زخمِ دل کی ٹیسوں کی پروردہ ہے اور اس وجہ سے کہتے ہیں ؎

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی ؛ اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے ؛ اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

مگر اقبال چاہتے کیا ہیں اور ان کا مذہب کیا ہے یہ حسبِ ذیل دو نظموں سے معلوم ہوگا۔
ایک چھوٹی سی نظم میں تین اشعار کی محدود وسعت میں موجودہ حالات پر نہایت جامع تبصرہ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس درد کا علاج بھی بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ؛ ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق ؛ افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ؛ ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اور اسی "مستیٔ کردار" کو مذہب کی خاص پہچان بتاتے ہیں: "مردِ مسلمان" ان کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے جس میں انھوں نے مذہب کا بلند ترین تصور پیش کیا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان ؛ گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ؛ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی ؛ ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ؛ قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے ؛ دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ؛ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز ؛ آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم ؛ لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

دوسرے شعراء مثلاً ساغر اور جوش جب مذہب پر اعتراض کرتے ہیں تو ان کا مقصد استہزا ہوتا ہے "اجمیر اور پریاگ میں طرح نو ڈالنے والے" بھی جدیدیت کی ترجمانی کر رہے ہیں اس لئے

کہ اب یہ جذبہ بھی شاعری میں نظم ہو رہا ہے مگر ابھی اس کے ماتحت خیال کی گہرائی نہیں ہے۔ یہ اشخاص چونکہ ہر قدیم شے کو گردن زدنی قرار دیتے ہیں اس لئے مذہب بھی ان کی بارگاہ میں ملعون ہے۔ جوش نے اپنے جدید مجموعے میں جس میں "شعلے" بھی ہیں اور "شبنم" بھی اسلامیات کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس میں جوش کا کہیں پتہ نہیں۔ صرف ذاکرے خطاب میں وہ سچے دل کے سامنے آتے ہیں ورنہ دوسری نظمیں خوشنما الفاظ کے ہجوم کے باوجود بھی کامیاب نہیں۔

غرض مذہبی معاملات میں آزادی، شعر و شاعری میں زندگی کے راستہ سے آئی ہے۔ ایک طرف مذہب میں آزادی کا صحیح اور صالح تصور ہے جو اقبال کے یہاں ملتا ہے جس میں بندگی اور خدائی دونوں کا ایک بہتر نصب العین پیش کیا گیا ہے اور جس میں صوفی و ملا اور مغربی تہذیب کے غارتگر اثرات دونوں کا ماتم کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ اُن کی رہنمائی کے لئے مذہب کا وہ تعمیری تصور پیش کیا گیا ہے جس کی طرف میں مرد مسلمان میں اشارہ کر چکا ہوں اور جو اقبال کے پیغام کا اساس اور سنگ بنیاد ہے۔ دوسری طرف مذہب میں آزادی کا نیا تصور ہے جو جوش اور ساغر کے یہاں ملتا ہے۔ ان کا خیال چونکہ مسلسل، مربوط، اور گہرا نہیں اس لئے ان کے متعلق کوئی صحیح نظریہ مرتب کرنا بہت مشکل ہے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ اشخاص موجودہ مذہب سے بیزار ہیں ایک تو اس وجہ سے کہ یہ ان کے تصور اور ان کے خیالات کے لئے گنجائش نہیں نکال سکتا اور دوسرے اس وجہ سے کہ اس کی آڑ میں بہت کچھ مظالم نوع انسانی پر توڑے گئے ہیں۔ اگر بات یہاں تک رہتی تو غنیمت تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس مذہب کے بجائے کبھی تو یہ وطنیت کا درس دیتے ہیں اور ایک نئے مذہب کی کتاب رزمشان لکھتے ہیں جس کے ماتھے پر ہندوستان ثبت ہوتا ہے اور کبھی انقلاب کو اپنی شریعت قرار دیتے ہیں مذہب کو قدر اعلیٰ ماننے کے بجائے یہ اشخاص کبھی اس وطنیت کو قدر اعلیٰ قرار دیتے ہیں جس کی محدود حیثیت اب تسلیم کر لی گئی ہے اور کبھی اس انقلاب پر ایمان لے آتے ہیں جس کے تمام امکانات اور پہلوؤں پر خود ان کی نظر نہیں۔ اقبال نے شاید انھیں کے لئے کہا ہے۔

ممکن ہے کہ تو جسکو سمجھتا ہے بہاراں ؎ اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا
شاید کہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی ؎ تو جسکو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

دانتے

دانتے جیسے پرانے ادیب کے حالات بیان کرنے کا مقصد اپنی قدامت پسندی یا تاریخ کی اہمیت جتانا نہیں ہے۔ ہم اس وقت یوروپی سیاست اور تمدن کی طرح یوروپی ادب کو دنیا پر راج کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہمارے لئے یہ غلطی کرنا بہت آسان ہے کہ اس مشن کو بھول جائیں جس نے یوروپی ادیبوں کے قلم کو جادو بیانی سکھائی اور ادب کو ہدایت اور لطافت کا خزانہ بنا دیا ایک بات یہ بھی ہے جسے میں چھپانا نہیں چاہتا کہ حال میں جو تحقیق خاص طور پر اسپین کے ایک عالم سینور میگل آسین نے کی ہے اس سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ دانتے کی عظمت اس وقت کے ایشیائی اور یوروپی مسلمانوں کے ادب اور علم کی پرچھائیں ہے۔ یوروپی قوموں نے ادب کے میدان میں ہماری انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا۔ اب ہم ان کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کا احسان مانتے ہیں۔ تو کیا برا ہے کہ ہم اپنے آپ کو وہ زمانہ بھی یاد دلائیں جب ہم استاد تھے اور وہ شاگرد۔ اور اس طرح سیکھنے سکھانے کا وہ سلسلہ جو انسانی تحریک کا جوہر ہے پورا پورا اپنے سامنے رکھیں۔ آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ صرف یوروپی نسلیں تہذیب اور تمدن کا قیمتی مگر بھاری بوجھ اٹھانے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب اسپین کے مسلمان عالم ابن حزم اور سعید ایسی ہی خود اعتمادی کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ یوروپی قومیں علوم اور فنون میں ترقی نہیں کر سکتیں۔ دونوں خیال اپنے زمانے کے لئے صحیح ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ دوسرے زمانے کے لئے غلط ہیں۔ ہمارے زمانے میں یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کی صلاحیت صرف یوروپی قوموں میں ہے۔ دانتے کے زمانے میں یہ غلط تھا اور دانتے کی شہرت اور عظمت اس کی گواہ ہے کہ وہ کس قدر غلط تھا۔ دانتے اٹلی کے شہر فلورنس کا رہنے والا تھا وہ سنہ ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کے ماں باپ شریف اور اتنے دولت مند تھے کہ اسے اچھی سے اچھی تعلیم دلا سکیں۔ دانتے کو علم حاصل کرنے کا غیر معمولی شوق بھی تھا اس کے

استاد اور ہم عمر دوست اس کو بہت مانتے تھے، اٹھارہ برس کی عمر میں اس نے شعر کہنا بھی شروع کر دیا۔ جس کا اس زمانے میں تازہ تازہ چرچا ہوا تھا۔ ایک لڑکی پر کہتے ہیں عاشق بھی ہو گیا۔ گر شادی کسی اور سے کی اور اپنے شہر کی سیاسی زندگی میں حصہ لینے کا شوق بھی کیا۔ لیکن فلورنس بلکہ تمام اٹلی میں اس وقت پارٹیاں اور عداوتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ دانتے کا دل اتنا چھوٹا نہ تھا کہ وہ حسد اور کینے سے بھر جائے لیکن پھر بھی وہ انھیں کینوں کا شکار رہا۔ اور سنہ ۱۳۰۲ء میں جب وہ ۳۷ برس کا تھا اس کے مخالفوں نے اُسے جلا وطن کرا دیا۔ اپنی عمر کی باقی مدت اس نے بے ٹھور ٹھکانے گھومتے پھرتے گذاری اور اپنی آرزوؤں اور حوصلوں کو کاغذ قلم کے سپرد کرتا رہا۔ اس کی وہ تصنیف جس نے اس کا نام اب تک زندہ رکھا ہے عمر کے آخری سالوں میں لکھی گئی۔

دانتے نہایت گردی طبیعت کا آدمی تھا۔ اور اس کے چہرے پر ایک اُداسی چھائی رہتی تھی اپنے زمانے کے لوگوں کی طرح وہ رنگیلا نہیں تھا۔ اور اس کے دل میں ان چیزوں کی کوئی قدر نہیں تھی۔ جن پر دنیا جان دیتی ہے اس نے اُن لاطینی شاعروں کے کلام کو پڑھا تھا جس کی سادگی بلا کی دل موہنے والی ہے۔ گر اسے شوق فلسفے، علم نجوم یا آکاش ودیا کا تھا۔ وہ زندگی کا لطف اُٹھانا نہیں جانتا تھا۔ اپنے زمانے کی زندگی کو سدھارنے اور دنیا کے کاروبار کی حقیقت معلوم کرنے کی فکر میں پڑا رہتا تھا۔ اور اس کے مذاق اور طبیعت کی یہی خصوصیت تھی جس نے اس کی نظر کو اونچا اُٹھایا۔ اسے ساری دنیا کے علم اور عقیدوں کو پرکھنے پر آمادہ کیا۔ اور اس کے دل کے دروازوں کو اس طرح کھول دیا کہ ہر طرف کی ہوا اور خوشبو اس کے اندر بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ سکے۔ اس کے زمانے میں عیسائی مذہب تعصب جہالت اور کٹرپن کی کال کوٹھری بنا ہوا تھا۔ لیکن دانتے غیر ملک اور غیر مذہب والوں کی کچھ نہ کچھ قدر کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے ملک کے باہر قدم نہیں رکھا۔ وہ عربی نہیں جانتا تھا لیکن عرب فلسفیوں اور ادیبوں کے کارناموں سے واقف تھا اور ان کا ذکر اس نے زیادہ تر ادب سے کیا ہے اس کا استاد برلتو لاطینی کئی سال اسپین میں رہ چکا تھا اور غالباً عربی اچھی طرح جانتا تھا۔ دانتے نے اسی علم کے چشمے سے اپنی پیاس بجھائی

"اور لاطینی کو دیکھ کر ہی شاید اس میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے زمانے کا سارا علم حاصل کرے جس کے معنے یہ تھے کہ عربی کی جتنی کتابوں کے ترجمے ہو چکے تھے انھیں پڑھے اور ذہن نشیں کرے۔ دانتے کی پیدائش سے کچھ اوپر دو سو برس پہلے صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کا تعلق تجارتی ہی نہیں تھا فلسطین میں عیسائیوں کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں، سسلی اور اسپین میں مسلمانوں کی اور جہاں کہیں بھی دونوں ایک دوسرے سے مل کر رہے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کا پہناوا، ان کا رہن سہن اور اکثر اُن کے خیالات اور بہت سے عقیدے بھی اختیار کئے۔ اسپین کے ایک عیسائی بادشاہ الفونز دہم نے جس کو دانش مند کا لقب دیا گیا تھا اور سسلی کے بادشاہ فریڈرک دوم نے جو بابر و سالینی ڈرہیل کہلاتا تھا۔ عربوں کی تہذیب کے ساتھ ان کے علم کے بھی پھیلانے کے بڑے جتن کئے۔ الفونز دہم نے ایسے مدرسے کھولے جہاں عرب استاد مسلمان اور عیسائی طالب علموں کو ساتھ ساتھ پڑھاتے تھے۔ عربی کتابوں کا بڑے پیمانے پر ترجمہ کرایا اور عربی کے کتب خانے قائم کئے۔ الفونز دہم نے قرآن شریف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرایا تاکہ یوروپ کے تمام تعلیم یافتہ لوگ اسے پڑھ سکیں۔ فریڈرک نے اس سے بھی بڑھ کر یہ حوصلہ کیا کہ عیسائی مذہب میں اس آزاد خیالی کا نشتر لگایا جو اس وقت مسلمانوں کی خاص صفت سمجھی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں برابر لڑائیاں ہوتی رہیں اور عیسائی مذہب کے محافظوں نے مسلمانوں کے اثر کا مقابلہ کرنے اور اسے مٹانے کی ہر طرح کوشش کی لیکن اس وقت کی ان کتابوں کو دیکھئے جن میں اسلام اور مسلمانوں کو بُرا بھلا کہا گیا ہے تو ان میں بھی آیتوں اور حدیثوں کا حوالہ دیا جاتا ہے اور یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ مخالفوں کو مسلمانوں ہی نے پڑھایا لکھایا تھا۔

دانتے اگر خود آزاد خیال نہ ہوتا تو اس وقت کے تقریباً تمام مشہور عیسائی عالم جو فائدے یا خوف کے سبب سے پادریوں اور کلیسا کی خوشامد پر تُلے ہوئے نہیں تھے اس کو یقین دلانے کے لئے موجود تھے کہ علم اور ہنر مسلمانوں ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ روجر بیکن، البرٹ سگنس، ریمنڈ لل اور ان سے پہلے کے عالم اور فلسفی سب اس بات کو صاف صاف کہہ چکے تھے اور بعض

بربنٹ (Brabant) کے عالم سیزیر کی طرح ایسے بھی تھے جنھیں اُن کے اعتقاد نے کلیسا سے ٹکر لینے پر آمادہ کیا۔ لیکن دانتے آزاد خیال اور علم دوست تھا اور مسلمانوں کے ادب اور فلسفے کا اس کے اوپر پورا پورا اثر پڑا، اس کی نہ تعصب نے روک ٹوک کی نہ زبان کی غیرت نے اس لئے کہ عربوں کی بیشتر مشہور کتابوں کے ترجمے ہو چکے تھے۔ دانتے کے سر لہنے والے اب تک دنیا کو اس پر تعجب کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ کہ دانتے نے اپنی طبیعت کے زور اور نئی ادبی وضع ایجاد کرنے کی قدرتی صلاحیت کے کیسے کیسے ثبوت دئے۔ نئی تحقیق دنیا کو اس پر تعجب کرنے کی دعوت دے رہی ہے کہ دانتے نے کس طرح عرب ادیبوں اور عالموں کی خوشہ چینی کی اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔

اب تک دانتے کی نمایاں کارگذاری یہ مانی جاتی تھی کہ اس نے اپنی مادری زبان کو ادبی زبان بنایا۔ اور اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ دانتے نے اٹالین زبان کو بڑی عزت بخشی لیکن اس سے بھی پہلے لوگ چھوٹی چھوٹی نظمیں اور گیت بول چال کی زبان میں لکھنے لگے تھے اور اس رواج کا سلسلہ سسلی کے دربار کے ان گویوں سے ملتا ہے جنھوں نے عرب گویوں کی دیکھا دیکھی گیت گانا اور پھر لکھنا شروع کیا۔ اسی طرح سپین میں بھی بول چال کی زبان مسلمانوں کی سرپرستی میں ادبی زبان تھی اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمان جہاں بھی آباد ہوئے وہاں کی بولی ان کے ہاتھوں پروان چڑھی۔

دانتے کی شاعری کے انداز اور اس کے نرالے عشق کو دیکھئے تو وہ مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ ایک خاص مسلمان صوفی اور ادیب شیخ محی الدین عربی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ہم مشرق کے رہنے والے ایسے عشق اور ایسے عاشقوں کو خوب جانتے ہیں جو خدا کی ذات کو معشوق، شراب کو نشے کو اس کی محبت کا سُرور۔ اور حُسن کی تمام نشانیوں اور اداؤں کو اس نشے کو تیز کرنے والی چیزیں مانتے ہیں۔ مغرب میں ایسا عشق اور ایسے عاشق کبھی دیکھنے میں نہیں آتے تھے، یونان اور روم کی شاعری میں آدمی کا حُسن، محبت آدمی آدمی اور خاص طور پر مرد عورت کی محبت

تھی اور اُن کے نزدیک یہ دعوے کرنا کہ محبت میں روحانیت شامل ہوسکتی ہے یا محبت آدمی کو خدا کے قریب پہنچا سکتی ہے۔ اپنے آپ کو بے وقوف بنانا تھا۔ پھر عیسائی مذہب نے اکثر عورت کو شیطان اور عورت کی محبت کو شیطان کے جال میں پھنسنے کی سب سے آسان ترکیب بتایا لیکن دانتے کی نظموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی محبت کا دعویٰ کیا گیا ہے جو دنیاوی اور جسمانی غرض سے بالکل پاک ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کا عشق اور اس کی معشوقہ اسے جنت کی سیر کراتی ہے اور جس قدر کہ انسان کے لئے ممکن ہے اُسے وہ خدا کے پاس پہنچا دیتی ہے۔ دانتے کے عشق نے یہ انوکھا رنگ آپ ہی آپ نہیں اختیار کیا اور اس کی معشوقہ بیٹرس بھی عورت کی صورت میں کوئی فرشتہ نہیں تھی۔ دونوں کا خیال ابن عربی کی تصانیف نے اس کے دل میں ڈالا۔ دانتے کی صفت بس یہ تھی کہ وہ ایسا دل رکھتا تھا جس میں یہ خیال پھل پھول سکتا تھا۔

شیخ ابن عربی نے اپنی فتوحات مکی میں ایک دو جگہ اُس حُسن کا خاکہ کھینچا ہے جس کا سہارا ان کے عشق کا جذبہ لیا کرتا تھا۔ اور کتاب کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے عشق کی صفائی اور حق پرستی ثابت کریں۔ دانتے کے تصوف میں اتنی گہرائی نہیں تھی۔ لیکن حسن کو اس نے وہی مرتبہ اور قریب قریب وہی ظاہری صورت دی ہے جو ابن عربی نے، دانتے نے اپنی معشوقہ کا نام بیٹرس رکھا، یہ ایک لڑکی کا نام تھا، جسے اس نے پہلی بار نو برس کی عمر تھی جب دیکھا۔ اس کے بعد رستہ چلتے دو ایک دفعہ صاحب سلامت ہوئی اور بس۔ بیٹرس کی شادی کسی اور سے ہوئی اور پچیس برس کی تھی جب مرگئی۔ دانتے کے عشق نے در اصل اس کے مرنے کے بعد ہی بیٹرس کی ذات سے کچھ تعلق دکھایا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ دانتے نے اسی واقعے کے دو سال کے اندر شادی خود کرلی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ دانتے نے بس بیٹرس کا نام لے لیا۔ اور اپنے دل میں اس کی صورت الگ بنائی اور حسن اور روحانیت کی تمام خوبیاں اس میں فرض کرکے اس کو انوکھے خاص رنگ کی محبت سے چاہنے لگا۔

دانتے کی پہلی کتاب ’نئی زندگی‘ کا انداز ابن عربی کی فتوحات سے لیا گیا تو اس کی دوسری

تصنیف "دعوت" ابن عربی کی ترجمان الاشواق کو سامنے رکھ کر لکھی گئی۔ یہ کتاب نثر میں ہے بیچ بیچ میں نظمیں آجاتی ہیں اور اس کا مقصد گویا علم اور فلسفے کا نچوڑ پیش کرنا ہے۔ اس میں دانتے نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اشراقی صوفیوں کی تعلیم ہے جس کے سب سے بڑے نمائندے ابن عربی مانے جاتے ہیں۔ یہ تو سب مشق تھی دانتے کا کارنامہ اس کی نظم (Divina Comedia) یا مقدس داستان ہے جس میں اس نے دوزخ، دوزخ اور جنت کے بیچ کے مقام، اعراف اور پھر جنت میں جانے کی کہانی سنائی ہے اور روحوں کو تکلیف، سکون یا مسرت کی جن کیفیتوں میں دیکھا وہ سب بیان کی ہیں۔ سینور سیگل آسین، جو دانتے کے متعلق بہت تحقیق کر چکے ہیں اس کتاب کو پچھلی دونوں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ مسلمانوں کے عام عقیدوں اور شیخ ابن عربی کی کتاب "الاسرا" اور فتوحات کی نقل ثابت کرتے ہیں۔ عیسائی دوزخ اور جنت کو تو بے شک مانتے تھے، لیکن ان کے یہاں بس یہ عقیدے تھے جن کی نہ تفصیل کی گئی تھی نہ ان کے بارے میں کوئی روایات مشہور تھیں۔ اس کے برخلاف مسلمانوں میں قرآن شریف کی چند آیتوں اور چند حدیثوں کے سہارے تخیل نے بڑی بلند پروازیاں کی تھیں۔ اور جنت اور دوزخ کا جغرافیہ اتنی تفصیل سے معلوم کرایا تھا کہ جیسے سب کی آنکھ کی دیکھی ہوئی جگہیں ہیں۔ یہ روایتیں عیسائیوں میں بھی پھیلیں۔ تولیدو کے آرچ بشپ روڈرگو ہیمنتھ (Rodrigo Ximenez) نے لاطینی زبان میں عربوں کی ایک تاریخ لکھی، جس میں معراج یعنی رسول خدا کے پاس بلائے جانے کے بارے میں جتنی حدیثیں صحیح مسلم اور بخاری میں ہیں سب جمع کر دی گئی ہیں اور اسی طرح ایک اور کتاب میں جو سینٹ پیٹر پاسکال نے اسلام کے خلاف لکھی۔ معراج کا بیان ملتا ہے۔ لیکن دانتے کو اتنی دور جانے کی ضرورت نہ تھی ابن عربی نے اپنی کتاب الاسرا اور فتوحات میں لکھا ہے کہ وہ کس طرح دوزخ، اعراف اور جنت کی سیر کو گئے۔ اور وہاں کیا کیا دیکھا۔ دانتے نے دوزخ اور جنت کا وہی نقشہ بنایا ہے جو ابن عربی نے۔ دوزخ میں جو مختلف قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ وہ وہی ہیں۔ جنت میں جو آنند کی کیفیت ہے وہ وہی۔ فرق صرف اتنا

ہے کہ اس نے دوزخ اور جنت کو اور لوگوں سے آباد کیا ہے۔ ابن عربی کا مقصد اپنی ایک روحانی کیفیت بیان کرنا تھا۔ دانتے کا مقصد اپنے زمانے پر اور اپنی قوم کی تاریخ پر رائے دینا۔

اور اصل میں مقدس داستان کی سب سے لطیف خصوصیت یہی ہے۔ دانتے نے ساری عیسائی ملت کو اپنے سامنے بلایا ہے اس میں سے چن چن کر لوگوں کی سرگذشت خود اُن کی زبانی بیان کی ہے۔ انھیں جو سزائیں دی گئی ہیں یا جو آنند نصیب ہوا ہے اس کی مصلحت سمجھائی ہے اس کی نظم ایک دنیا کی کہانی بن گئی ہے جو نیک اور پاک زندگی بسر کرنے کا سبق دیتی ہے۔ اس میں ناول کا بھی مزہ ہے اور موت کے بعد ان نامعلوم حالتوں کی جھلک بھی نظر آتی ہے جن کے خیال سے دل تھرا جاتا ہے۔ دانتے کی سادگی، اس کی عقیدت، اس کا اعلیٰ اخلاقی حوصلہ ایک روایت میں جو کہ سراسر افسانہ ہے، حقیقت کی شان پیدا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دانتے کی مقدس داستان کا اس کے شائع ہوتے ہی بہت چرچا ہوا اور اب تک وہ دنیا کے ادبی شاہکاروں میں گنی جاتی ہے۔ مشہور فرانسیسی نقاد وولٹیر نے یہ کہہ کر دانتے کی شہرت کبھی کم نہ ہوگی اس لئے کہ کوئی اس کی کتابوں کو پڑھتا نہیں۔ دانتے پر بڑی سخت چوٹ کی ہے اور اب سینو ر ہینگل آسین کی تحقیق نے اس کی آبرو کو اور صدمہ پہنچایا ہے۔ لیکن یوروپ نے اس سے پہلے دانتے کی آنکھوں سے دنیا دیکھی اور اگرچہ اُسے وہی نظر آیا جو اس کے اُستاد دیکھ چکے تھے اور دکھا چکے تھے، تو کیا ہوا۔ اُس کی اپنی آنکھیں تو تھیں اور اپنا دل تو تھا

مرآة العروس

مولانا نذیر احمد کی سب سے پہلی کتاب جو قابل انعام سمجھی گئی، "مرآۃ العروس" ہے۔ یہ کتاب عام طور پر "اکبری اصغری کا قصہ" پکاری جاتی ہے! اکبری اصغری دو بہنیں ایک ماں باپ کی پیدا تھیں، اور ایک ہی گھر میں، دو حقیقی بھائیوں محمد عاقل اور محمد کامل سے بیاہی گئیں۔ اکبری نے اپنے کرتوتوں سے ماں سے بیٹے کو چھڑایا، علیحدہ گھر کیا۔ اور بالآخر حد درجہ افلاس و تنگ دستی کی زندگی بسر کی۔ اصغری نے اپنے حسن اخلاق سے سارے گھر کو گرویدہ بنایا، بے کار شوہر کو باکار بنایا، ساس کی خدمت کی، اور خسر کی اطاعت۔ نند کی شادی رچائی اور اس طرح مشہور ہوئی کہ محلے کیا شہر بھر کی شریف زادیاں اس سے تعلیم حاصل کرنے اس کے گھر آئیں؛ اور لکھنے پڑھنے سینے پرونے کے ساتھ عمدہ خصلتیں۔ اچھے اخلاق سیکھتیں۔

اکبری اور اصغری کی سیرتوں کا فرق

مصنف نے ان دونوں کی سیرتوں کے فرق کا سبب یوں بیان کر دیا ہے۔ "جو لڑکیاں بچپن میں لاڈ پیار میں رہا کرتی ہیں، اور ہنر اور سلیقے نہیں سیکھتیں۔ یوں ہی اکبری کی طرح رنج و تکلیف اٹھاتی ہیں۔ اکبری کو ماں اور نانی کے لاڈ اور پیار نے کیسی مصیبت میں رکھا لڑکپن میں نہ تو کوئی ہنر سیکھا، اور نہ کچھ اس کے مزاج کی اصلاح ہوئی"

گر مصنف نے کسی مقام پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ اصغری کو بچپن میں کس نے تربیت دی، اور آخر اس نے کیوں سارے ہنر سیکھ لئے؟ ماں باپ اور نانی نے آخر اُسے کیوں لاڈ پیار میں نہ رکھا؟ مصنف کی فروگذاشت کی وجہ سے ہمیں اکبری اور اصغری کی سیرت کی ارتقائی منزلیں نہیں معلوم ہوتیں؛ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اکبری کا قصہ ایک طرح ابتدائے کتاب کے چند صفحوں پر ختم ہو جاتا

ہے۔ البتہ چونکہ اصغری کے ذریعے مصنف کو تدبیر منزل کے تمام اصول اور تعلیم بنات کے ابتدائی اور ضروری حصوں سے بحث مقصود تھی، اس لئے اس کا ذکر آخر تک باقی رہا۔ بلکہ "بنات النعش" میں بھی جاری رہا۔

اکبری

اکبری کی کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے :۔ "ایک بے وقوف لڑکی کا بیاہ ہوگیا تھا اس نے اپنی بے وقوفی سے سسرال میں برس دو برس بھی نباہ نہ کیا۔ بیاہ کے چوتھے یا پانچویں ہی مہینے میاں پر تقاضا کرنا شروع کیا کہ تمھاری ماں بہنوں میں ہمارا گذارا نہیں۔ ہم کو الگ مکان لے دو۔"

جب طرح طرح کی تکرار رنجیوں، لڑائیوں اور تو تو، میں میں کے بعد الگ مکان لیا گیا تو بدسلیقگی اور پھوہڑپن کی حد کر دی۔ نہ چیزیں سلیقے سے رکھیں، اور نہ مال و اسباب کی حفاظت کی۔ کھانا پکایا تو اس قدر لذیذ کہ اس کے ذکر ہی سے بھوک بھاگ جائے!

"روٹی پکائی تو عجیب صورت کی۔ نہ گول نہ چوکھنٹی، ایک کان ادھر نکلا ہوا اور چار کان اُدھر، کنارے موٹے، بیچ میں ٹکیا، کہیں جلی کہیں کچی، دھوئیں میں کالی، دال جو پکائی تو پانی الگ دال الگ!

ساتھ کی اُٹھنے بیٹھنے والیاں، محرم راز سہیلیاں "بھوندو بھٹیارے کی بیٹی چنیا، اور بخشو قلعی گر کی بیٹی زلفن، کموں سقے کی بیٹی راحت، مولن کنجڑے کی بیٹی سلمتی!"

نتیجہ یہ ہوا کہ نئے گھر میں آتے ہی چنیا کا بھائی میرن دن دہاڑے تمام برتن چرا لے گیا۔ مگر اس نقصان سے کیا بی اکبری پر کوئی اثر پڑنے والا تھا! وہ بی بی دونوں آنکھوں کی اندھی اور کانوں کی بہری تھی! چنانچہ انھیں دنوں ایک کٹنی آنکلی، اس سے میل ملاپ بڑھا۔ اس نے یقین دلایا کہ میں ایک شاہ صاحب سے تمھارے چاندی کے زیورات سونے کے بنوا دوں گی، اور سونے کے دُگنے کرا دوں گی۔ اکبری نے سارے زیور اس کے حوالے کر دیئے؛ اور وہ سب کا سب لے دے کے چلتی بنی غرض بی اکبری بُری طرح لوٹی گئیں! وہ اپنے مزاج، اپنی بدسلیقگی اور

غیر کفایت شعاری کی وجہ سے ہمیشہ حد درجہ تکلیف و مصیبت میں رہیں۔

مختصر یہ کہ اکبری کو حد درجہ بد مزاج، تندخو، کمینہ خصلت، خود غرض، نک چڑی اور تمام و کمال عیوب سے مرصع دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اصغری اصغری کی سیرت مصنف نے یوں بیان کی ہے:۔

" یہ لڑکی اس گھر میں ایسی تھی جیسے باغ میں پھول، یا آدمی کے جسم میں آنکھ۔ ہر ایک طرح کا ہنر، ہر ایک طرح کا سلیقہ، اس کو حاصل تھا۔ عقل، ہنر، حیا، لحاظ، سب صفتیں خدا نے اصغری کو عنایت کی تھیں، لڑکپن میں اس کو کھیل کود، ہنسی اور چھیڑ سے نفرت تھی۔ پڑھنا یا گھر کا کام کرنا۔"

میں اس سے قبل مولانا کی خشک مزاجی کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ دیکھئے اصغری کی سیرت کے بیان کرنے میں مولانا نے اس کے عیاں کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ لڑکپن کھیل کود ہنسی دل لگی کے دن ہی ہوتے ہیں، مگر مولانا کی ہیروئن ان باتوں سے بچپن ہی سے متنفر تھی! عام تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے بچوں کا، جن میں اس طرح کی باتیں نہ موجود ہوں، جنھیں بچپن ہی[۵۱] سے بیتے ہیں، زندگی میں کامیاب ہونا یا ان کی زندگی میں مسرت و خوشی کے اسباب کا مہیا ہونا،

---

۵۱ ۔ اس موقع پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا، مشہور شیعی مجتہد علامہ حلی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ نو دس برس کے سن میں تمام علوم پر حاوی تھے اور صاحب اجتہاد ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسی سن میں ایک دن آپ ممبر پر تشریف فرماتے، اور موعظہ میں مشغول تھے کہ دفعتاً آپ نے دو چڑیوں کو آپس میں لڑکے زمین پر گرتے دیکھا، تقاضائے سن کی وجہ سے آپ نے موعظہ اور پند وہیں چھوڑا۔ اور ممبر سے کود جلدی سے عمامہ اتار کر ان چڑیوں پر پھینک کے انھیں پکڑ لیا! اہل مجلس بھی وعظ کی خشک وادیوں سے محل کے معصومیت کے گلشن زار میں جا رہے، اور غم و خوف کی جگہ چہروں پر مسرت اور امید کی لہریں دوڑنے لگیں۔"

حد درجہ مشکل ہوتا ہے۔ اول تو لوگ عام طور سے ایسی طبیعت والوں سے محبت نہیں کرتے، دوسرے انسان کی جگہ "ہیزم خشک" سمجھ کے اُن سے کبھی اپنا دردِ دل نہیں بیان کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ سارے قصے میں کوئی ایسا مقام نہیں ملتا کہ جہاں دل پر چوٹ لگتی ہو، یا اصغری سے اضطراراً کوئی فعل ایسا ہو جاتا کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ محض تہذیب کی پتلی اور اخلاق کی مشین ہی نہ تھی، بلکہ ایک انسان کی طرح پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتی تھی۔ اس کی سیرت کا اہم ترین پہلو اس کی یہ "خشک عقلیت" ہے۔ جب وہ ایثار بھی کرتی ہے تو بہت زیادہ سوچ سمجھ کے، اور تمام مراحل اور نتائج پر نظر کر کے! مثلاً تیرہ برس کے سن میں جب وہ بیاہی جانے لگی، تو عواقب پر اس کی اس قدر گہری نظر تھی، کہ اس نے بہن سے زیادہ جہیز لینا نامنظور کیا! یہ ایک ایسا امر ہے جو اس کی سیرت کو حد درجہ محبوب بنا سکتا تھا۔ لیکن مصنف کا قلم اس موقع پر اس قدر خشکی سے چلا ہے کہ اس سن کی لڑکی کی اتنی اہم قربانی ایک معمولی سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ بلکہ اس سن و سال کی لڑکی کے منہ پر ایسی باتیں اچھی معلوم نہیں ہوتی ہیں۔ دیکھئے نذیر احمد اس کو کیوں کر لکھتے ہیں :-

"اصغری نے اپنی خالہ زاد بہن تماشا خانم سے کہا: کوئی اماں کو اتنی بات سمجھائے کہ آپا سے زیادہ ایک چیز نہ دیں۔ تماشا خانم نے سن کر کہا: تم بھی بوا کوئی تماشے کی عورت ہو! وہی کہاوت ہے گدھے کو نون دیا اس نے کہا میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ خدا دلواتا ہے تم کیوں انکار کرو۔ اصغری نے کہا: دلواتی ہو، اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ آپا کے مزاج سے تم واقف ہو؟ ان کو ضرور رنج ہو گا۔ ناحق اماں سے بدمزگی ہو گی، مجھ سے ان کو بدگمانی پیدا ہو گی۔"

تماشا خانم نے کہا: اس میں رنج کی کیا بات ہے؟ اپنی اپنی قسمت ہے اور سمجھنے کو سو طرح کی باتیں ہیں۔ ان کی بسم اللہ کی شادی ہوئی، روزہ رکھا گیا، چار برس تک منگنی رہی۔ تیج تہوار ان کا کون نہیں ہوا، ان کی کسر ادھر سمجھ لیں۔ اصغری نے کہا۔

"سچ ہے، مگر نام تو جہیز کا ہے۔ چھوٹی کو زیادہ ملے گا تو بڑی کو رنج ہو ہی گا، ایک گھر کا رہنا، روز کا ملنا جلنا، جس بات سے دونوں میں فرق پڑے، کیوں کی جائے" تماشا خانم نے کہا "بہن ناحق تم اپنا نقصان کرتی ہو، ابھی مہینے دو مہینے میں سب بھول بسر جائیں گے"
اصغری نے کہا "بی اللہ اللہ کرو! نفع نقصان کیا کہیں ماں باپ کے دینے سے پوری پڑتی ہے؟ اور جہیز سے عمریں کٹتی ہیں؟ خدا اپنی قدرت سے دے، تم اس بات میں اصرار مت کرو۔ بہن میں کوئی دوسری تدبیر کروں؟ مجھ کو کسی طرح منظور نہیں"
دیکھئے طرزِ تعلیم بھی بالکل بڑی بوڑھیوں کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی تیرہ برس کی ناکردہ کار لڑکی گفتگو نہیں کر رہی ہے، بلکہ دنیا کا سرد و گرم دیکھے ہوئے ایک ساٹھ برس کی کھوسٹ بڑھیا۔

(۲) دوسرا موقع وہ ہے جہاں میاں کو سمجھا بجھا کے نوکری پر سیالکوٹ بھیجا ہے۔ اس وقت کی آپس کی گفتگو میں کہیں بھی جذبات محبت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور نہ اس کو شوہر کے ساتھ محبت کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اسے زندگی میں کامیاب اور خوش حال دیکھنا چاہتی ہے۔ عقل محض ہے، اس کے ہاں ایشیائی خصوصیت یعنی "دل" معدوم ہے! ماں نے خواہ وہ پرانے ہی ڈھنگ کی سہی مگر بیٹے کا کالے کوسوں جانا پسند نہیں کیا۔ مگر بیوی کے چہرے پر شکن نہیں! ماں نے انکار کا حکم دیا۔ کامل خود بھی یہی چاہتا ہے۔ مگر اصغری منع کرتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:۔

اصغری نے کہا "صلاح اور ہوتی ہے اور دل کی خواہش اور ہوتی ہے۔ دل کی خواہش تو یہی کہ تم یہاں رہو۔ گھر کا انتظام صرف تمہارے دم سے ہے، آخر گھر میں کوئی مرد بھی چاہئے؟ اور صلاح پوچھو تو جانا مناسب ہے۔ جب ایک حاکم خود بلائے کہ تم کہتے جاتا ہے تو ضرور اپنی جگہ پہنچ کر بہت سلوک کرے گا" محمد کامل نے کہا "پانچ روپے کے واسطے کیا دو تین سو کوس کا سفر، میرا دل تو نہیں چاہتا؛ وہ مثل ہے گھر کی آدھی نہ باہر کی ساری" اصغری نے کہا "یوں تم کو اختیار ہے۔ لیکن ایسا موقع تقدیر سے ملا ہے۔ پھر ہاتھ نہ آئے گا، اور سفر کون نہیں کرتا؟ ہمارے ابا، تمہارے ابا

دیکھو ان لوگوں نے عمریں سفر میں تیر کر دیں، اور بالفعل پانچ سن لئے گئے، کتنے پانچ ہیں۔" غرض اصغری نے زبردستی جوت کر محمد کامل کو جانے پر راضی کیا۔"

خود مصنف نے منقولہ حصے کے آخری جملے میں میرے خیال کی وضاحت کر دی ہے (اپنی نری عقلیت ؟!)

(۳) اس موقع پر بھی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میاں نوکری پر رنگ رلیوں میں مشغول ہیں، تو اس میں سوت کی ڈاہ یا جلن نہ پیدا ہوتی، اسے اس کا خیال بھی نہیں ہوا کہ میاں کے پہلو میں کوئی دوسری عورت بیٹھی ہوگی، اور نہ اس خیال سے کوئی تکلیف ہوئی۔ بلکہ اسے جو خیال آیا تو یہی کہ میاں باوجود اس قدر کمانے کے گھر کے خرچ کے لئے کافی روپیہ نہیں بھیجتا، اور اس طرح گویا اس کے گھر کے بگڑنے کے آثار پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ دیکھئے ان امور کو مصنف نے کیوں کر ظاہر کیا ہے:-

> "محمد کامل .... سر رشتہ دار ہونے تک سنبھلا ہوا تھا۔ خرچ بھی برابر آتا تھا، خط بھی متواتر چلے آتے تھے؛ لیکن آخر جوان آدمی تھا، خود مختار ہو کر رہا، بری صحبت مل گئی۔ بہت جلد خطوں میں کمی ہونا شروع ہوئی۔ اصغری تو بڑی دانش مند تھی سمجھ گئی، کہ دال میں کالا ہے۔ بہت دنوں تک اصغری فکر میں رہی کہ اب کیا تدبیر کروں؟ آخر کو سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ خود جانا چاہیئے۔"

اصغری کی جگہ اگر کوئی دوسری عورت ہوتی، تو وہ کیسے کیسے بُرے خیالات دل میں لاتی، اور کس کس طرح کی کڑھتی۔ مگر وہ تو محمد کامل کی اتالیق تھی، اسے جذباتی تعلقات سے کوئی کام نہ تھا وہ اتالیقی کے فرائض ادا کرنے سیالکوٹ گئی، اور شاگرد رشید کو درست کر کے واپس چلی آئی! اتنا ہی نہیں بلکہ جب اس کے بچوں نے انتقال کیا ہے اور اس کی بھری پری گود خالی ہو گئی ہے۔ تو اس نے زیادہ جزع فزع نہیں کی، نہ زیادہ روئی پیٹی، نہ اس کے دلی جذبات اس کے کسی اضطراری فعل سے ظاہر ہوئے۔ بلکہ اس موقعہ پر بھی مامتا مغلوب اور عقل غالب دکھائی دیتی ہے۔

حق یہ ہے کہ اس طرح کی سیرت کی عورت دنیا میں جو کچھ چاہے کر سکتی ہے۔ نذیر احمدؒ

نے اس سے بہترین مصرف لیا ہو۔ یعنی معلمین، معلمات و معلمین ہی کا کام ہے کہ وہ تمام انسانی کمزوریوں سے پاک ہوں، اور اپنے نفس کو اور اپنی اولاد کو اپنے مقصد پر قربان کر دیں۔

۴۔ اصغری کی سیرت میں ایک نمایاں خصوصیت "غیرت" ہے وہ نہ خود کسی کی مرہون منت ہونا چاہتی ہے۔ اور نہ اپنے اعزا میں سے کسی کے لئے یہ پسند کرتی ہے۔

(الف) اس امر کی وہ اس قدر سختی سے پابند ہے کہ جب شوہر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ اپنے خسر کے پاس اس لئے جانا چاہتا ہے کہ اُن کے ذریعے سے تلاش معاش کرے، اور اپنی نوکری کے حاصل کرنے میں ان کے اثر اور ان کی مدد سے کام لے، تو اصغری کی غیرت نے اسے بھی قبول نہ کیا۔ دیکھئے وہ کیونکر شوہر کے اس ارادے کی مخالفت کرتی ہے؟

"کسی کا سہارا پکڑ کر نوکری کرنا کچھ ٹھیک بات نہیں، بلا سے تھوڑی ہو۔ پر اپنی قوت بازو سے ہو۔ ابا کوئی غیر نہیں ہیں، رشتے میں بھی تم سے ان کا ہاتھ اونچا ہے۔ ان سے لینا یا کچھ مانگنا بھی عیب نہیں، پھر بھی خدا کسی کا احسان مند نہ کرے، سدا آنکھ جھک جاتی ہے، انھوں نے منہ پر نہ رکھا تو کہنے میں الدور کے سو آدمی ہیں۔ منہ در منہ نہ کہیں گے۔ تو پیٹھ پیچھے کہیں گے کہ دیکھو خسر کے سہارے نوکر ہوئے۔"

(ب) اسی غیرت کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا ہے، جب شہزادی صاحب کے یہاں سے پیام آیا ہے کہ حسن آرا کی تعلیم کے لئے استانی کا عہدہ قبول کریں، اور دس روپے ماہوار تنخواہ لیں، تو باوجودیکہ تنگی سے بسر ہوتی تھی، مگر اصغری نے اس امر کو پسند نہ کیا، بلکہ بڑی خوب صورتی سے بالمعاوضہ خدمت کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس نے مائی جی سے جواباً کہلوایا ہے:۔

"دونوں بیگم صاحب کو میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا۔ اور کہنا کہ جو کچھ برا بھلا

ؔ[1] یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس فقرے میں معلم سے وہی لوگ مراد ہیں، جن کا شمار صحیح طور پر انسانیت کے محسنین میں ہوتا ہے، نہ کہ ہمارے سے بندہ زر، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھانے والے!

مجھ کو آتا ہے، مجھ کو عذر نہیں۔ اسی واسطے انسان پڑھتا لکھتا ہے کہ دوسرے کو فائدہ پہنچائے۔ اور بڑی بیگم صاحبہ کو معلوم ہوگا کہ میں اپنے میکے میں کتنی لڑکیوں کو پڑھاتی تھی، اور میرا جی بہت چاہتا ہے کہ بیگم صاحبہ کی لڑکی کو پڑھاؤں۔ لیکن کیا کروں! نہ تو بیگم صاحبہ لڑکی یہاں بھیجیں گی، اور نہ میرا جانا ہو سکتا ہے۔" مائی جی نے تنخواہ کا نام تو صاف نہ لیا لیکن دبی زبان سے کہا کہ "بیگم صاحبہ ہر طرح سے خرچ بات کی ذمہ داری کرنے کو موجود ہیں۔" اصغری نے کہا: "یہ سب اُن کی مہربانی۔ ان کی ریاست کو یہی بات زیبا ہے۔ لیکن ان کے زیر سایہ ہم سب بھی پڑے ہیں، تو خدا ننگا بھوکا نہیں رکھتا، بے داموں کی لونڈی بن کر خدمت کرنے کو میں حاضر ہوں اور اگر تنخواہ دار اُستانی درکار ہو، تو شہر میں بہت ملیں گی۔" "

رج، یہی غیرت اس وقت بھی کام آئی ہے، جب نند کے رشتے کی گفتگو نوابوں اور شہزادوں میں چھیڑی گئی ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بھلا اصغری کے خسر اپنی بیٹی کو کیا دے سکیں گے، مگر اصغری سب انتظام کئے بیٹھی تھی۔ اس نے کبھی مقابلے کا لفظ زبان پر نہ آنے دیا، مگر جب جہیز کی باری آئی تو اس دریا دلی سے کام لیا کہ رؤسا اور اُمرا بھی عش عش کرتے تھے، اور ہر کہ و مہ حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ مصنف ہی کے الفاظ میں اُن کی تفصیل سنئے۔ اور ان کی قادرالکلامی بھی ملاحظہ فرمایئے۔

" اصغری کا اہتمام، عمدہ سے عمدہ جوڑے تیار ہوئے، اور جو ہر، زیور بنا، وہ شادی ہوئی کہ مولوی صاحب کی کئی پشتوں میں نہ ہوئی تھی۔ اور سمدھیانے والے بھی سامان دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ جو سامان تھا متعدد اور بیش قیمت۔ اور جو چیز تھی نئے طور کی تھی: دو جوڑے تو بیٹے والوں کی طرف سے لئے۔ ایک ریت کے واسطے کرکری تاش کا۔ دوسرا چوتھی کے واسطے کا چوبی۔ اور گہنے جہیز اور چڑھاوے کے ملا کر تو بے انتہا تھے، ناک میں نتھ اور کیل، ماتھے کو ٹیکا، جھومر، بنیا، کانوں میں

بالی، پتے، جڑاؤ اور سادے پچھیک کے پانے، کان جھالے، گمرکیاں، بجلیاں، کرن پھول، جھمکے، گلے میں گلوبند، طوق، چپاکلی، کنٹھی، توڑا، دھگدگی، چندن ہار زنجیر، مالا، بازو پر جوشن، نورتن، بیچ بند، نونگے، ہاتھوں میں کڑے، نوگرہی، چوہے دنتیاں، پہنچے، دست بند؛ انگلیوں میں انگوٹھی، چھلے، جوڑ۔ پاؤں میں پازیب، توڑے، چوڑیاں، لچھے، پتکی، چھلے، کارچوبی، جال دار، مصالحہ دار سب ملا کر پچاس جوڑے، دو سو برتن، اور اسی حیثیت کا بالائی سامان "

۵۔ اصغری کی سیرت میں سب سے بڑی خصوصیت اس کی سلیقہ مندی اور ہوشیاری ہے، اس نے گھونگھٹ اٹھتے ہی جو سب سے پہلی چیز اپنی سسرال میں دیکھی وہ وہاں کی بدنظمی اور فضول خرچی تھی، یہ سب ماما عظمت کی کارستانیاں تھیں۔ یہ بھی عجیب و غریب شخصیت کی عورت تھی، چونکہ اس طرح کے نوکر بننے اور بگڑنے والے گھر میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ذرا تفصیل سے اس کی سیرت پر نظر کیجئے۔

" یہ عورت پچیس برس سے اس گھر میں تھی اور ہمیشہ لوٹنے پر آمادہ تھی۔ ایک دن کی بات ہو تو چھپ جائے، آئے دن اس کا فریب ظاہر ہوا کرتا تھا۔ کئی مرتبہ نکالی گئی، جب موقوف ہوئی بنئے، بزاز، سنار، قصائی، کنجڑے، جن جن سے ان کی معرفت اچاپتے قرض اٹھتی تھی، تقاضے کو آموجود ہوتے۔ اس ڈر کے مارے پھر بلائی جاتی تھی۔ یوں چوری اور سرزوری ماما عظمت کی قسمت میں لکھی تھی، چبا کر لینی اور بتا کر چرانی، دکھا کر نکالنی اور لکھا کر مکر جانی "

دس برس گھر پر اس قدر حاوی کہ کیا مجال کہ کوئی ٹوک سکے۔ اصغری کو جو دو چار روز چولہے کی نگرانی کرتے پایا۔ دل میں کھٹک گئی، بی بی کے کان بہو کی طرف سے بھرنا شروع کر دئے، میاں کامل کے دل میں بھی بی بی کی طرف سے جھوٹ بول کر میل ڈال دیا۔ وہ بھی ایسے سادے کہ اس کی افترا کو سچ سمجھ بی بی سے منہ پھلا بیٹھے! مصنف نے بہت ہی سچ فرمایا ہے کہ :۔

"دستور ہے کہ میاں بیوی میں بگاڑ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ ازبسکہ اکثر چھوٹی عمر میں بیاہ ہو جاتا ہے، خدا کے فضل سے عقل مصلحت اندیش نہ میاں میں ہوتی ہے نہ بی بی میں، اگر ذرا سی بات بھی خلاف مزاج دیکھی تو میاں الگ اکڑے بیٹھے ہیں۔ بی بی الگ منہ اونڈھائے بیٹھی ہیں، اور جب ایک جگہ کا رہنا سہنا ہوا تو مخالفت کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بکثرت واقع ہونا کیا تعجب ہے۔ یہ مخالفت کثرت ہوتے ہوتے آپس کے اتحاد اور باہم کی موافقت میں بڑا فتور پیدا کرتی ہے اور دونوں طرف سے لحاظ اور پاس اٹھ جاتا ہے، اور تمام جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔"

مگر اصغری یہ سب خوب سمجھتی تھی، اس لئے وہ اس وقت تو خاموش ہو رہی؛ لیکن اس نے اسی وقت سے انتظام کیا، باپ کو خط لکھا، خسر کے پاس بھائی کو خاص طور سے بھیجا، انہیں نوکری پر سے بلوا کے ماما عظمت کا معاملہ پیش کیا، جب ساری قلعی کھل گئی، اور وہ کسی طرح نکالی گئی؛ تو پھر اپنی پسند کی ملازم رکھی، اور چار ہی دن میں حسن انتظام سے گھر کو چار چاند لگا دئے۔ اب اصغری کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ جلدی میں بغیر سمجھے بوجھے کوئی ایسا فعل کر بیٹھتی، کہ ماما عظمت پر اس کی مخالفت فوراً ثابت ہو جاتی، اور وہ ساس کو ابھار کر بڑی بہو کی طرح چھوٹی بہو سے بھی لڑا دیتی۔ اتنے دنوں تک چپکے چپکے عظمت کی ساری چالیں دیکھتی رہنا، اور موقع و محل کی منتظر رہنا۔ تیرہ برس کی کم ہی لڑکیوں کو آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصغری سے باپ بھی خوش ہے۔ اور خسر بھی؛ دونوں معترف۔ دونوں ہر کام میں اس کا مشورہ اور صلاح میں شریک کرنا ضروری سمجھتے تھے، اصغری نے جس حسن و خوبی سے نند کی شادی طے کی ہے، وہ بھی اس کی ذہانت اور عقل پر دال ہے، عجب نہیں کہ جس دن سے حسن آرا کی تعلیم کے لئے آئی ہو، اسی دن سے اس نے ساری باتیں اپنے دل میں طے کر لی ہوں۔ اور یہی وجہ رہی ہو کہ اس نے اس کے گھر بھر کو اپنا ممنون اور زیر بار احسان بنایا ہو۔ اس شادی کے اخراجات کا انتظام بھی جس خوبی سے کیا گیا ہے۔ وہ ابھی اس کے حسنِ تدبیر پر دال ہے، تعلیم کا وہ طریقہ بھی جو نذیر احمد نے اصغری کے ذریعے رائج کرنا چاہا ہے، ایک بسیط مضمون چاہتا ہے۔ لیکن مختصراً

آج کل کے جدید ترین طریقۂ تعلیم میں بہترین مانا جاتا ہے۔

نذیر احمد نے بھی بہر نوع اصغری کا کردار بہت ہی خوب نبایا ہے، اور شروع سے آخر تک ایک حد درجہ متین اور خوش سلیقہ، غیرت دار اور مصلحت اندیش عورت کا کیریکٹر پیش کیا ہے، انھوں نے اسی سیرت کے پیش کرنے میں جذر و مد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، اور اسی لئے وہ فنی حیثیت سے اس میں بے حد کامیاب ہوئے ہیں۔

مرآۃ العروس کے مرد

رہا مردوں کا کیرکٹر، سو اس میں محمد عاقل شریف سہی، مگر حد درجہ بے وقوف تھے۔ اور محمد کامل میں کوئی کمال نہیں دکھائی دیتا اول الذکر پر بیوی اس طرح حاوی ہوئیں کہ دس روپے کی نوکری میں علیحدہ مکان کرنے کی ٹھہرائی آخر الذکر بیوی کی نظر سے اوجھل ہوتے ہی رنگ رلیوں میں مشغول ہو گئے۔ رہے ان کے باپ، وہ سوائے ماما عظمت کے معاملے کے اور کہیں بھی پیش پیش نہیں دکھائی دیتے، خود اصغری کے باپ البتہ ایک فہمیدہ اور سنجیدہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کا وہ خط جو آخر کتاب میں شامل ہے، (اور جو اس قصے کے غیر دلچسپ بنانے کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے) اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ بڑے دین دار تھے، اور دنیا کے نشیب و فراز پر انھوں نے کافی طور پر غور کیا تھا!

محمد کامل کے اعزاء خاص میں سے ایک صاحب صالح نامی بھی ہیں ان کی عمر کے بیان میں مصنف نے غلطی کی ہے۔ پہلی بار جب اُن کا تعارف کرایا گیا ہے، تو وہ موقع ہے، جب اصغری میاں کی نوکری سے واپسی کا قصد رکھتی ہے۔ اس نے یہ سوچ کے کہ محمد کامل کے ساتھ اگر عزیزوں میں سے کوئی رہے تو ان کی پچھلی عادتیں عود نہ کرنے پائیں گی۔ میاں سے فرمائش کی کہ:-

"تم اپنے خالازاد بھائی محمد صالح کو بلا لو، وہ تمھارے پاس کچہری کا کام سیکھے گا، اور پڑھے گا بھی۔ اور کہیں شاید نوکری بھی لگ جائے"

امیر بیگم کو خط گیا، اور اصغری کے رہتے محمد صالح پہنچ گیا۔ یہ لڑکا نہایت درجے کا نیک بخت

تھا، اور محمد کامل سے دو برس چھوٹا تھا۔"

آگے چل کر جب محمودہ کی شادی کی نسبت ساس سے گفتگو ہوئی تو اس میں محمد صالح کا ذکر یوں آیا ہے:۔

" رئیس نے کہا........ "میں ایک جگہ سوچے بیٹھی ہوں، محمد صالح کے ساتھ محمودہ کی شادی کروں گی۔"

اصغری نے کہا...... "کجا محمد صالح اور کجا محمودہ! بھائی محمد صالح کی عمر بھائی جان سے کچھ کم نہ ہوگی؟"

محمد کامل کی ماں بولیں........ "ہاں عاقل چھ مہینے محمد صالح سے بڑا ہے۔ ایک ہی برس کے یہ دونوں پیدا ہیں۔"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ کوئی دوسرے محمد کامل ہیں، یا ان کی عمر دوبارہ بیان کرنے میں مصنف یہ بھول گئے کہ وہ انھیں محمد کامل سے دو سال چھوٹا بیان کر چکے ہیں۔ بہر نوع خواہ وہ محمد کامل سے بڑے ہوں یا چھوٹے، مگر انھوں نے قصے بھر میں سوائے اس کے اور کوئی کام نہیں کیا ہے، جتنا کہ ان دونوں ٹکڑوں میں بیان کر دیا ہے۔

مکالمہ نگاری

یہاں تک تو سیرت نگاری سے بحث تھی، ناول کا خاص عنصر مکالمہ نگاری بھی ہے۔ مولانا اس عنصر میں بہت کامیاب ہیں؛ خاص طور سے عورتوں کی باتیں، ان کے مخصوص محاورات، ان کے اظہار خیالات کے مختلف طریقے، ان کی سادی زبان، ان کا روزمرہ، مولانا کو خوب معلوم ہے۔ اردو کے بہت ہی کم مصنفین مولانا کی اس خاص عنصر میں ہمسری کر سکتے ہیں۔

(۱) مثلاً وہ ٹکڑا ملاحظہ ہو جس میں شاہ زمانی بیگم اور اصغری سے محمودہ کی شادی کے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔

" شاہ زمانی بیگم نے کہا "میں خود استانی جی کے پاس جاتی ہوں" حسن آرا کو

ساتھ لے کر اصغری کے پاس گئیں، اور کہا کہ "استانی جی تم اتنی بڑی تو عقل مند اور اتنا نہ سمجھیں کہ رشتہ ناتہ برابر کے ساتھ ہوتا ہے۔ علوی خان کے گھر سے اس بات پر غصہ ہوا کہ انھوں نے سونے کا چھپر کھٹ نہیں مانا۔ بھلا تم محمودہ کو کیا دو گی" اصغری نے کہا: "بیگم صاحبہ میں نے تو لڑکی کے بیاہ کے واسطے ایک بات کہہ دی تھی، کچھ لڑکی کے مول تول کا پیام نہیں دیا۔ شہر میں اگرچہ اب کل رسمیں بگڑ گئی ہیں لیکن لینے دینے کا چکوتا کہیں نہیں سنا، جو بیٹی دے گا وہ کیا اُٹھا رکھے گا؟ باقی رہی برابری، سو ظاہر ہے، کہ دولت کے اعتبار سے تو یہاں علوی خان صاحب کا چوتھائی بھی نہیں، لیکن آپ تو لڑکا بیاہتی ہیں، آپ کو جہیز کی کیا فکر! لڑکی دیتی ہو تو انسان یہ بھی سوچ کرے کہ بھائی لڑکی کا گذر دیکھ لو۔ اب کوئی غریب ہو اور بہو کے جہیز پر اُدھار کھائے بیٹھا ہو، وہ اس کی فکر کرے تو بجا ہے۔ آپ تو بیٹی لیتی ہیں۔ اور سب کچھ خدا کا دیا ہوا آپ کے یہاں موجود ہے۔ آپ کو تو لڑکی چاہیئے، سو لڑکی آپ کی دیکھی ہوئی ہے، کوئی حال اس سے آپ کا مخفی نہیں۔ ذات جو کچھ بُری بھلی ہے آپ کو معلوم ہے۔" شاہ زمانی نے کہا "کیا ہوا پھر بھی جوڑ دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔" اصغری نے کہا: "بیگم صاحب خطا معاف۔ اب جوڑ کہاں ہے، جوڑ تو ان دنوں تھا جب علی نقی خاں نے اسی گھر اپنی بہن کو بیاہ دیا تھا، یا یہ وہی گھر ہے کہ بیٹی لینے کے واسطے بھی جوڑ نہیں! اب کیا اس گھر میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ دولت نہیں، سو یہ بڑا بول خدا کو نہیں بھاتا۔" اصغری نے شاہ زمانی کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بات نہ بن پڑی۔ اور شاہ زمانی نے کہا: "استانی جی تم خفا ہوتی ہو۔" اصغری نے کہا "بیگم صاحب میری کیا مجال ہے، مجھ کو تو امید تھی کہ آپ اس بات میں امداد کیجئے گا، نہ کہ خود آپ ہی کو ناگوار ہے۔" شاہ زمانی نے کہا "استانی جی برا مانو یا بھلا جوڑ نہیں ہے۔" اصغری نے کہا۔ "دولت میں ہم جوڑ نہیں ذات میں برابری کا دعویٰ ہے۔ ہنر میں انشاءاللہ وہ ہمارے جوڑ نہ ٹھہریں گی۔"

کیسا مضائقہ ایک بات میں وہ کم ، ایک بات میں ہم کم ، ہماری ایسی بہو دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈتی پھریں گی تو نہ ملے گی " شاہ زمانی بیگم نے کہا " استانی جی ، اقبال مند خاں کے لڑکے کا رقعہ کیوں نہیں منگواتیں ؟ " اصغری نے کہا " میں نے سنا تھا کہ آپ کے گھر بات ہو رہی ہے اس سے میں نے خیال نہیں کیا۔ اور رقعوں کی کیا کمی ہے ، لڑکیوں کو لڑکے بہت اور لڑکوں کو لڑکیاں بہت ، میں نے تو سوچا تھا کہ ہنر اور دولت کا ساتھ ہے - یہ چیز امیروں کے لائق ہے ، اور امیر اس کے زیبا ہیں - بات ٹھہر جائے تو دونوں کے لئے اچھا ہے ، اور اگر منظور نہیں تو آپ دلدار جہاں سے نسبت کر دیجئے " شاہ زمانی نے کہا " ابھی دلدار بچہ ہے ، اور میرا ارادہ ہے کہ اس کو غیر جگہ دوں ، رشتے میں رشتہ بے لطفی سے خالی نہیں ہوتا " ،،

(۳) یہ تو بی بیوں کی گفتگو تھی ، ذرا وہ موقع بھی ملاحظہ ہو جہاں ماما عظمت میں اور اصغری کی ماں میں دو دو باتیں ہوئی ہیں - دیکھئے کفایت النساء نے اس نمک حرام کو کیا آڑے ہاتھوں لیا ہے مگر پھر بھی وہ اپنے کرتوتوں سے اس وقت تک باز نہ آئی جب تک اچھی طرح رسوا ہو کر نکالی نہ گئی

" رات کے وقت کھانے سے فراغت ہو کر کوٹھے پر اصغری پان کھا رہی تھی ، کفایت النساء بھی پاس بیٹھی ہوئی تھی ، اتنے میں ماما عظمت آئی ، کفایت النساء نے کہا " کیوں بوا عظمت یہ کیا ماجرا ہے ، چوری کون نوکر نہیں کرتا - دیکھو یہ گھر والی موجود ہیں ، سات برس تک برابر ان کی خدمت کی ، گھر کا کاروبار سب یہ اٹھائے ہوئے تھیں ، اللہ رکھے امیر کا گھر اور امیری خرچ ، ہزاروں روپے کا سودا انھیں ہاتھوں سے آیا ، حق دستوری یہ کیوں کر کہوں کہ نہیں لیا ؛ اتنا تو ہم نوکروں کا دھرم ہے چاہے خدا بخشے ، چاہے خدا مارے ، لیکن اس سے زیادہ تو ہضم نہیں ہو سکتا آگے بڑھ کر نمک حرامی میں داخل ہے "!

" عظمت نے کہا " بھلا میرا حال کون نہیں جانتا ، اب میری بلا چھپائے ! ہاں میں تو چراتی اور لوٹتی ہوں ، لیکن نہ آج سے بلکہ سدا سے میرا یہی کام ہے ۔ ذرا میری حالت پر بھی تو نظر کرو ۔ کہ اس گھر میں کس بلا کا کام ہے ۔ اندر باہر میں اکیلی آدمی ' چار نوکروں کا کام اکیلے دم پر پڑتا ہے ۔ پھر لوبے مطلب تو کوئی اپنی ہڈیاں یوں نہیں پیلتا ! بیوی کئی مرتبہ مجھ کو موقوف بھی کر چکی ہیں ۔ پھر آخر مجھی کو بلوایا سمجھ کا پھیر ہے ، کوئی یوں سمجھا اور کوئی دوں سمجھا ! چار آدمی کے بدلے میں اکیلی ہوں ، چار کی تنخواہ بھی مجھ اکیلی کو ملنی چاہیئے "

(۳) ایک ٹکڑا اس وقت کا بھی ملاحظہ ہو ، جب کہ تعلیم کے اصول اور اس کے موضوع سے بحث کی گئی ہے ۔

۱۴۹۵۲

" ایک دن چار گھڑی رات گئی ہوگی ، فضیلت کو جانے میں دیر ہوئی سیفہن اس کو لینے آئی ، تو کیا دیکھتی ہے کہ محمودہ کہانیاں کہہ رہی ہے ، اور مکتب کی سب لڑکیاں اس پاس بیٹھی ہیں ، اور خود استانی بھی لڑکیوں میں بیٹھی کہانیاں سن رہی ہیں ۔ تب تو سیفہن کا جی جل کر خاک ہوگیا اور بولی کہ " واہ استانی جی ! اچھا تم نے لڑکیوں کا ناس کر رکھا ہے ۔ جب کبھی فضیلت کو دیکھنے آئی کبھی میں نے اس کو پڑھتے نہ پایا ۔ مکتب کیا ہے اچھا کھیل کا بہانہ ہے ۔ تب ہی تو لڑکیاں دوڑ دوڑ کر آتی ہیں " اصغری نے کہا " بوا اگر تمہاری مرضی کے موافق تمہاری لڑکی تعلیم نہیں ہوتی ، تو تم کو اختیار ہے ۔ اپنی لڑکی کو اٹھالے جاؤ ، مگر مکتب پر ناحق کا الزام مت لگاؤ ۔ بھلا میں تم سے پوچھتی ہوں فضیلت نے مائی جی کے مکتب میں کتنے دنوں پڑھا ؟ سیفہن نے کہا " میران جی کے چڑھتے چاند اس کو بٹھایا تھا ، مدار بھر پڑھا ، خواجہ معین الدین بھر پڑھتی رہی ، ماہ رجب سے تمہارے یہاں ہے " اصغری نے پوچھا " مائی جی کے یہاں فضیلت نے کیا پڑھا ؟ " سیفہن نے کہا " تین مہینے میں والمحصنٰت کا

سیپارہ ، اور آدھا لا یحب اللّٰہ ! " اصغری نے کہا " تین مہینے میں ڈیڑھ سیپارہ تو مہینے میں آدھا سیپارہ ہوا۔ یہاں تمھاری فضیلت ماہ رجب سے ہے۔ اور اب خالی کا چاند چڑھتا ہے۔ چار مہینے ہوئے " وما ابرئ نفسی کا سیپارہ کل ختم ہوا یعنی ساڑھے سات سیپارے پڑھے۔ حساب سے مہینے پیچھے ایک سیپارے کے قریب ہوتا ہے۔ مانی جی کے مکتب سے دونا۔ اور جب فضیلت یہاں آئی تو کالی لکیر تک اس کو کھینچنا نہ آتی تھی ، اب نام لکھ لیتی ہے ، اور بساط بموجب حرف بھی برے نہیں ہوتے بیس تک بھی پوری گنتی نہیں جانتی تھی۔ اب پندرہ کا پہاڑہ یاد کرتی ہے۔ سینے میں تیچی تک سیدھی بھرنا نہیں آتی تھی۔ اب اس کے ہاتھ کا بخیہ دیکھو ، لائیو عقلیہ ذرا بقچہ ! فضیلت نے جو کرتی میں بخیہ کیا ہے۔ ذرا اُن کو دکھاؤ۔ اور فضیلت کے ہاتھ کی کیکری ، مرمرا ، چڑیاں خانہ توڑ ، دیکھت بھولی خاکہ تار شمار جنبلی کا تار ، ترپن ، بیل کا مانی ، کچھ ہو تو وہ بھی اُٹھا لاؤ " فضیلت بولی " استانی جی میں جا کرے آؤں " ،

فضیلت دوڑی دوڑی جا کر اپنا کشیدہ اٹھا لائی۔ سنیعہن ایک بات کے دس دس جواب سن کر ہکا بکا ہو کر رہ گئی ۔

تتمۂ کلام | باوجود ان تمام خوبیوں کے جو بالتصریح بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب نصابی ہی حیثیت سے پڑھی اور پڑھائی جا سکتی ہے بطور ایک دلچسپ قصے کے اس کا شروع سے آخر تک پڑھنا حد درجہ مشکل ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مصنف نے ابتدا ہی میں ہمیں قصے کا سارا پلاٹ بتا دیا ہے اور اکبری کی طرح اصغری کی زندگی کا بھی دلچسپ پہلو جلد ہی ختم ہو جاتا ہے ، دنیا اور قصے کو سب سے زیادہ دلچسپ بنانے والا عنصر یعنی عشق ، اس قصے میں سرے ہی سے غائب ہے۔ اگر کوئی مصنف اس عام پسند عنصر کے استعمال سے احتراز کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے پلاٹ میں اس طرح کے الجھاوے ڈالنا چاہیے اور پراسرار و نہفتہ کارروائیوں کو شامل کر کے قصے کو اس

کا دلچسپ بنا دینا چاہئے کہ ناظر شروع سے آخر تک کتاب کو پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ مولانا نذیر احمد کی ساری تصنیفات میں سے اگر کسی میں یہ دلچسپی آخر تک باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف توبۃ النصوح ہے، مرآۃ العروس اور بنات النعش وغیرہ کے پلاٹ میں مطلقاً دلچسپی نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب ڈائرکٹر بہادر پنجاب یا جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر اپنی تقریظوں میں مولوی نذیر احمد کی اس تصنیف کو کتاب کے نام سے موسوم فرماتے ہیں اور کہیں پر بھی اسے "ناول" کے لفظوں سے یاد نہیں کرتے۔ ہم بھی اسے باقاعدہ ناول تسلیم نہ کرنے پر مجبور ہیں، مگر اسی کے ساتھ ہم اسے اردو ادب میں وہی جگہ دینا چاہتے ہیں جو فرانسیسی زبان اور تعلیمی دنیا میں روسو کی "امیلی" کو حاصل ہے!۔

ہندوستان اور مزدوری

جناب ریاض الدین صاحب ام اے۔ "ہندوستانی مزدور تحریک کی ایک مختصر تاریخ" کے عنوان سے ایک کتاب تیار کر رہے ہیں۔ کل کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہوگی۔

(۱) ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک — ہڑتالوں کا دور۔

(۲) ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک — قدرے سکون کا زمانہ۔

(۳) ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک — ریلوے اور کپڑے کی ملوں کی ہڑتال

(۴) ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء تک — کساد بازاری کا دور

(۵) موجودہ دور — صنعتی کاروبار میں عام بے چینی

ان عنوانات کے تحت مزدوروں سے متعلق ان قوانین کا بھی ذکر ہوگا جو وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق نافذ ہوتے رہے۔

ذیل کا مضمون اس سلسلے کا پہلا باب ہے۔ اور ابتدائیہ یا تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایڈیٹر

ہندوستان ایک بہت بڑا زراعتی ملک ہے، جسے قدرت نے طرح طرح کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ یہ ملک زرخیز میدانوں اور وادیوں کا وہ خطہ ہے جس کی شادابی دنیا کی حریصانہ نگاہوں کو ہمیشہ ملتفت کرتی رہی ہے۔ یہاں کے دریاؤں اور سمندروں کی بے پایاں طاقت، اسٹیم سے چلنے والی مشینوں اور موجودہ صنعتی کاروبار کے لئے کھلا ہوا چیلنج ہے۔ یہاں کی زرعی اور معدنی دولت کے امکانات، حاسدانہ نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مگر افسوس قدرت کی اس فیاضی نے ہمیں مجہول اور بے عمل بنا دیا۔ اس کی زرخیزی کے باوجود ہم زراعت کے طریقوں سے بیگانہ رہے۔ دریاؤں اور سمندروں کے باوجود ہم صنعت و حرفت سے عاری رہے۔ بجلی کی بے بہا دولت کے باوجود ہم مفلس اور غیر صنعتی بنے رہے

لوہے، کوئلے اور دیگر معدنی خزائن کے باوجود ہم دوسروں ہی کے دست نگر رہے۔ آسودگی اور خوش حالی نے مزید ترقی کی راہیں ہم پر بند کر دیں اور پیداوار کی کثرت نے رعایا اور زمیندار دونوں کو بے فکر اور فارغ البال بنا دیا۔ مگر یہ دور بجلی کی طرح چمکا اور پانی کی طرح برس کر ختم ہو گیا۔ نئی حکومت اور تہذیب جدید نوواردوں کی کثیر تعداد اپنے ساتھ لائی یہ لوگ حکومت کے نشہ میں مست تھے۔ خود نمائی اور عیش پسندی ان کا مسلک تھا۔ انھیں مغربی وضع قطع کے شہر پُر تکلف دوکانیں اور شاندار بنگلوں کی ضرورت تھی۔ ان کے لئے عمدہ سڑکیں، خوبصورت باغات، بجلی کی روشنی اور پانی کے پائپ درکار تھے۔ ان کے تمام مصارف کا بوجھ اسی غریب کسان پر پڑا جو دیہات کی بے کیف زندگی میں ان کی ضروریات کو محنت اور جانفشانی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے مجبور تھا۔ پھر وہی نہیں بلکہ ان کے اعزا اور اقربا کے اخراجات بھی جو دور دراز مغربی ممالک میں پرورش پا رہے تھے اُنہی کے سر پڑے ان کے صنعتی کاروبار کو فروغ دینا، اپنی خام پیداوار ان کی خدمت میں پیش کرنا، ان کی تیار کردہ چیزیں خریدنا وغیرہ، سب کے سب اسی غریب کا حصہ تھے جس کا نام کسان ہے۔ ملک کی تہذیب اور کاروبار کا نقشہ جب اس طرح بدلنا شروع ہوا تو ہم خود بھی اس سے بھاگ کر کہاں جا سکتے تھے۔ ہم نے بالآخر دیہات کو خدا حافظ کہا۔ اپنی دولت کی کثیر رقمیں شہروں میں لا لا کر پھونکنا شروع کیں۔ ہمارے لئے بھی آسائش کی وہ تمام راہیں کھل گئیں جو پستی، ذلت اور افلاس کے عمیق غاروں کی طرف رہنمائی کر رہی تھیں۔ نئے طرز معیشت نے ہمیں اس طرح مسحور کر لیا کہ ہم خود ہی اپنے اور اپنے بھائیوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

دیہات اور شہر میں تفاوت اس طرح جا بجا مغربی طرز کی نوخیز آبادیاں ابھرنے لگیں۔ شہروں کے گرد و نواح میں ملیں اور فیکٹریاں قائم ہونے لگیں اور صنعتی کاروبار کا سلسلہ وسیع تجارتی منڈیوں اور عظیم الشان بازاروں کے گہواروں میں نشوونما پانے لگا۔ ایک طرف شہروں کی نظر فریبی کا یہ عالم اور دوسری طرف دیہاتوں میں قرض کی زنجیریں۔ مہاجنوں کی سخت گیری، زمینداروں کی محکومیت،

خصیل لگان کے جابرانہ قوانین، سامان خورونوش کی تنگی اور دیہی تنظیم کا فقدان[1]۔ کیسے لخراش مناظر ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہ تھا کہ بیکس اور مجبور کاشتکار شہری صنعتوں اور کاروبار میں حصہ نہ لیتے۔ وہ دیہاتوں سے ترک رفاقت کرنے اور احاطۂ مل میں ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے مجبور تھے لیکن[2] شہروں کی زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود اس فطری سادگی سے معمور نہ تھی جس کے وہ عادی تھے، اس آزاد فضا سے لبریز نہ تھی جو ان کی زندگی کا مطمح نظر تھا۔ ان مذہبی رسم ورواج[3] کی متحمل نہ تھی جو ان کا ایمان تھا۔ لہذا باوجود افلاس اور تباہی کے عرصہ تک وہ اس خوش نما خیال سے جو شہروں کی صورت میں پھیل رہا تھا بچتے ہی رہنے کی کوشش کرتے رہے[4] شہروں سے پیوند | لیکن بالآخر سیم وزر کا سبز باغ کب تک پھل پھول نہ لاتا۔ شہری ایجنٹوں اور دلالوں کی چرب زبانی کارگر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور جاہل ناسمجھ اور مفلس کاشتکاروں اور اُن کے بچوں کو شرقی طرز معیشت کو خدا حافظ کہنا ہی پڑا اور اس سے مفر ممکن ہی کب تھا؟ جب دیہی کاروبار ہی ہاتھ سے نکل گئے[5] زرعی پیداوار میں منافع کی صورت ہی باقی نہ رہی۔ فارغ البالی اور خوش حالی کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں تو دیہاتی مناظر کی تمام رعنائیاں بھی یکے بادیگرے رخصت ہونے لگیں۔ شہر کا دروازہ کھل چکا تھا۔ ملوں اور فیکٹریوں کو مزدوروں کی تلاش تھی۔ لہذا موقع سے استفادہ نہ کرنا کیونکر ممکن تھا۔ لوگ جوق درجوق شہروں میں جانے لگے۔ تمام دن بجائے کھیتوں کے مشینوں میں صرف کرنے لگے لیکن مزدوری کے معینہ اوقات کے علاوہ جو کچھ تھوڑی بہت فرصت ملتی اسے وہ دیہاتوں ہی کا حق سمجھتے۔ علی الصباح نکلنا اور سورج غروب

---

[1] ملاحظہ ہو Indian Peasant uprooted. باب اوّل از مارگریٹ ایڈ۔

[2] شہروں سے عام طور پر فیکٹری ٹاؤن مراد ہے۔

[3] مذہبی رسوم کی قربانی ہندوستانی خصوصاً دیہاتی کے لئے بہت مشکل ہے۔

[4] ابتدائی زمانے میں مزدوروں کی بھرتی کا خاص انتظام کرنا پڑتا تھا تفصیل کے لئے صفحہ ۱۴۱۹ انڈین ایر بک Indian year Book. ملاحظہ ہو

[5] دیہی کاروبار کا ملوں کی پیداواروں سے مقابلہ ناممکن تھا۔

ہوتے ہوتے اپنے دیہاتی مسکنوں پر واپس آنا اُن کا طریق کار تھا۔ اس طرح دیہات اور شہر میں ایک رشتہ قایم ہوگیا۔ مگر یہ رشتہ آزادی اور حق برادری کا نہیں بلکہ جسم فروشی اور جاں فروشی کا تھا، آسودگی اور خوش حالی کا نہیں بلکہ مجبوری اور بے لبسی کا تھا۔[۱]

دیہاتی مزدوروں کے خواص | مگر یہ مزدور برطانیہ فرانس اور جرمنی کے مزدوروں کی طرح نہ تھے جن کی روزی کا دار مدار صرف صنعت و حرفت پر تھا۔ اگرچہ وہ دیہات سے بھاگ کر شہروں میں آ گئے تھے مگر ان کا دل وہیں تھا۔ زرعی کاروبار سے انھیں ابھی تک دلچسپی تھی۔ ملوں میں کچھ ہی عرصے کام کرنے کے بعد ان کا دل دیہاتی جھونپڑیوں اور لہلہاتے سبزہ زاروں کے لئے بیتاب ہو جاتا، اور وہ جلد ہی اس پُر کیف دنیا کی طرف کھنچ جاتے جس کی تباہی اور خستہ حالی بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی۔ شہر میں جانے والے مزدوروں کی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک وہ جو ملوں سے ملحقہ دیہاتوں میں رہتے تھے اور ہر روز اپنے گھروں کو واپس آ سکتے تھے دوسرے وہ جو دور افتادہ دیہاتوں سے چل کر آتے تھے اور روز واپس نہیں جا سکتے تھے۔ یہ لوگ سال کا بیشتر حصہ احاطۂ مل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بسر کرنے کے لئے مجبور تھے۔ مگر فصل بونے اور کاٹنے کے زمانے انھیں بھی دیہاتوں کی طرف کھینچ ہی لیتے۔ لہٰذا قرار اور استقلال کے ساتھ ملوں کا ہو جانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ نہ وہ اس فضا سے مانوس تھے۔ نہ یہ ماحول ان کے مناسب حال تھا۔ نہ ان کی ضروریات اور تمنائیں یہاں پوری ہو سکتی تھیں۔ اس لئے غیر مستقلی ان مزدوروں کی اہم خاصیت تھی۔ یہ کمزوری اپنی جگہ کتنی ہی فطری کیوں نہ ہو صنعتی ترقی اور ملوں کی کارکردگی کے منافی تھی۔

دیہاتی مزدوروں کی دوسری بڑی کمزوری جہالت تھی۔ ملوں اور مشینوں کا انھیں

---

[۱] ابتدائی زمانے میں ملوں کے اوقات نسبتاً بہت طویل تھے اور مزدوروں کی تندرستی اور جان کی حفاظت کے لئے کسی قسم کے قوانین نافذ نہیں تھے۔

[۲] مزدور شہروں کی طرف خوشی سے نہیں گئے تھے بلکہ دھکیل دئے گئے تھے (لیبر کمیشن ۱۹۳۱ء)

کوئی تجربہ نہ تھا۔ دیہاتی کاروبار کی موٹی موٹی باتوں کے علاوہ انھیں کسی چیز کا علم نہ تھا اور درحقیقت وہ زراعت کے بھی انہی اصولوں پر کاربند تھے جو ان کے باپ دادا کے وقت سے چلے آرہے تھے اس لئے وہ ملوں کے مصنوعی شعبوں میں ہنرمندانہ کارکردگی کے اہل نہ تھے۔ مگر محنت اور جانفشانی کے تمام کام وہ بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حالت بھی بدلتی رہی۔ سال بہ سال اور دن بدن وہ آزمودہ اور تجربہ کار ہوتے رہے۔ بایں ہمہ وہ اپنے حقوق اور اپنی قدر و قیمت سے ناواقف ہی رہے۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد جو رقم شام کو ہاتھ آجاتی وہی ان کا ماحصل تھا۔ انھیں کم و بیش کی تمیز نہ تھی کھیتی کے ساتھ یہ کام گویا ایک کاروباری شغل تھا اور اس کی آمدنی ایک طرح کی زاید آمدنی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجرت کی قلیل رقم پاکر بھی وہ مطمئن تھے۔ اوقاتِ کار کی زیادتی کا ان پر اثر نہ تھا۔ تنگ و تاریک مکانات سے انھیں شکوہ نہ تھا۔ اور صنعتی بیماریوں اور آب و ہوا کے مضر اثرات کا تو شاید وہ احساس بھی نہ کرسکتے تھے۔

دیہی تعلقات کی ضرورت | لیکن کیا ایسی حالت میں یہ مناسب تھا کہ مزدوروں کے موجودہ دیہی تعلقات کو منقطع کرادیا جاتا[۱] اور اس طرح ان کے ذریعۂ معاش کے اس ٹمٹماتے چراغ کو جو ان کا آخری سہارا تھا گل کردیا جاتا؟ اگر نہیں تو اس اجڑے دیار کو اور اجاڑنے کی کیوں کوشش کی گئی؟ دیہات سے دور بڑی بڑی ملیں کیوں قایم کی گئیں؟ غریب کسانوں کی دیہاتی جھونپڑیاں توڑ کر شہری کال کوٹھریاں کیوں آباد کی گئیں؟ کیا ہمیں معلوم نہیں کہ ہندوستان کی صنعت، حرفت اور تجارت کا دار و مدار شہروں پر نہیں بلکہ دیہاتوں پر ہے؟ آپ دیکھئے کہ خام پیداوار کو صنعت و حرفت کے ذرائع سے تیار شدہ صورت میں تبدیل نہ کیا جائے۔

---

[۱] مزدوروں کے غیر مستقل قیام کی کمی کو پورا کرنے کے لئے شہروں میں نئے مکانات تعمیر کئے گئے جن کا مقصد ان کو دیہاتوں سے قطع تعلق کرادینا تھا۔ چنانچہ اس وقت بمبئی میں ...۷ ۱۶ مزدوروں اور احمدآباد میں ۳۴،۰۶ کی رہائش کا انتظام ملوں کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو انڈین ایر بک سنہ ۳۰ء صفحات ۲۶۱، ۲۶۲، ۳۔

اور شہر کی منڈیاں ان کی خرید و فروخت کے لئے قایم نہ کی جائیں تو دیہات کی پیداوار کوڑیوں کے مول بکے اور کوڑے کی طرح پھینکی جائے۔ یہ بالکل بجا اور درست ہے، مگر اس حقیقت کو کیا کیجیے گا کہ ہندوستان ایک بڑا زراعتی ملک ہونے کی وجہ سے صنعت و حرفت کے ان طور اور طریقوں کا متحمل نہیں ہو سکتا، جو مغربی ممالک میں برتے جا رہے ہیں۔ بڑی بڑی ملیں اور فیکٹریاں جو ہماری دیہاتی سنہر منڈیوں کو نیست و نابود کر چکی ہیں۔ ہمارے لئے ناموزوں اور بے سود ہیں۔ اور شہری تمدن اور دستور ہماری دہقانی زندگی کی شان کے خلاف ہے۔ درحقیقت صنعت و حرفت کے موجودہ طریقوں نے شہر اور دیہات کو ایک دوسرے سے جس طرح جدا کر دیا ہے۔ وہ ہماری فلاح و بہبود کے منافی ہے۔ ہمارے لئے تو دیہاتی کاروبار کی ضرورت ہے۔ دیہاتی کاروبار ہی ہماری زندگی کی جان ہے۔ نواہ بجا کہ مشینیں ہوں، مگر کم خرچ اور مختصر جو دیہات کے گھر گھر میں لگائی جا سکیں۔ کام کی تقسیم ہو، مگر اس طرح نہیں جیسے، بڑی بڑی ملوں میں ہوتی ہے، بلکہ اس طرح کہ ایک صنعت کے مختلف حصوں اور شعبوں کے لئے مختلف مشینیں ہوں اور ہر مشین دیہاتی گھروں میں نصب ہو۔ ہر گھر اپنی پیداوار کو ایک خاص تنظیم کے ساتھ کسی بڑی مل یا فیکٹری میں جمع کرے جو انتہائی مدارج کو طے کر کے پیداوار کو مکمل اور آخری شکل میں خریدار کے سامنے پیش کر سکے۔ اس طرح گویا صنعت و حرفت کا قریب قریب کل بار انہی دہقانیوں پر ڈالا جائے، جو اپنی صنعتوں کو کھو چکے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ سائنس کی ترقیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے مردہ کاروبار کو پھر زندہ کر سکیں۔ صنعت و حرفت اور دیہاتوں کے درمیان اس قسم کے تعلقات یقیناً اصلی اور خاطر خواہ ہوں گے اور یہی دیہاتوں کی تباہی اور افلاس کا علاج کر سکیں گے[1]۔

---

[1] اس موقع پر لیبر کمیشن کی اس تجویز کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے جو ملوں کو دیہات سے تعلق پیدا کرنے کی تاکید کرتی ہے اور ان کی یہ تحریک بھی قابلِ غور ہے کہ مکانات کی ساخت سے مزدوروں کے ماحول کو دیہاتی بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ چنانچہ بعض ملکی ریاستوں نے مزدوروں کی رہائش کے لئے دیہاتوں ہی میں (باقی صفحۂ آئندہ)

مزدور تحریک کا آغاز | المختصر کاروباری ترقی کے دورِ جدید نے دیہی صنعتوں کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستان کی ۶۵ فیصدی آبادی کی گزر اوقات اور نشو و نما کے لئے صرف زراعت ہی زراعت رہ گئی۔ اب سے مجبور ہو کر انھیں شہر کی صنعتوں میں نمایاں حصہ لینا پڑا۔ مگر ان کی شہری زندگی مصائب اور آلام سے پُر ہو گئی۔ یہی کاشتکار جو دیہات کی نرم و تازہ غذاؤں پر پرورش پا رہے تھے شہروں میں ٹکڑے کے لئے ترسنے لگے۔ اعلیٰ اور انواع و اقسام کے غلوں کے بجائے ادنیٰ قسم کے گیہوں اور جو کے لئے بھی وہ دوسروں کے دستِ نگر رہنے لگے۔ دودھ، گھی، دہی جیسی عام چیزیں ان کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہو گئیں۔ پھل اور تازہ ترکاریاں جن کی قدر و قیمت کا انھیں کوئی اندازہ ہی نہ تھا ان کی حدِ تحصیل سے بالاتر ہو گئیں۔ اس پر فیکٹری کے احاطوں کی گنجان آبادیاں، ہوا کی گندگی اور شور و غل کا ہیجان اپنے ساتھ قسم قسم کی جسمانی اور ذہنی بیماریاں بھی لائیں جس نے مزدور پیشہ طبقہ کی کارکردگی کو بہت کم کر دیا۔ اوقاتِ کار ضرورت سے زیادہ لمبے۔ اجرت کا نرخ برا ہوا اور ملازمت کے دیگر حالات ایسے بدتر اور غیر موزوں تھے کہ ان کا بیان ناممکن ہے۔ نہ بچوں کے لئے عمر کی قید تھی۔ نہ ہفتہ وار تعطیلوں کا کوئی دستور تھا۔ نہ حفظانِ جسم و جان کے قوانین نافذ تھے۔

دیہاتی طرز کے مکانات تعمیر کرائے ہیں۔ اس طریقے سے ممکن ہے کہ مزدوروں کی کارکردگی پر اچھا اثر پڑے مگر افلاس اور بیکاری کا علاج اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ صنعت و حرفت ساہوکاروں سے نکل کر مزدوروں کے ہاتھوں میں نہ آ جائے اور شہروں سے گذر کر دیہاتوں میں نہ پہنچ جائے۔

۱؎ حکومتِ ہند اب محسوس کرنے لگی ہے کہ دیہی کاروبار کے زندہ کئے بغیر موجودہ تباہی اور بیکاری کا علاج ناممکن ہے۔ اور جا بجا دیہات سدھار کی کوشش کر رہی ہے لیکن یہ طرزِ عمل کامیابی کی راہ گذر سے بہت دور ہے۔ جب تک صنعتی تعلیم اور ایسے صنعتی اداروں کی ضرورت ہے جو نہ صرف قلیل دیہاتوں میں قائم ہو سکیں اور ان کا انحصار سائنس کے ایسے طرزِ جدید پر ہو جن کی پیداوار سے مقابلہ شہر کی بڑی بڑی صنعتوں کے لئے ناممکن ہو جائے۔

مالکانِ کارکو صرف پونڈ اور شلنگ سے غرض تھی وہ یہ بھول چکے تھے کہ غریب اور بے زبان مزدور بھی کسی انسانیت کے برتاؤ کا مستحق ہے۔ وہ مزدوروں کے جسم کا لہو اس وقت تک چوستے رہنے کے لئے مستعد تھے جب تک کہ ان کی مشینوں کے پُرزے گھس گھس کر جواب نہ دے جائیں۔[1] اس طرح دولتمند ساہوکاروں کے خلاف جو مشینوں اور فیکٹریوں کے مالک تھے ایک ایسی تحریک کا آغاز ہوا جس کی قدرتی طاقت اور بڑھتی ہوئی روانی کو روکنا ناممکن تھا۔ اس تحریک کی ابتدائی جدوجہد میں سُہراب جی شاپُورجی بنگالی کا نام جلی قلم سے لکھا جائیگا۔

⁂

[1] ملاحظہ ہو ”ابتدائی فیکٹری قوانین“ صفحہ ۲۱۹ از ڈبلیو ایچ بی۔

تہذیب حاضر کا خاتمہ

یورپ کے کور مغزوں کے نام

اس قسم کے جملے کہ "آئندہ جنگ موجودہ تہذیب کا فاتحہ پڑھ دے گی۔ یا پھر یہ کہ آئندہ جنگ سے تہذیب کی تباہی اس قدر یقینی اور ناگزیر ہے کہ وہ وقوع میں نہ آئے گی" بار بار سننے میں آئے ہیں تہذیب کے زوال کے بارے میں یورپ کی ہر قوم کے سربرآوردہ لوگوں کی طرف سے تنبیہ کی جا چکی ہے۔ تاہم یہ امر کہ ہر قوم کے اونچے طبقے کے لوگوں کو آنے والی جنگ کی تیاری کرنی چاہئے۔ تعجب انگیز نہیں، اس لئے کہ کوئی مطلق العنان حاکم کتنا ہی غیر متمدن سہی، اسلحہ سازی کے کارخانوں کا یہ مقولہ اپنی زبان میں دہرا سکتا ہے کہ "صلح چاہتے ہو تو جنگ کی تیاری کرو"۔ کسی قوم نے مدافعت کے لئے ہی سہی، پانچ ہزار طیارے اور دس ہزار عمدہ ٹینک فراہم کر لئے تو سمجھئے کہ قیام تمدن میں اس نے اپنا حصہ پورا کر دیا۔ اور اسے اس پر بجا طور پر فخر ہونا چاہئے۔

مگر یہ بات کچھ عجیب سی ہے کہ جب کبھی سیاست داں آنے والی جنگ کے خونی منظر یا اس کے ہولناک نتائج پر نہیں، بلکہ خود جنگ کے بارے میں غور کرتے ہیں تو اُن کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ شاید اب بھی اُن کے ذاتی یا ملکی فائدے کی کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جنگ، جس کا انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا ہے، ایک آخری تباہ کن حادثہ ہے تو اس کا فائدہ کس کو پہنچے گا! نصف درجن اشخاص اگر برف کے تودے کی لپیٹ میں آ جائیں، تو ان میں کسی کو یہ فکر کیوں ہو کہ پہلے کون تہ تک پہنچتا ہے۔ جنگ ایک دفعہ چھڑ گئی تو گویا ہم سب نے (جنگ سے) شکست کھائی

ہر ڈکٹیٹر یہ اصول حرز جاں بنا لے، تو یورپ کو شاید کچھ دنوں کے لئے امن نصیب ہو جائے۔

"ایک اچھے انسان کی زندگی کا بہترین حصہ وہ ہے جسے وہ بغیر نام و نمود کی خواہش کے، دوسروں پر شفقت اور محبت کے برتاؤ میں صرف کر دے اور اپنے احسانات کو بھول جائے"۔

یا پھر یہ کہ "اگر دوسری جنگ پیش آئی تو مجھے شکست ہوگی۔"

کسی نئے خیال کو اخذ کر لینا نسبتاً آسان ہے، مگر پرانے خیال کو نئے معانی پہنانا افسوسناک طور پر دشوار ہے۔ جنگ کا منشاء یہ ہے کہ اس کے ذریعے اپنا کوئی مقصد حاصل کیا جائے، ایسا مقصد جس کا حصول اور کسی طریقے سے ممکن نہ ہو۔ اس کے نئے معنی یہ ہوں گے کہ منتہائے مقصود ہر چیز کی انتہا ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ دیانت داری کے ساتھ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ایسا کہنا شروع کر دیں۔ تاہم اس حقیقت کو قبول کر لینا انہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ کیوں کہ یہ چیز ابھی تک ان کے افکار کا موضوع نہیں بنی۔ جنگ کا خطرہ محض اسی وقت دور ہو سکتا ہے جس وقت یہ حقیقت وجدانی طور پر ان کے لئے جنگ کے بارے میں غور و فکر کرنے کی تمہید بن جائے۔ دنیا کے الٹی کھوپری کے حکام کو یہ امر ذہن نشین کرانے کی ضرورت نہیں کہ جنگ عیسائیت کی تعلیم یا اقتصادیات کے منافی ہے بلکہ محض یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جنگ اب جنگ نہیں رہی۔ یہ خودکشی ہے اور عقل و خرد سے مستقل دشمنی۔

<u>نوآبادیوں کی منطق</u> | جو لوگ وقتی طور پر عقل سے کام لیتے ہیں ان کو بھی اس حقیقت کا مستقلاً احساس نہیں۔ قیام امن کے لئے نوآبادیوں کے مسئلے کو ازسرِ نو سلجھانے کی تجویز پیش کی گئی ہے اس مسئلے پر دوبارہ غور کرنے کے خلاف برطانیہ کی پہلی دلیل، جرمنوں کے عقیدے کے برعکس، یہ ہے کہ نوآبادیاں ہماری متاع نہیں۔ بلکہ بہت بڑی ذمہ داری کا حکم رکھتی ہیں۔ اور اس ذمہ داری کی حفاظت کے لئے ہم آخر دم تک لڑیں گے دوسری دلیل یہ ہے کہ نوآبادیوں کے اصلی باشندوں پر بغیر ان کی مرضی کے حکومت کے ترم کا ہمیں سینکڑوں برس کا تجربہ ہے۔ دوسرے کسی ملک اس کی اجازت نہیں دینا چاہئے —— یہ جانتے ہوئے کہ جرمن کا وجود مالٹا کے لئے خطرناک نہیں ہے —— یہ دلائل گھروں کی چار دیواری کے اندر خواہ کتنے ہی معقول کیوں نہ معلوم ہوں، تو ڈیلوں کے اس پرانے اصول کے اعادے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے کہ "جو کچھ ہمارے پاس ہے اُسے ہم ہاتھ سے نہ دیں گے" اصول کی حیثیت سے یہ

سود کوئی زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ ایک امیر آدمی کو کبھی اس کی ترغیب نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی دولت صرف اپنی ذات پر صرف کرے، بلکہ جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہو اُسے دوسروں پر بھی خرچ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک فارغ البال مملکت سے بھی اس قسم کی توقع بے جا نہ ہوگی اب ایک آزاد خیال کو اس امر کا قائل کرنے کے لیے کہ جرمنی کا مطالبۂ نو آبادیات پورا نہیں کرنا چاہئے، کسی زیادہ شاندار دلیل کی ضرورت ہی۔ اور وہ دلیل جو سب کو قائل کر سکے یہ ہے کہ آنے والی جنگ میں انہی آبادیوں کو ہمارے خلاف لڑایا جائے گا۔

لیکن آیندہ جنگ تو بہرحال تہذیب کا خاتمہ کر کے رہے گی۔ سو اس کی کیا پروا؟ یورپ کے کوڑ مغزوں کے افعال کا تجزیہ کیا جائے یا اقوال کا، ان میں یہ عدم مطابقت ضرور نظر آئے گی ــــ یعنی یہ کہتے وقت کہ آیندہ جنگ سب چیزوں کا خاتمہ کر دے گی۔ اُن کا رویہ ایسا ہوتا ہے۔ گویا آنے والی جنگ محض نمونہ اور آغاز ہوگا اُس جنگ کا، جو آیندہ جنگ کے بعد پیش آئے گی۔ شاید ایسا رویہ اختیار کرنے میں وہ حق بجانب اور اپنے زیادہ یاس انگیز مفروضے میں غلطی پر ہوں۔ لیکن کیا ابھی دنیا کے لئے وقت نہیں آیا ہی کہ وہ حق و باطل میں فیصلے کا معیار معلوم کرے؟ کیا یہ فیصلہ آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیا جائے گا؟

اب اگر آنے والی جنگ سے موجودہ تمدن کی تباہی یقینی ہے تو یورپ کے اندھی سے اندھی کھوپڑی والوں کو بھی چاہئے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس کا کوئی علاج سوچیں۔ لیکن اب تک اُن کی اجتماعی کوشش، جنگ کے قریب ترین خطرے کے خلاف مرکوز رہی ہیں، نہ کہ خود جنگ کے خلاف۔ معاملات یہیں تک ختم نہیں ہوتے۔ تہذیب کے خاتمے کو ملتوی کرنے کے لئے دو متفقہ کوششیں ہو چکی ہیں ــــ

(۱) لڑائی میں سبقت نہ کرنے۔ اور

(۲) زہریلی گیس استعمال نہ کرنے کا معاہدہ۔

اس کے بعد ہی سب حکومتوں نے متفقہ طور پر اسلحہ سازی اور گیس کے نقابوں کی تیاری

شروع کردی اور اپنے اس فعل سے ثابت کر دیا کہ پہلے دونوں معاہدے لغو اور مہمل تھے ، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو کہ ہمارے حکام آنے والی جنگ کو ہولناک نہیں سمجھتے۔ برعکس اس کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے دنوں اس قسم کے متعدد مواقع پیش آ چکے ہیں۔ جب آخری لمحوں کی متفقہ کوشش سے جنگ ٹرک ٹرک گئی ہے اور یہ اس امر کا بین ثبوت ہو کہ ان کے نزدیک آئندہ جنگ ضرور خطرناک ہے ۔ تو پھر اس سوال کا صحیح جواب کیا ہوا ؟

سیاسیات عالیہ کی حیثیت ۔۔

یورپ کی سیاست پر جب عوام نظر ڈالتے ہیں تو بہک جاتے ہیں اور انھیں حیرت ہوتی ہو کہ آیا وہ سچ مچ کی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں یا کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہیں ، سب سے زیادہ بدحواس کر دینے والا خیال جو ان کو آنے والی جنگ کی طرف مائل کرتا ہو یہ ہے کہ ـــ سیاسیات عالیہ میں جو طرز عمل روا رکھا جاتا ہے روزمرہ زندگی کے طرز عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ، کیونکہ یہ اعمال انسانی کے مسلّم اصولوں کو نتیجہ نہیں ہوتا ۔ ہم ہلاکت کے مقابل ہیں اور ہم اپنے کو آگاہ بھی کرتے ہیں کہ یہ ہلاکت ہے ۔ اچھا تو پھر یہ ہلاکت ہو یا نہیں ؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ، اور نہ کوئی اس معاملے کی تحقیق کی ضرورت سمجھتا ہے ۔

سیاسیات عالیہ کے طلسماتی خواب کی دنیا میں کوئی سادہ اور معقول تجویز پیش کرنا غیر معقول معلوم ہوتا ہے ۔ تاہم ہماری یہ تجویز ہے کہ آنے والی جنگ کے بعد یورپ کی حالت کا جائزہ لینے کے لئے ایک بین الاقوامی تحقیقاتی مجلس منعقد کی جائے ۔ اس مجلس کو حاکمانہ اقتدار تو حاصل نہیں ہوگا تاہم اس حد تک ضرور مختار ہوگی جس حد تک انسانی ہمت بنی اور انسانی ذکاوت اسے بنا سکتی ہو کسی مختار مطلق کو اس تحقیقات پر اعتراض نہیں ہو سکتا کہ قومی عزم کو کمزور کرنے کے لئے کسی حریت پسند یا بال شیوک نے یہ شرارت پھیلائی ہے ۔ ہر مختار مطلق کا یہی دعویٰ ہو کہ اس کے آلاتِ حرب مدافعت کے لئے ہیں ۔ جرمنی کو روس کے حملے کا خطرہ لگا رہتا ہے ۔ ایسی حالت میں کیا روس کے لئے یہ مفید نہ ہوگا کہ اسے آنے والے حادثے سے بروقت آگاہ کر دیا جائے جس کی لپیٹ میں وہ

تو ہو بھی آسکتا ہے؟

ہاں اس تحقیقات پر صرف یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس نے موجودہ خواب کا طلسم توڑ کر کسی قدر حقیقت کی جھلک پیدا کر دی ہے ـــــ کہ واقعی کوئی شخص کسی چیز پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش میں تھا ـــ اس سے ایک صداقت ثابت ہو جاتی ۔ اب ہر اجلاس بڑ بغیر کی گفت و شنید ، ہر ہفتہ کی شبینہ تقریروں ، سلاح سازی کے کارخانوں کی ہر فرمائش ، جہازوں یا فوجوں کی ہر نقل و حرکت ، کی تمہید یہ ہونی چاہیے ۔

"ہرگاہ یہ حقیقت بالاتفاق تسلیم کی جاچکی ہے کہ یورپ کی دوسری جنگ تہذیب کے حق میں مہلک ثابت ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کیا اس چیز کا کوئی وزن نہ ہوگا ؟ ایک بار یہ مقدمہ عام طور پر تسلیم کر لیا جائے تو یورپ کے اعلیٰ طبقے کے سیاسیین اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے بعد اسی ایک نتیجے پر پہنچیں گے کہ کوئی دوسری جنگ نہیں ہونی چاہیئے ۔

(ترجمہ از ورلڈ ریویو)

غزل

میں رو رہا ہوں جو دل کو تو بیکسی کے لئے
دگرنہ موت تو دنیا میں ہی سبھی کے لئے

شب فراق کی روزانہ آفتیں توبہ
یہ امتحان تو ہوتا کبھی کبھی کے لئے

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا
مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کیلئے

وسیع بزم جہاں ہے تو ہو مجھے کیا کام
جگہ ملی نہ مری حسرتِ دلی کے لئے

یہ اور دامن قاتل سے چھوٹ جائیگا
لہو میں جوش تو برسوں سے تھا اسی کیلئے

نہ آنکھ بند کروں میں تو کیا کروں یارب
وہ آرہے ہیں تماشائے جاں کنی کیلئے

بلا کے مجھ کو نکالا ہے اپنی محفل سے
وہ نیکیاں نہیں اچھی جو ہوں بدی کیلئے

قفس میں آج تماشائے غم ہے قابلِ دید
تڑپ رہا ہوں میں صیاد کی خوشی کیلئے

تمام ہو گئے ہم اک نگاہِ قاتل سے
رگیں گلے کی تڑپتی رہیں چھری کے لئے

فروغ حُسن بڑھا دل کی بے نوائی سے
فقیر ہو گیا شانِ تونگری کے لئے

قفس میں چپ نہ رہوں تو کیا کروں کہ قید
نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

تمام بزم میں چھایا ہوا ہے سناٹا
چھڑا تھا قصۂ دل ان کی دل لگی کیلئے

شکایتِ چمنِ دہر کیا کروں ثاقب
ہوا خلاف ہے لیکن کسی کسی کے لئے

چین و برما کا سرحدی قضیہ

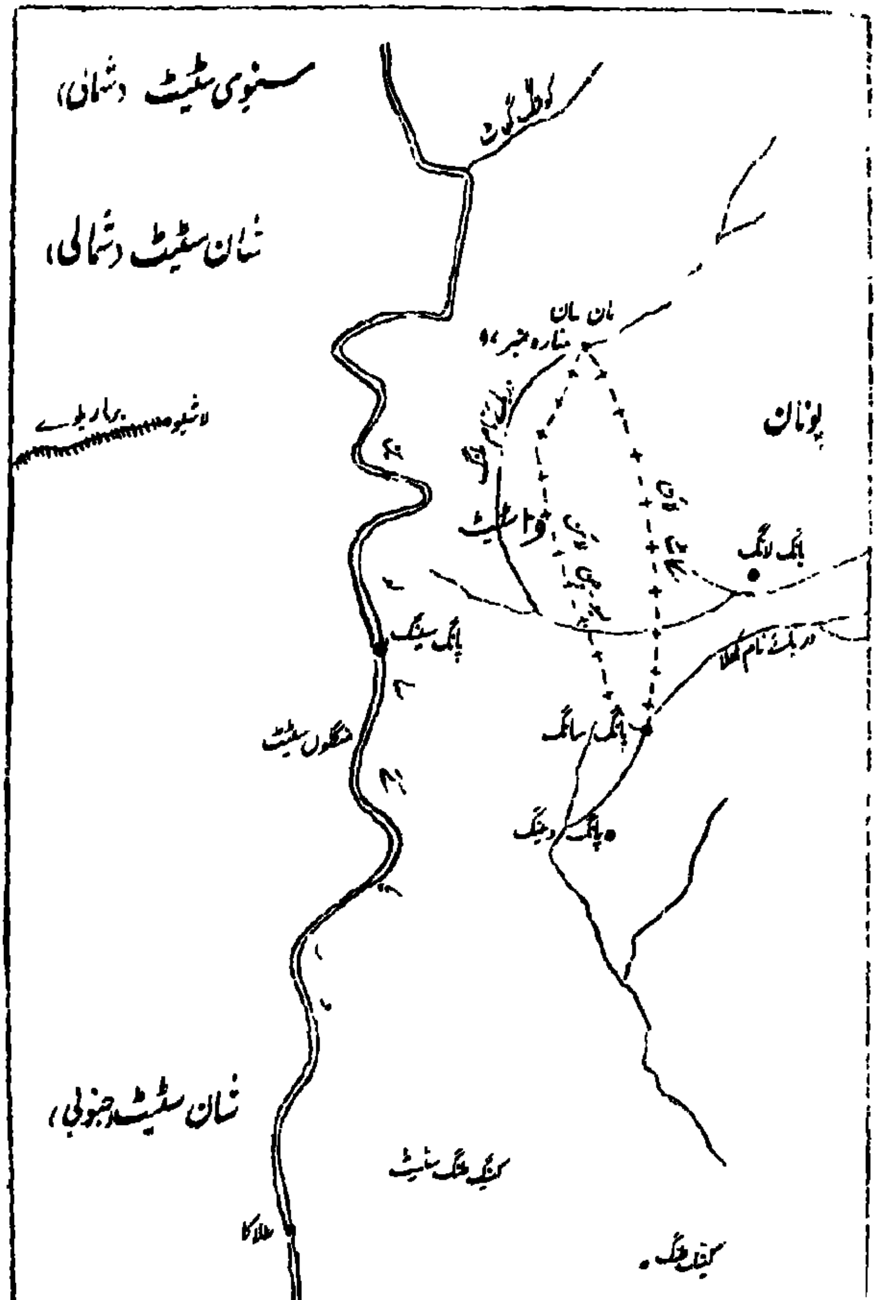
جب ۲؍مئی ۶۲ء کے اخباروں نے یہ خبر شائع کی کہ چینی برمی۔ سرحدی کمیشن کی رپورٹ مکمل ہوگئی تو بہت کم اصحاب کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ قضیہ تقریباً چالیس سال سے چل رہا تھا۔ معاملے کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس مسئلہ پر جغرافی اور تاریخی نقطۂ نظر سے کچھ روشنی ڈالی جائے۔

برما کی شمال مشرقی سرحد پر جنوبی شان، کینگ ٹنگ، منگ لون، وا اور شمالی شان کی ریاستیں ہیں۔ ادھر چین کی طرف چین کا صوبہ یونان اس حد سے ملا ہوا ہے۔ برمی علاقہ زیادہ تر جنگل سے پٹا ہوا ہے۔ لیکن پہاڑوں میں معدنیات کی بیش بہا کانیں بھی ہیں اور انہی کی وجہ سے یہ سرحد کا قضیہ اس قدر اہم ہو چلا تھا۔ اس علاقے کے باشندے بہت مخصوص خصوصیات کے مالک ہیں۔ اس نسبتاً چھوٹے سے رقبے میں لاتعداد قسم کی جداگانہ نسلیں ملتی ہیں۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے مطلق جدا ہے، معاشرت، رسم و رواج، لباس وضع قطع، زبان، غرضکہ ہر چیز ہر قبیلے سے مخصوص ہے۔ اور اس قدر ہیں کہ اس میں غلط فہمی کا امکان ہی نہیں۔ دریائے سالوین کے مغرب کی شان ریاستوں میں تو پھر تہذیب کی جھلک پہنچ چکی ہے۔ لیکن اس دریا کے مشرق میں ابھی کم و بیش پوری تاریکی ہے۔ ریاست "وا" کے باشندے تو ابھی تک انسانوں کا شکار کرتے ہیں۔ اور اپنے گاؤں کی چوپال کو ہر سال کی فتوحات سے سجاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا گاؤں ہو جس کی چوپال میں متعدد انسانی کاسہ ہائے سر دیواروں کی زینت نہ بنے ہوئے ہوں۔ پہلے یہ خیال تھا کہ یہ لوگ مردم خور بھی ہیں۔ لیکن جدید تحقیق سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ لوگ ہر سال مخالفین پر حملہ کرتے ہیں کہ اگر یہ رسم جاری نہ رکھی جائے تو کھیتی باڑی سب تباہ و برباد ہو جائے۔ عموماً یہ حملے چین کے صوبہ یونان پر ہوتے ہیں۔ اور چینیوں ہی کے سر اس تلاش اور کوشش سے

جیسا کہ ہمارے زمانے میں۔

سرحد کے اس پار یونان کا صوبہ ہے۔ یہ چین کے ان چند صوبوں میں سے ایک جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ برما اور چین کے تعلقات کی خبر معلوم کرنے کے لئے ہمیں تقریباً ۱۷۰ سال پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ اس وقت چین میں وہاں کا شیر دل شاہنشاہ کین لنگ حکومت کرتا تھا۔ اور برما میں آوا خاندان کے راجوں کی راج دھانی تھی۔ جب سرحد پر برمی ڈاکوؤں کی دست درازیاں بہت بڑھنے لگیں اور دونوں ملکوں سے شہر بدر کئے ہوئے باغی اس سرحد پر مشکلات پیدا کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوتے دکھائی دیے تو کین لنگ کو سنہ ۱۷۶۹ء میں اُن کی سرکوبی کے لئے ایک فوج روانہ کرنا پڑی۔ شروع جنگ میں برمی فوج کو بڑی زک اُٹھانی پڑی، لیکن کچھ ہی عرصے بعد پانسہ پلٹا۔ اور چینی سپاہ بڑی مشکلات میں پھنس گئی، وہ تو یوں کہیے کہ چینی جرنیل الی کان (علی خان) کی عدیم المثال ڈپلومیسی کام آ گئی۔ اور یقینی شکست فتح سے بدل گئی۔ چنانچہ اس لڑائی کے بعد سے برما چین کی دیگر باجگزار ریاستوں کی طرح ہو گیا۔ اور ہر تیسرے سال برما سے اطاعت و فرماں برداری کے نشان دربار چین میں جانے لگے، بلکہ جب سنہ ۱۸۲۶ء میں انگریزوں نے برما فتح کر لیا اس کے بعد تک بھی یہ نشان جاتے ہی رہے۔

چین کے طائی پنگ کی بغاوت کے زمانے میں صوبۂ یونان کے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ بے حد ستایا گیا۔ اس کی بہت کچھ وجہ یہ تھی کہ بغاوت طائی پنگ کا سرغنہ ایک عیسائی تھا جس نے اس بغاوت کو مذہبی رنگ دے دیا تھا۔ جب ظلم و تعدّی حد سے گذر گیا تو آخر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق سنہ ۱۸۵۶ء میں یونان کے مسلمان لڑائی پر اُتر آئے۔ اُن کے سردار سلطان سلیمان نے بہت چاہا کہ انگریز اس کی مدد کریں۔ اسی خاطر اپنے بیٹے حسن کو انگلستان بھی بھیجا لیکن کچھ سماعت نہ ہوئی اور آخر چینی خونیوں نے مسلمان مظلومین کو پیس ڈالا۔ ۱۵ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء کو سلطان سلیمان شہید ہوئے اور پھر اس صوبے کے تیس ہزار مسلمان عورت مرد اور بچے ذبح کر ڈالے گئے۔ اس بغاوت کے دوران میں برما سے برابر تجارتی تعلقات قائم رہے مسلمان مجاہدین


سنوی سٹیٹ (شمالی)
شان سٹیٹ (شمالی)
لاشیو
برما ریلوے
مان سان
یونان
وا سٹیٹ
بانگ لانگ
پانگ سینگ
منگلون سٹیٹ
پانگ سانگ
شان سٹیٹ (جنوبی)
کینگ ٹنگ سٹیٹ
کینگ ٹنگ

زیادہ تر اپنے مسلح برما سے ہی حاصل کرتے رہے۔ بلکہ اسی سلسلے میں اور اشیا کا تبادلہ بھی ہوتا۔ اس تجارت سے فائدہ اٹھا کر اور کچھ انگلستان اور برما کے ۱۸۶۲ء والے معاہدے سے مضبوط ہو کر ہندوستان کے انگریز تاجروں نے چاہا کہ چین سے براہ خشکی بھی تجارت بڑھائی جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ایک تجارتی وفد براہ خشکی برما سے چین بھیجا جائے۔ یہ وفد کرنیل براون کی سرکردگی میں شروع ۱۸۷۵ء میں بھامو سے روانہ ہوا۔ اس وفد کے ایک ممبر مسٹر آگسٹس مارگرے تھے۔ یہ انگریزی سفارت خانہ مقیم چین کے آدمی تھے، پیکن سے بھامو آئے تھے، اور اب وفد کے ساتھ پیکن جا رہے تھے۔ لیکن واپسی میں لن وین کے مقام پر بعض چینیوں نے دھوکے سے وفد پر حملہ کر دیا۔ اور اس میں مسٹر مارگرے قتل ہو گئے۔ کرنیل براون بمشکل تمام اپنے سکھ سپاہیوں کی جواں مردی کے بدولت بھاگ کر واپس بھامو آئے۔ لیکن اس گناہ کی پاداش میں چین کو چھ لاکھ ڈالر جرمانہ دینے پڑے۔ ینگ سی کیانگ پر کئی بندرگاہوں کو غیر ملکی تجارت کے لئے کھولنا پڑا۔ انگلستان کے دربار میں چینی سفارت خانہ قائم کرنا پڑا۔ ایک وفد بھیج کر انگلستان میں معافی مانگنی پڑی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ سلطنت چین پر ہر جگہ غیر ملکیوں کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری لینی پڑی۔

۱۸۸۵ء میں انگریزوں نے برما فتح کر لیا۔ اس وقت چین سے سرحد کے معاملے پر الجھنا مناسب نہ خیال کیا گیا۔ اس لئے یہ فیصلہ فوراً ہی نہ اٹھا۔ آٹھ سال بعد چین اور ہندوستان کی حکومتوں میں سرحدی مسئلے کا ایک عارضی فیصلہ ہو گیا کہ جس کی رو سے سرحد خیالی طور پر معین کر لی گئی۔ اسی خیالی سرحد کو زمین پر قائم کرنے کے خیال سے ۱۸۹۷ء میں ہر دو حکومتوں کے نمائندوں کا ایک کمیشن مقرر ہوا۔ انگریزوں کی طرف سے سر جارج سکاٹ اور چینیوں کی طرف جنرل لیو اور مسٹر جن اس کے ممبر تھے۔ ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کے موسم سرما میں اس کمیشن نے سرحد قائم کرنے اور سرحدی منارے لگانے کا کام کیا۔ یہ کام شمال اور جنوب دونوں جانب سے شروع کیا گیا تھا۔ مشترک سرحد کی کل لمبائی تقریباً بارہ سو میل ہے۔ سارا کام تو بخیر و خوبی ہوتا چلا آیا۔ لیکن جب ریاست وا کے قریب پہنچے اور جب کہ شمالی اور جنوبی سروے پارٹیوں کے ملنے میں کل دو سو میل

...تھیں تو دونوں حکومتوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں بے انتہا زرخیز معدنیات
...کانوں کے وجود کا یقین تھا۔ مغرب میں اس مقام کے مقابل شان سٹیٹ میں باڈوِن اور نام طو
...مقامات پر دنیا کی سب سے بڑی چاندی کی کانیں معلوم ہو چکی تھیں۔ اور خیال تھا کہ اس مشرقی حصے میں
...زرخیز علاقے ، سونے اور ٹین کی کانیں ہیں۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر ہر دو حکومتوں کی یہ کوشش ہوئی
...ی حصہ ملک میری ملکیت میں آجائے۔ سر جارج سکاٹ اپنی سرحدی لائن خوب مشرق کی
...گھسا کر نکالنا چاہتے تھے اور جنرل لیو اس خیال میں تھے کہ جتنا ہو سکے مغرب میں سے حصہ توڑ لیں
...کافی رد و قدح کے بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا تو اس حصے کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد کے نقشے اس علاقے
...سکاٹ لائن" اور "لیوچن لائن" دونوں لائنیں دکھاتے رہے۔ لیکن عملاً اس حصہ زمین کو جو ان
...لائنوں کے درمیان میں تھا دونوں حکومتیں غیر جانب دار (NO MAN'S LAND) سمجھتی
...نقشہ متعلقہ میں یہ حصہ صاف عیاں ہے۔ شمال میں دریائے نام طنگ پر منارہ نمبر ۹ تک
...جنوب میں دریائے نام کھا۔ پر پانگ سانگ کے مقام تک متفقہ سرحد ۱۸۹۹ء ہی میں مکمل ہو گئی
...لیکن ان دونوں مقاموں کا درمیانی رقبہ ۱۸۹۹ء سے اور اب تک یوں ہی پڑا رہا۔

۳۵-۱۹۳۴ء کے سیزن میں برما کارپوریشن لمیٹڈ نے جو باڈوِن اور نام طو کانوں کی بھی مالک ہے
...سروے پارٹی متنازع فیہ سرحد پر بھیجی تاکہ کانیں دریافت کرے اور اگر مناسب منافع کی
...ہو تو وہاں بھی کام شروع کر دیا جائے۔ یہ چیز چینیوں کے بہت خلاف مزاج تھی۔ اور کہا جاتا
...اس طرف کے لوگوں نے اس پارٹی کو زبردستی روکا اور واپسی پر مجبور کر دیا۔ اب حالات ایسے ہونے
...یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس سرحد کا فیصلہ مستقل طور پر ہو جائے۔ چنانچہ دونوں حکومتوں نے
...لیگ آف نیشنز سے درخواست کی اور لیگ نے ایک کمیشن مقرر کر دیا جس کا صدر (کرنل اِسلن،
...سوئزرلینڈ) ایک غیر جانب دار حکومت کا فرد تھا۔ اس کمیشن کے ممبر حسب ذیل تھے۔

...ستان :-

(۱) مسٹر ایف ۔ ایس گروس ۔ برما فرنٹیئر سروس۔

(۲) مسٹر جے ملیگ - آئی سی ایس - (صرف پہلے سال کام کیا پھر بیمار ہو گئے)
مسٹر سنارک ٹولر - جائنٹ کونسلر سروس (مسٹر کلیگ کی جگہ دوسرے سال کام کیا)

چین :-

(۱) مسٹر لیانگ لیکاؤ - (کونسلر وزیر ریلوے)
(۲) مسٹر ٹونگ لنگ ٹے (مشیر وزارت خارجہ)

یہ کمیشن ۱۹۳۵ء میں برما پہنچ گیا۔ اور یکم دسمبر ۱۹۳۵ء کو مینارہ نمبر ۱۵ کے قریب سے کام شروع کر دیا گیا۔ طریقہ کار کے متعلق یہ طے کیا گیا کہ چینی دریائے نام ٹوسے مشرق کی طرف نونگ کہا تک سروے کریں اور وہاں سے مغرب کی طرف کے حصے کا نقشہ انگریزی پارٹی بنائے۔ اگرچہ شروع ہی میں ممبروں میں اس بات پر اختلاف ہو گیا تھا کہ کام کس جگہ سے شروع کیا جائے لیکن خوش قسمتی سے یہ مشکل جلدی سر ہو گئی۔ پھر گھوڑا سواری میں کرنیل ائسلن کے چوٹ آنے کی وجہ سے کام میں تاخیر ہوئی۔ لیکن شروع فروری ۱۹۳۶ء سے کام پوری تیزی سے شروع ہو گیا۔ شروع برسات میں یہ کام روک دینا پڑا۔ اور پھر ۱۹۳۶ء کے شروع میں سیزن ہی سے سروے شروع کر دیا گیا۔

خود اس علاقے کی حالت اور پھر اس پر دونوں حکومتوں میں پہلے ہی اس معاملے پر اختلافات، یہ ایسی چیزیں تھیں کہ کسی بھی سروے پارٹی کا وہاں جانا خالی از خطرہ نہ تھا۔ اسی لئے برٹش گورنمنٹ کی طرف سے برما ملٹری پولیس، پارک شائر لائٹ انفنٹری مع مشین گن، بچہ برما رائفل۔ دسویں ماؤنٹین بیٹری، رائل آرمی سروس کور اور مدراسی سفر مینا کی فوجیں کمیشن کی حفاظت کے لئے ساتھ تھیں۔ چینیوں نے بھی حفاظت کا پورا انتظام کیا۔ لیکن یہ بڑی خوش قسمتی رہی کہ اس ساری مدت میں آپس کے تعلقات بہت خوش گوار رہے۔

سرحدی کمیشن کا کام عموماً ایسے حصہ ملک میں ہوتا ہے جہاں سے عوام تو عوام خواص بھی کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی تحقیق و تدقیق کے جو مواقع اس قسم کے کام کے

ساتھ ممکن ہیں۔ وہ یوں بآسانی حاصل نہیں ہوتے۔ دونوں حکومتوں نے اس چیز کو خوب سمجھ لیا تھا اور اپنی اپنی پارٹی کے ساتھ ماہرینِ سائنس کی جماعت بھی لے لی تھی۔ بدقسمتی سے انگریزی ماہرین کی تحقیقات کی تفصیلات منظرِ عام پر ابھی نہیں آئی ہیں اس لئے ان کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن چین کی "اکاڈیمیا سینی کا" نے جو ماہرین کی جماعت اس مہم پر روانہ کی تھی۔ اس کی محنت کے نتائج کافی معلوم ہو چکے ہیں۔ مثلاً اب یہ بات یقین کے درجے تک پہنچ گئی ہے کہ چین میں یونان کا صوبہ معدنی دولت کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ مالدار صوبہ ہے۔ کوجی کے قریب ٹین کی کان سے ۰ کروڑ روپیہ سالانہ آمد کا اندازہ ہے۔ اسی طرح پانگ ہنگ کے قریب چاندی کی افراط ہے اور ٹین کا تو حق پر ہونے کی۔ تانبا بھی بافراط مل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ علم نباتات، علم الانسان اور علم الِلسان میں بھی کئی ایک معرکۃ الآرا تحقیقات کی گئی ہیں۔

بالآخر مارچ سنہ ۳۶ء کے آخر ہفتے میں کمیشن نے اپنے سروے کا کام مکمل کر لیا اور پانگ سانگ کے مقام پر جمع ہو کر رپورٹ کی تیاری شروع کی۔ یہ رپورٹ ایک مہینے کے قریب میں پوری ہو گئی اور ۱۲ اپریل سنہ ۳۷ء کو فریقین نے اس پر دستخط کر دئے۔ اس کی رو سے متنازع فیہ رقبہ کا ½ حصہ چین کو ملا ہے اور بقایا برما کو۔ کمیشن کے قیام کے دوران ہی میں برما کے نظام میں ایک بڑی تبدیلی ہو گئی۔ یعنی یکم اپریل سنہ ۳۷ء سے وہ ہندوستان سے الگ ہو گیا۔ اس سے قبل کمیشن کی رپورٹ کی ہندوستان کی حکومت تصدیق کرتی، لیکن نئے دستور کے بعد تو اب شاید حکومت ہند کو اس قضیے سے کوئی مطلب نہ رہے۔ اور اب اس کی تصدیق غالباً چین اور برما کی حکومتیں ہی کریں۔

غزل

رہیں خود فراموشی گلوں کو یاد کیا کرتے
اب اس سے بڑھ کے پاسِ خانۂ صیاد کیا کرتے

تصورِ عیش کا کرتے ہیں تو غم اور بڑھتا ہے
جو یاد آنے سے بھولا ہو اسے ہم یاد کیا کرتے

لہو دل ہو گیا اپنے ہی نالوں سے شبِ غم میں
کوئی بتلائے اب فریاد کی فریاد کیا کرتے

ہمیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیں یہ زندگی والے
نہ ہوتے ہم جہاں میں تو ستم ایجاد کیا کرتے

اسیری راستہ دیتی نہیں دل کو تصور کا
قفس والے خیالِ خاطرِ آزاد کیا کرتے

زمانہ ہو نہ جاتا دستِ کش آخر تو کیا کرتا
جو زیرِ خاک ہیں ظالم انھیں برباد کیا کرتے

ہماری طرح مہماں چند دن کا تھا نشیمن بھی
جسے ویران ہونا تھا اُسے آباد کیا کرتے

ترس کو بھی جگہ دیتی نہیں غم دوستی میری
جو ناشادی پہ مرتا ہو اسے وہ شاد کیا کرتے

خوش و ناخوش بسر کی عمر طوفانِ حوادث میں
مخالف تھی ہوائے عالمِ ایجاد کیا کرتے

رسائی کب تھی ان کی بزم میں اچھا جو ہوتی بھی
تو ہم کیا اُن سے کہتے اور وہ ارشاد کیا کرتے

نیاز و ناز تھے دونوں ہی سرِ حدِ ترقی پر
ہم اُن کو بھولتے کیونکر وہ ہم کو یاد کیا کرتے

ستم احباب کے آئینۂ اخلاص تھے ثاقب
مقامِ شکر تھا ہم شکوۂ بیداد کیا کرتے

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

برطانوی وزارت کی تبدیلی | تاج پوشی کے مراسم بخیر و خوبی ختم ہوئے اور مسٹر بالڈون (انھیں ارل ہو جانے کے باوجود کچھ تو عادت کی وجہ اور کچھ ان کے مشہور پائپ کی رعایت سے مسٹر ہی لکھنے کو جی چاہتا ہے) وزارت عظمیٰ سے علیحدہ ہو گئے۔ بڑی حکومتوں کے کاروبار اور بالخصوص برطانیہ کا کاروبار ایسا جما ہوا ہے کہ اس میں اشخاص کی تبدیلی سے کچھ بہت فرق تو ہوتا نہیں۔ مگر پھر بھی وزیر اعظم کی شخصیت کا کچھ اثر ضرور ہوتا ہے اور ہر حکومت وقت کا بنیادی خاکہ نہ سہی اس کا رنگ و روپ کچھ کبھی اس شخصیت سے متعین ہوتا ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالڈون کے جانے سے رنگ کا کوئی فرق پیدا ہوگا یا نہیں؟ اگر قریب کی تاریخ پر نظر کیجئے یعنی میکڈانلڈ کے بعد بالڈون کی وزارت کو دیکھئے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید ذرا بھی فرق نہ ہو۔ اس لئے کہ میکڈانلڈ اور بالڈون کی وزارتوں میں فرق کرنا بھی ذرا دشوار ہے۔ مگر شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی چار سال پہلے سے میکڈانلڈ کے پس پشت بالڈون ہی کی ذات کارفرما تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ مزاج کے اعتبار سے یہ دونوں ہم بہت مشابہ تھے۔ دونوں کو کلیسا میں واعظ ہونا چاہئے تھا قسمت نے وزارت عظمیٰ کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ دونوں اہل تحمل، بردباری کے پتلے، آنچ نہ ایک میں نہ دوسرے میں۔ ہر کام میں ڈھیل دونوں کی مشترک صفت۔ میکڈانلڈ کی طرح بالڈون کی ساری قوت بھی ان کی وعظ بازی میں تھی۔ یہ یوں تو ایک سیدھے سادے انگریز کاروباری آدمی کے روپ میں سامنے آتے تھے۔ مگر باوجود ان کے پائپ اور باوجود ان کی دولت کے ان کی اصل قوت ان کی موثر قوت تقریر تھی۔ اگر ان کی تقریروں کے مجموعے کو کسی دوسرے وزیر اعظم کے ادبی کارنامے کے مقابلے میں رکھا جائے تو یہ کسی سے پیچھے

نہیں گے انھیں جذبات کے بروقت ابھارنے کی اٹکل بھی تھی۔ وار العوام میں اُن کو بڑی کامیابیاں ہمیشہ کسی خاص جذبۂ قومی کو ابھار کر ہی حاصل ہوئی ہیں۔ ہاں اخلاقی قیادت کی وہ قوت جو عمل کی نئی راہیں بھی ڈھونڈ نکالے ان کو ارزانی نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ ہوتی بھی کتنوں میں ہے؟ لیکن یہ اپنے نعروں کے حسن انتخاب اور جذبات کی خوبی سے اپنے ہم قوموں کے تحت شعور کو ضرور ابھار سکتے تھے۔ عمر بھر سیدان میں ان کی بڑی خوبی بس موقع شناسی تھی، اور فی الجملہ ان کی شخصیت ایک منفی شخصیت ہے۔ شاذونادر ہی ایسا ہوا ہوگا کہ انھوں نے خود اپنی طرف سے کسی کام کو شروع کیا ہو بلکہ اکھاڑے میں یہ غالباً اپنے فن و تدبیر کی رعایت سے ان پہلوانوں میں تھے جو زمین پکڑ لیتے ہیں مد مقابل کی ذرا آنکھ جھپکی اور اسے چت کر دیا۔ شاید ان کی سیرت کی یہ صفت اس وجہ سے تھی کہ انھیں اپنے باپ کا نہایت عظیم الشان کاروبار بنا بنایا ملا تھا۔ اس لیے بنانے کی جگہ چیزوں کو سنبھالے رکھنا ہی انھوں نے سیکھا تھا۔ تدبیر کم تھی احتیاط زیادہ۔ لکیر کے فقیر تھے، اور اپنی پگ ڈنڈی سے ہٹ کر دوسرے کی شاہراہ پر چلنا پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کا مسلک یہ معلوم ہوتا تھا کہ کم کام چھیڑو کہ غلطیوں کا امکان اس میں ہی کم ہے۔ احتیاط بڑی چیز ہے، دم سادہ لو تو ستر بلائیں آپ رد ہو جاتی ہیں، یہ ان لوگوں میں تھے جو اپنے لئے موقع نکال لیتے ہیں۔ ہاں موقع آجاتا ہے تو اسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

یہ صفات اعتدال کے ساتھ ہوں تو بڑی خوبیاں ہیں، زیادہ ہو جائیں تو عیب بن جاتی ہیں۔ اتفاق یہ کہ بالڈون کی وزارت میں چار باا ثر رکن کم و بیش اسی کینڈے کے تھے، یعنی میکڈانلڈ، رنسی من، سر جان سائمن، اور یہ خود۔ چنانچہ جہاں کوئی تجویز آئی جس میں ذرا بھی خرچ ہوتا یا کوئی اندیشہ تو پہلا جواب بس یہی ہوتا کہ نہیں۔ مشورہ ہمیشہ یہی کہ ذرا ٹھہرو۔ تیل دیکھو۔ تیل کی دھار دیکھو۔ برطانیہ کے مخصوص علاقوں کی بدحالی جس پر منجملہ اور باتوں کے سابق شاہ ایڈورڈ سے اختلاف ہوا پھر برطانوی سیاست خارجہ کے ڈانواڈول میں اسی صفت کا پرتو ملتا ہے۔

مسٹر چیمبرلین جو اُن کے جانشین ہوئے ہیں ذرا مختلف آدمی ہیں۔ یہ بھی کاروباری ہیں۔ اس لئے احتیاط کی ان میں بھی کچھ ایسی کمی نہ ہوگی۔ مگر فرق یہ ہے کہ ان کا کاروبار اُن کے

... خود انھوں نے جانا اور بڑھایا ہے۔ یہ کام کو سمجھیں تو اس میں پہل بھی کرسکتے ہیں۔ سیاست ... کی تعمیری منصوبوں کی طرف ان کا رجحان ہے۔ انگلستان کی بلدی حکومت والے قانون میں ... نے اپنی تعمیری صلاحیتوں کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے۔ پھر پچھلے دنوں جب اُن کا کام بس خزانہ ... بنا رہنا تھا کہ کہیں کوئی زیادہ روپیہ نہ اُٹھ جائے، اس زمانے میں بھی جسمانی تندرستی ... بنانے کی دور رس تجویز انھیں نے بنائی۔ سیاست خارجہ سے اُن کا کچھ بہت واسطہ نہیں رہا ... آج کل کی سیاست تو معیشت اور مالیات کی لونڈی ہے۔ اور یہ ان دونوں سے خوب آشنا ... شاید یہ پیش گوئی غلط نہ ہو کہ ان کی قیادت میں سیاست میں صرف احتیاط کی منفی ذہنیت ... دبے کارفرما رہے گی جتنی بالڈون کے عہد وزارت میں رہی۔

جاپان | جاپانی سیاست نے پچھلے چند ہفتوں میں خوب رنگ بدلا ہے۔ فوجی اقتدار پسندوں کی ... اب معلوم ہوتا ہے کہ کاروباری سمجھ دار لوگوں نے لے لی ہے۔ اور اب تک جو کام میدان جنگ میں فوجی قوت کے زور پر ہو رہا تھا۔ اب کچھ دن مقفل خانوں کے آراستہ کمروں میں تجارت اور سیاست کے شاطروں کی بین الاقوامی بات چیت سے ہوا کرے گا۔

ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۳۱ء سے جاپان کی سیاست میں فوجی جماعت کا غلبہ تھا۔ ... شیریں کلامی کے حجابوں کو چاک کرکے کھلے بندوں توسیع مملکت کا کام انجام پا رہا تھا۔ فوج ... کے سامنے اہل سیاست بے بس سے تھے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ پھر ان کا زمانہ آیا ہے ... یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ جاپان کی سیاست خارجہ کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ... تھوڑے عرصے بعد یونہی فوجی اقتدار پسندوں کا غلبہ ہوتا ہے، پھر جب قوت کا استعمال جی بھر کر ... ہے۔ اور اس کے نتائج پر تقلیل حاصل کا قانون اپنا عمل شروع کر دیتا ہے تو پھر اہل سیاست ... آتے ہیں، پچھلی زیادتیوں کی تھوڑی بہت تلافی کرتے ہیں اور اگلے فوجی پروگرام کے لئے بے جانے ... بوجھ کر میدان تیار کر جاتے ہیں۔ نرم اور گرم کا الٹ پھیر نہ جانے دنایان جاپان کی ملی کشتی

منفی ہے یا ایک جو صلہ مند اور اپنے مستقبل سے آشنا قوم کی جبلی افتاد۔

پچھلے دنوں بھی جاپانی سیاست میں اس قسم کی تبدیلی ہوئی ہے جنرل ہیاشی کی حکومت جو فوجی اقتدار کی نمائندہ تھی۔ ایک عرصے سے تجارتی اور سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں تنگ تھی، یہ لوگ حکومت کے ہر پروگرام میں پارلیمنٹ کے جمہوری ہتھکنڈوں سے طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ چنانچہ بلا خاص وجہ کے، عین اس وقت کہ سیاسی جماعتیں عام انتخاب کی ذرا بھی توقع نہ کرتی تھیں۔ جنرل ہیاشی نے "تنبیہاً" عام انتخاب کا اعلان کر دیا۔ غرض اس کی یہ تھی کہ بے خبری میں ان سیاسی جماعتوں کی قوت کو ختم کر دیں۔ لیکن قوم نے جو وقت کی سیاسی ضرورتوں سے واقف تھی فیصلہ جنرل ہیاشی کے خلاف صادر کیا۔ نئی پارلیمنٹ کے ۴۶۶ ممبروں میں کل ۴۰ ہیاشی کے ساتھی منتخب ہوئے! زرعی قدامت پسند جماعت "سائی یوکائی" اور صنعت والوں کی لبرل جماعت "من سائی ٹو" نے ان کے خلاف باہم سمجھوتہ کر لیا ہے اور ان دونوں کے کل ۳۵۴ ممبر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک نئی جماعت ہے جو ابھی ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی تھی، "شکائی تائی شوتو" جو ایک طرح کی اشتراکی جماعت ہے، زراعت کے لئے سرکاری امداد کی حامی اور بڑی صنعتوں کو قومی ملک بنانے کی قائل، اس کے نمائندوں کی تعداد بھی پہلے سے دگنی ہو گئی ہے۔ پہلے ان کے ۱۸ ممبر تھے۔ اب ۳۶ منتخب ہوئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر کو ہے۔

جنرل ہیاشی نے قوم کے اس فیصلے کو ماننے میں بھی تامل کیا اور قومی مفاد کی خاطر باوجود اس شکست کے وزارت سے مستعفی ہونے سے انکار کیا اور پارلیمنٹ کے دستور میں تبدیلی کے منصوبے جانے۔ مگر قومی رائے بہرحال کچھ قوت رکھتی ہے، کچھ دن کے لیت و لعل کے بعد جنرل ہیاشی کو ہٹنا پڑا اور اہل سیاست نے اپنی وزارت مرتب کر لی۔

لیکن قوم نے فوج والوں کے خلاف کیوں رائے دی؟ کیا قوم کو ملک گیری ناپسند ہے؟ کیا اسے نئی منڈیاں درکار نہیں؟ کیا وہ خام جنسوں کے حاصل کرنے کے لئے نئے نئے میدان نہیں چاہتی؟ وہ بھی یہ سب کچھ چاہتی ہے۔ ورنہ فوج والے یہ سب کچھ کر ہی کیسے سکتے۔ مگر صحیح

سے ان سیاسی بھی رکھتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ دنیا کو چھیڑنا ضرور چاہیے لیکن نہ اس قدر کہ کھسیانی ہو جائے یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ چین کے معاملے میں جاپان کے خلاف انگلستان اور امریکہ میں اتحاد عمل کی صورت نہ نکل آئے۔ پھر یہ ڈر ہے کہ خود چین میں جاپان کی مخالفت پہلے سے شدید اور منظم صورت اختیار نہ کرے۔ یہاں تنگ آکر جنگ آنے کا خطرہ ہے! یہ ڈر بھی ہے کہ چین کی قومی حکومت اور وہاں کے بالشویک گروہ میں جاپان کی پیہم زیادتیوں کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ جس سے جاپانی اغراض کو سخت نقصان پہنچے گا۔ کہ وہاں پھوٹ ڈال کر ہی حکومت کرنے کا امکان ہے۔ پھر یہ سخت خطرہ ہے کہ اگر چینی بالشویکوں کا اثر بڑھا تو چین روس کا ساتھی ہو جائے گا۔ ان سیاسی خطروں کے علاوہ ایک فوری معاشی دشواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسوں کی قیمتوں میں پچھلے دنوں جو اضافہ ہوا ہے اس نے جاپانی مال کی بکری میں رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ جاپان کو دوسرے ملکوں کے مقابلے میں یہ آسانی ہے کہ وہاں مزدوری کی شرح بہت کم ہے۔ مال میں مزدوری کا اعتباری حصہ جتنا زیادہ ہوگا۔ جاپانی مال کو دوسروں کے مال سے مقابلے میں آسانیاں ہیں۔ اب کچے مال کی قیمت بڑھنے سے مزدوری کی اعتباری اہمیت مال کی قیمت میں کم ہو جائے گی۔ اور دوسروں سے مقابلے میں دشواری ہوگی۔

غرض قوم نے جو فوجی اقتدار پسندوں کا ساتھ نہ دیا تو اس کے معقول اسباب تھے۔ چنانچہ عام انتخاب کے زمانے ہی میں یہ افواہیں گشت لگا رہی تھیں کہ برطانیہ سے سمجھوتے کی گفتگو ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے۔ انگریزی اخباروں میں اس خبر کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے اور سنا گیا ہے کہ سر سیمول ہور نے اس سمجھوتے کا ایک خاکہ بھی تیار کیا ہے۔ سمجھوتہ غالباً یہ ہوگا کہ شمالی چین میں جاپان کی موجودہ حیثیت کو کہ قومی جماعت کی رہین منت ہے تسلیم کر لیا جائے پھر آگے برطانیہ امریکہ، فرانس اور جاپان مل کر چین کو قرض دیں۔ اس کی ترقی اور خود مختاری کے ضامن بنیں۔ یعنی تنہا خوری چھوڑ کر جاپان مل بانٹ کر کھانے کو آمادہ ہو جائے گا اور کھلے سیاسی سامراج کی جگہ پوشیدہ معاشی سامراج کا کچھ دنوں دور دورہ رہے گا۔ پھر جب کوئی مناسب موقع آئے

گا تو فوجی جماعتیں پھر برسرکار آجائیں گی اور اپنا کام کریں گی۔

برطانیہ اور دوسری دول مغربیہ کے لئے یہ مہلت بھی غنیمت ہے۔ اس لئے کہ جاپان سے آسانی سے کوئی بھی بگاڑ کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بھی سوچتے ہیں کہ ابھی کچھ دنوں چین میں اپنا فاضل سرمایہ لگانے کا موقع ملے گا۔ پرانے سرمائے کی واپسی کی بھی کچھ تدبیر نکل سکے گی، جاپان سے لڑائی کا خطرہ کم ہو جائے گا اور کیا معلوم پھر کیا پردہ غیب سے ظاہر ہو! جاپان نے اس سمجھوتے میں اپنی طرف سے رعایتوں کا انتظام بھی پہلے سے کر لیا ہے۔ بحری معاہدے کے ختم ہو جانے کے بعد اسے ابھی کچھ عرصہ ہوا اپنے جہازوں کی توپوں کو ۱۴ انچ کے اندر رکھنے سے انکار کر دیا ہے اب اس سلسلے میں اس پابندی کو مان لے گا۔ ادھر جرمنی سے ایک معاہدہ کر چکا ہے، اب نئے دوستوں کی خاطر اس کے راز والے دفعات کو کام میں نہ لانے کا وعدہ کرے گا۔ اور یوں طرفین خوش خوش معاہدہ کر لیں گے۔ اور یہی مقصود ہے۔

سیاسی ملاقاتیں اور وسطی یورپ کی تنظیم | پچھلے دنوں یورپ کے اکثر ممتاز اہل سیاست برابر ادھر سے ادھر سفر اور باہمی ملاقاتوں، پر اسرار گفتگوؤں، اور ان سے زیادہ پر اسرار اعلانات کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ جنرل گوئرنگ جو اپنے تن و توش کے باعث کچھ بہت سہولت سے انتقال پذیر نہیں اس ایک سال میں دو مرتبہ روما تشریف لے گئے اور وہاں مسولینی اور کاؤنٹ چیانو سے ملے۔ روما سے برلن لوٹے تو راستے میں یوگوسلاویا ہوتے ہوئے اور وہاں کے ایجنٹ شہزادہ پال سے ملتے ہوئے لوٹے۔ یہ واپس ہوئے ہی تھے کہ جرمن وزیر خارجہ بیرن فان نوراتے راٹ روما پہنچے۔ اور اب انھوں نے بلقان کے تمام صدر مقاموں کی خاک چھان ماری۔ اپنے جرمن مہمانوں کی پذیرائی سے فرصت پاتے ہی اٹلی کے وزیر خارجہ کاؤنٹ چیانو البانیہ پہنچے۔ البانیہ اور یوگوسلاویا میں سمجھوتہ ہوا تو البانیہ گھبرایا ہوگا۔ چنانچہ انھیں اطمینان دلانا تھا کہ تم اس سے گھبراؤ مت، ہم تمھاری آزادی اور خود مختاری کے اسی طرح محافظ ہیں جیسے اب تک تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام نہاد آزاد ملک بھی اور بہتوں کی

طرح آزادی کا احساس معدہ اور جیب کی وساطت سے کرتا ہے۔ اس نے کہا آپ کا ارشاد تسلیم، مگر کچھ روپیہ چاہیے۔ کہا گیا حاضر ہے۔ چنانچہ ۱۰ ملین طلائی فرانک کا قرضہ اٹلی نے البانیہ کے لئے منظور کر دیا۔

ادھر پولینڈ کے مشہور وزیر کرنل بک رومانیا تشریف لے گئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں سے کچھ زیادہ خوش نہیں لوٹے! اور افواہیں ہیں کہ انھوں نے رومانیا کو فرانس اور چکوسلوویکیا سے علیحدہ کر کے، اپنے ساتھ ملانے کی طرح ڈالنی چاہی تھی۔ مگر اس میں کچھ بہت کامیابی نہ ہوئی۔

آسٹریا کے چانسلر ڈاکٹر شوشنگ ابھی وینس سے لوٹے ہی تھے کہ آسٹریا کے صدر مکلاس کے ساتھ ہنگری پہنچے۔ دعوتیں ہوئیں، اور تقریریں۔ ہنگری کے صدر جنرل ہورتی نے اٹلی اور ہنگری کی دوستی کی اہمیت کا ذکر کیا تو جواب میں صدر مکلاس نے یہ امید ظاہر کی کہ دریائے ڈینیوب کے حلی ممالک میں تعاون اور یک جہتی کی کوئی صورت نکل آئے۔

اس ساری دوڑ دھوپ کا مقصد کیا ہے؟ غیب کا علم کسے ہے، پر معلوم یہی ہوتا ہے، کہ جرمنی اور اٹلی مل کر صلح نامہ ورسائی کے نظام کو ختم کر رہے ہیں۔ جمعیتہ اقوام کا نام نہاد عالمی نظام ختم ہو رہا ہے! باہمی معاہدوں سے دنیا پھر مقابل جتھوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ جرمنی کا یہ منصوبہ کہ وہ وسطی یورپ کا سردار بنے اور اٹلی کا یہ حوصلہ کہ وہ بحر روم میں غالب قوت اور بلقان میں سرپنچ ہو جائے دونوں کم سے کم عارضی طور پر مل گئے ہیں! جرمنی اور اٹلی نے فی الحال آسٹریا کے متعلق ایک سیاست اختیار کر لی ہے۔ اور دونوں مل کر (LITTLE ENTENTE) یعنی چکوسلوویکیا، یوگوسلاویا اور رومانیا کے جتھے میں پھوٹ ڈالنے کے درپے ہیں۔ یوگوسلاویا کو اٹلی نے ملا لیا ہے۔ تو جرمنی بھی خوش ہے کہ چکوسلاویکیا کو جب چاہوں گا دبا لوں گا اور پولینڈ بھی کہ یہ بھی چکوسلاویکیا سے کچھ بہت خوش نہیں۔ اسی لئے کرنل بک اس ملک کو رومانیا کی مدد سے بھی محروم کرنے کی فکر میں ہیں۔ پولینڈ فرانس اور چکوسلاویکیا کا اب ایسا ساتھی کہاں رہا جیسا کہ جنگ کے بعد تھا۔ ادھر جرمنی اور اطالوی اثر آسٹریا اور ہنگری کو بھی چکوسلاویکیا سے الگ رکھنے کی کوشش میں ہے۔

وسطی یورپ کی یہ قومیں جو جنگِ عظیم کے بعد سے کچھ فرانس سے اور اس کے بعد انگریزوں کے زیرِ اثر رہی ہیں اگر ان میں سے اکثر کا وجود ہی دولِ فاتح کی کامیابی کا رہینِ منت تھا، اب جرمنی اور اٹلی کے اثر میں کیسے آتی جاتی ہیں؟ ان ملکوں کے تجارتی اعداد و شمار دیکھئے تو اس کا کچھ جواب سمجھ میں آتا ہے۔ ان ملکوں سے جرمنی کا تجارتی تعلق بہت ہی اہم ہے۔ آسٹریا، ہنگری، چکوسلوویکیا اور رومانیا کو جرمنی اور ہر قوم سے زیادہ مال بھیجتا ہے۔ ہنگری کو بس چکوسلوویکیا کے مقابلے میں کچھ کم ورنہ سب سے زیادہ۔ یہ ان ملکوں کے مال کی خریداری میں بھی اوروں سے پیچھے نہیں ہے۔ البتہ یوگوسلاویہ کے لیے جرمنی اتنا اہم نہیں جتنا کہ اٹلی ہے۔ یوگوسلاویا کا ہنگری کے ساتھ تقریباً کوئی تجارتی تعلق نہیں۔ اس کی [illegible] تجارت زیادہ تر آسٹریا اور چکوسلوویکیا سے ہے اور برآمد کا [illegible] اٹلی کو جاتا ہے۔

برخلاف اس کے فرانس اور برطانیہ کی تجارت ان ملکوں سے بہت ہی کم ہے۔ فرانس جو ان ریاستوں کی قیادت کا حوصلہ رکھتا ہے اپنی کل برآمد کا کل ۷ فی صدی ان ملکوں کو بھیجتا اور اپنی کل برآمد کا محض ایک فی صد ان ملکوں سے منگاتا ہے۔ برطانیہ کی کل برآمد کا بس ایک فیصدی ان ملکوں کو جاتا ہے اور درآمد کا بھی بس ایک فیصد ان ملکوں سے آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جرمنی اپنی برآمد کا ۱۲ فیصدی ان ملکوں میں بھیجتا اور اپنی درآمد کا ۵ فیصدی ان سے خریدتا ہے۔

تجارت کے ان گہرے تعلقات کی وجہ سے یہ ملک جرمنی اور اٹلی کی طرف جھک رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ان طاقتور پڑوسیوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے ڈرتے بھی ہیں کہ کہیں ان کے سائے میں ان کی نئی قومیتوں کے کم زور پودے مرجھا کر نہ جائیں اور ان کا سیاسی وجود ہی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ پھر مالی ذمہ داریوں کی وجہ سے انگلستان اور فرانس سے ان بن بھی نہیں کر سکتے اور اس فکر میں بھی ہیں کہ قرض ادا کرنے کے لئے ان ملکوں سے بھی مصنوعات منگائیں اور اپنا زرعی مال اگر یہ لیں تو انھیں بھیجیں۔ مثلاً پولینڈ پر انگلستان کے ۴۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ قرض ہیں ہنگری پر ۲ کروڑ پونڈ سے زیادہ، بلغاریہ پر تقریباً ۵ لاکھ پونڈ۔ اب یہ قومیں قرض نقد کیسے ادا کریں؟ ان کی آبادی مغربی ممالک کی آبادی سے کوئی آدھی ہے لیکن ان کا [illegible] ان کے ذرائع کا کوئی

ہوا حصہ! پھر اس زر رائج کی پشت پناہی کے لئے جو سونا اُن کے پاس محفوظ ہے وہ مغربی ملک کے مقابلے میں بس ایک سترھواں حصہ ہے! یہ قرض ادا کر سکتی ہیں۔ تو یہ لوگ کہ اپنی زرعی پیداوار دوسرے ملکوں کو بھیجیں۔

جرمنی اور اٹلی سے ایک طرف اور فرانس اور برطانیہ سے دوسری طرف بچنے کے لئے ان قوموں نے اس نئے منصوبے کی راہ میں چاہتی ہیں کہ باہم مل کر ایک خود مکتفی علاقہ مرتب کرلیں لیکن ان میں باہمی رقابتیں اور معاشی دشواریاں سد راہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی مجموعی آبادی میں کوئی ۶۰ فی صدی اشخاص کا گذر زراعت پر ہے۔ لیکن چکوسلوویکیا اور آسٹریا میں یہ نسبت کم ہے یہاں بالترتیب صرف ۳۴ اور ۳۰ فیصدی زراعت پیشہ ہیں اور دوسرے ممالک میں ۷۵ سے ۸۰ فی صدی تک ان ملکوں کی صنعت اتنی نہیں کہ باقی ملکوں کی سب ضروریات پیدا کرے ۔۔۔ دوسری [illegible] ان کے یہاں کھپ سکے اور غالباً جرمنی اور اٹلی کی منڈی بھی ان کی تمام زرعی پیداوار کی کھپت کے لئے کافی نہ ہو۔ اس لئے غالباً اُن کو ادھر ملانے اور اُدھر ملانے کی کشاکش ابھی جاری رہے گی۔

اسپین | اس بدنصیب ملک کی خونچکاں داستان ختم ہونے میں ابھی دیر ہے۔ کچھ دن پہلے معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کا پلہ بھاری ہے۔ ان سطروں کے لکھتے وقت بلباؤ کے اہم مرکز پر باغیوں کی یورش ہے اور کیا عجب ہے کہ جب تک یہ تحریر ناظرین تک پہنچے۔ بلباؤ فتح ہو چکا ہو۔ اور اس کے بعد شاید میڈرڈ کی باری آئے۔ فریقین کی اپنی اپنی جماعتوں میں بھی باہمی مناقشوں کی خبریں آ رہی ہیں۔ باغی جنرل فرینکو کی فوجوں میں بہت سے ممتاز لوگوں کو مخالفوں سے ساز باز کے جرم میں سزائے موت دی گئی ہے حکومت میں بھی اہم تبدیلی ہوئی ہے۔ نراجیوں اور اشتراکیوں کا اختلاف برابر ابھرتا رہا ہے اور حکومت کی قوت کو کمزور کرتا رہا ہے۔ حال میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ یہ کہ اسپین کے مشہور وزیر اعظم سینور کبالیرو مستعفی ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ ایک معتدل اشتراکی ڈاکٹر نگرین نے لی ہے۔ ایک تو سن رسیدہ کبالیرو کے اعصاب کے لئے فوجی کمان کا بار تقریباً ناقابل برداشت تھا۔

دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ نزاجیوں کی کوششوں کا یہ رد عمل ہورہا ہے کہ حکومت میں معتدل عناصر قوت پکڑ رہے ہیں۔ اب اکثر زبانوں پر انقلاب سے زیادہ جمہوریت کا نام ہے۔ کیتھولک مذہب والوں کے ساتھ رعایتوں اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت کا ذکر بھی آنے لگا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس میں اعتدال پیدا کرنے میں کمیونسٹ پارٹی کا بڑا دخل ہے کچھ تو اپنی قوم کے مختلف عناصر میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا کرنے کی غرض سے اور کچھ باہر کی جمہوری حکومتوں کی بھڑک اپنی طرف سے ٹالنے کی خاطر۔ مشہور صحیفہ نگار مسٹر بریلسفورڈ (NEW STATESMAN) میں لکھتے ہیں کہ جمہوری اسپین میں اس وقت کمیونسٹ بیچ کی معتدل جماعت ہیں۔ ان کی ساری تبلیغی کوششیں مدافعانہ ہیں۔ وہ صرف فاشستی دراز دستی کے خلاف مدافعت چاہتے ہیں۔ اور مستقبل کی دور از کار منصوبہ سازیوں کے الجھاوے سے بچتے ہیں۔ اس جماعت کے ناظم یوسے دیاز نے ابھی حال میں ایک رسالہ شائع کیا ہے جس میں اپنا مقصد ایک نئے طرز کی جمہوری پارلمانی حکومت کا قیام بتایا ہے۔ اس میں بس بڑے زمینداروں کی مخالفت ہے اور کلیسا کی بڑی املاک کی اور فوج کی ذات پات کی سی تنظیم پر حملے ہیں۔ مگر چھوٹے آدمیوں کی املاک پر کوئی اعتراض نہیں اس لئے کہ اسپین کسانوں کا ملک ہے۔ اراگواں کے علاقے میں عملی اشتراک اور املاک ضبط کرنے کا جو تجربہ نزاجیوں نے کیا تھا اس کا حشر اُن کے سامنے ہے۔ یہ کسانوں کو بھڑکانا نہیں چاہتے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے متوسط طبقے والوں کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے ۸، ۹ مہینے میں اس جماعت کی رکنیت چارگنی ہو گئی ہے اور چونکہ نزاجیوں کے مقابلے میں یہ متوسط طبقے کے حقوق کے زیادہ محافظ ہیں اس لئے یہ طبقہ اب ان کا ہم رکاب ہے۔

ذ۔ح

اسلامی دنیا

مصر ۲۶ مئی سنہ ۳۷ء کو پچاس قوموں کے نمائندوں نے بالاتفاق مصر کو جمعیت اقوام کا

کن شانا منظور کیا۔" الاہرام" قاہرہ لکھتا ہے کہ جب مصری وفد مصطفیٰ نحاس پاشا کی زیر قیادت سُرخ ٹوپیاں زیب سر کئے جمعیت کے ہال میں داخل ہوا۔ تو اس وقت کا نظارہ قابل دید تھا۔

جمعیت اقوام کے اس جلسہ خصوصی کے صدر جمہوریہ ترکیہ کے وزیر خارجہ توفیق رشدی بے۔ آپ نے مصری وفد کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ میں سب سے پہلا معاہدہ جو دو قوموں میں ہوا۔ وہ مصریوں اور حتیوں کا معاہدہ تھا، ہمیں فخر ہے کہ ہم آخر الذکر قوم کے صحیح وارث ہیں۔ مسٹر ایڈن برطانوی وزیر خارجہ نے بھی اس مبارک تقریب کے سلسلے میں مصر کے حق میں کچھ کلمات خیر کہے اور مصر کی قدیم عظمت اور اس کے بے مثل تمدن کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی حکومت کا یہ شروع ہی سے مقصد تھا کہ مصر کو آزادی کی اس منزل پر پہنچنے میں مدد دے۔ مسٹر ایڈن کے بعد سر آغا خاں نے مصر کو مبارکباد دی اور کہا کہ ہم ہندوستانیوں کی نظر میں مصر کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی زیادہ ہے کہ مصر مشرق اور مغرب کو ملانے والی درمیانی کڑی ہے۔ آپ نے مصر پر برطانوی عنایات کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں کہا کہ ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں کی برادری کا ایک رکن مصر کی اس کامیابی کو دیکھ کر کیوں نہ متاثر ہوگا کیونکہ اہل مصر تو ہمارے بھائی ہیں۔ ہمارا کلچر ایک، مذہب ایک اور دنیا اور دین کی زندگی کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر ایک ہی ہے۔

مصر میں جمعیت اقوام میں داخلے کے سلسلے میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ چنانچہ جب مصطفیٰ نحاس پاشا مصر واپس ہوئے تو اسکندریہ کی بندرگاہ پر ۲ لاکھ انسانوں کے جم غفیر نے ان کا استقبال کیا۔

مصر کی قومی زندگی گذشتہ بارہ مہینوں میں بڑے انقلابی دور سے گذر چکی ہے ناظرین جانتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء سے مصر کا دستور معطل تھا، بادشاہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ اور بادشاہ کے اشارے پر وزارتیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ کسی وزارت سے انگریز ناراض ہوتے تو برطانوی ہائی کمشنر کا اشارہ پاتے ہی بادشاہ کا فرمان جاری ہوتا۔ اور چشم زدن میں

وہ مغلوب ہو گئے ... جہاں نظر پڑتی دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرف برطانیہ کو خوش کرنے کی
کوششیں کی جاتی تھیں اور دوسری طرف بادشاہ اور اس کی درباری پارٹی کی سازشوں کو کامیاب
بنانے میں سعی کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قومی مفاد پس پشت ڈال دیئے گئے اور ملک کا نظم و نسق
جاہ نوازی اور اقربا پروری کا شکار ہو گیا۔ وفد پارٹی اور معتدل جماعتیں سب کچھ دیکھتیں لیکن درباری
قوت کے سامنے دم نہ مارتیں۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ حبش اور اطالیہ کی آپس میں چھڑ گئی۔ مصر نے اس
نازک وقت سے فائدہ اٹھایا۔ ملک میں ہڑتالیں ہوئیں۔ طلباء نے مدارس چھوڑ دیئے۔ گولی چلی
چند ایک مرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز نے مصری سربراہوں کو رام کرنے کی کوشش کی۔ دستور
بحال ہو گیا۔ وفد برسر اقتدار آ گیا۔ برطانیہ سے معاہدہ ہوا۔ معاہدے کے بعد یورپی مراعات
کا خاتمہ کر دیا گیا اور اب اسی ماہ کی آخری منزل یعنی جمعیت اقوام کی رکنیت بھی مل گئی۔ دوسرے
الفاظ میں مصر آزاد ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آزادی برطانوی سامراج کی چند در چند کڑیوں میں
جکڑی ہوئی ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ملک کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کا اقتدار
اور درباری پارٹی کا تسلط اب بالکل نہیں رہا۔ اور یہ چیز مصر جیسے ملک کے لئے جو ترقی کی دوڑ میں
کئی راہ مہینوں میں قطع کر رہا ہے۔ اور جس کی آبادی روز افزوں ہے اور اس میں آزادی کا جذبہ
بھی اسی رفتار سے ترقی کر رہا ہے کچھ کم نہیں۔

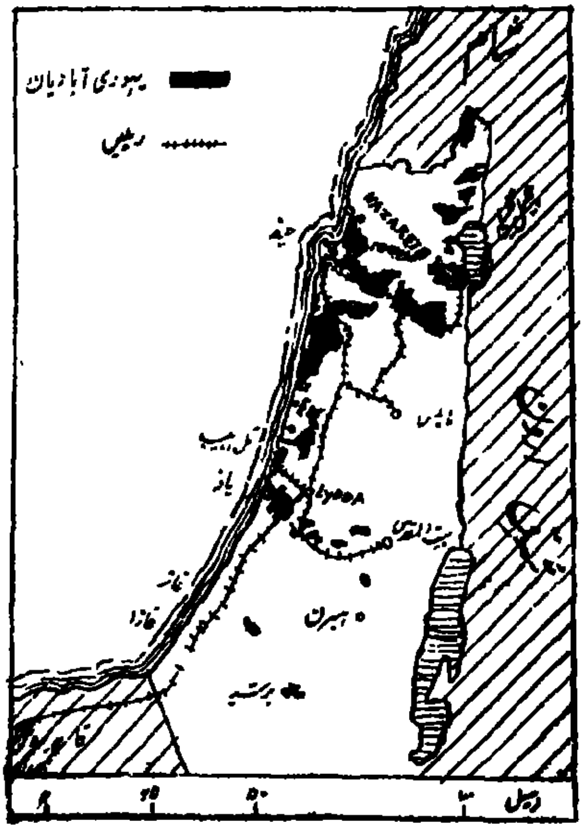
برطانوی معاہدے کو دیکھنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی یہ کامیابی محض ایک
سراب ہے۔ اور برطانوی اقتدار میں ذرا بھی فرق نہیں ہوا۔ لیکن جو لوگ مصر کے حالات سے واقف
ہیں وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ معاہدہ مصر کے لئے بہت اہم ہے۔ اس کی وجہ سے مصری
قومیت کی راہ میں جو سد سکندری حائل تھی وہ باقی رہی ہے۔ اب تک صورت حال یہ تھی کہ بادشاہ
اور بڑے بڑے پاشا انگریزوں کے بل بوتے پر مصری عوام کو کچل رہے تھے۔ وفد اور بادشاہ
میں جنگ تھی۔ مرحوم سعد پاشا سے نہ شاہ فواد کو دلی کدورت تھی اور شاہ موصوف اس عداوت
کی بنا پر ازہر پارٹی اور پاشا پارٹی کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ بادشاہ بچارے چل بسے۔ ازہر والے

...شیخ ظواہری نوجوان ازہریوں کی گرم مزاجی کی تاب نہ لا کر مستعفی ہوگیا۔ پاشا پارٹی بادشاہ ...نے ہی کمزور ہوگئی اور رہی سہی جو طاقت تھی وہ اس معاہدے نے ختم کردی۔ اب وفد ...کے لئے میدان صاف ہے۔ مصر ہزاروں برس کے استبداد کے چنگل سے آزاد ہوگیا۔ اور مصر ...یوں کی بجائے خالص اہل مصر کی حکومت کا زمانہ آگیا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ نیا دور مصر ...کے تمدن، مذہب، سیاسی اور علمی ترقیوں کے لئے بہت مفید ہوگا۔ اور کیا ...عجب کہ عنقریب میں مصر بھی اسلامی ممالک کا سرتاج بن جائے۔

ع۔س

فلسطین | فلسطین کے تحقیقاتی کمیشن کو مقرر ہوتے ایک سال ہورہا ہے۔ رپورٹ ابھی شائع نہیں ہوئی ہے لیکن اندازہ ہے کہ اس مہینے ضرور شائع ہوجائے گی۔ معاملات کو معرض التوا میں ڈالنے کا یہ ایک خاصا بہانہ ہے۔ پبلک کو ایک گونہ اطمینان ہوجاتا ہے۔ اور حکومت کو فضا ہموار کرنے کے لئے ایک وقفہ مل جاتا ہے اور پھر ہوتا وہی ہے جو ارباب بست وکشاد پہلے سے طے کرچکے ہیں کمیشن ...کے متعلق ایک قیاسی خاکہ یورپی اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ سرکار کے اخبارات کے ظن و تخمین بھی ہمارے یقین وایمان سے زیادہ صحیح ہوتے ہیں اس خاکے سے برطانیہ کی دشواریوں کا پتہ چلتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی کشمکش میں ہے۔ ایک طرف اسے اُن وعدوں کا خیال ہے جو مسلمانوں سے وقتاً فوقتاً کئے جاتے رہے ہیں اگرچہ وعدے اور معاہدے عملی طور پر ان درباروں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ...فلسطین کا تعلق دنیا کے ساٹھ ستر کروڑ اور مسلمانوں سے بھی ہے اور اس وقت حالات ایسے ہیں مسلمانوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں ہے کہ اطالیہ کو مسلمانوں میں گھسنے کا اور موقع مل جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی ان خفیہ معاہدوں اور زرین مصلحتوں کا خیال بھی دامن گیر ہے۔ جن کا تعلق دنیا کے سرمایہ دار یہودیوں سے ہے۔ یہودیوں کو جس امید پر برطانیہ نے فلسطین میں بسنے کی دعوت دی ہے وہ اگر پوری ...ہو جائے اور یہودیوں کو فلسطین سے خارج کردیا جائے یا ان کا مزید داخلہ بند کردیا جائے۔ تب ...کچھ کم دشواریاں پیش نہیں آئیں گی۔ اس معاملے میں وہ یہاں تک محتاط ہے کہ حال میں بلا اجازت

تنے والے یہودیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ تو عدالت انکو جیلنے سے زیادہ سزا نہیں دے سکتی۔ حالانکہ انھیں فلسطین سے خارج کیا جا سکتا تھا لیکن ہاں اس سے یہ نقصان ہوتا کہ چوری چھپے آنیوالوں کی تعداد میں کمی آجاتی[۵۱] اور یہودی عنصر کو بڑھانا اس کے استعماری مقاصد کے لئے بہرحال ضروری ہے اسی دوگونہ عذاب سے مجبور ہوکر تقسیم فلسطین کی تحریک اٹھائی گئی ہے بجنبال خویش۔ یہ بہترین تدبیر

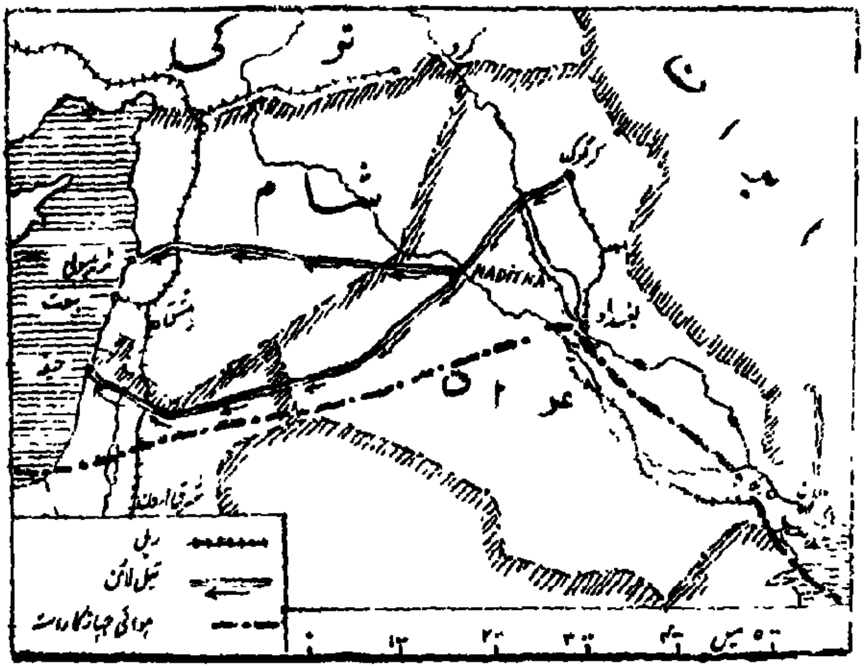


ہے۔ اور ایک حیثیت سے بہترین کہ یہودی آباد کئے جاتے رہیں۔ بلکہ اپنے اثر اور اقتدار کو ہر پہلو سے بڑھاتے رہیں اور مسلمان فلسطین میں داخل بھی نہ ہوں۔ رہا بیت المقدس ظاہر ہے اس پر ثالث کا قبضہ ہی

---

[۵۱] اب تک بیس ہزار کے قریب یہودی چوری چھپے داخل ہو چکے ہیں۔

قرین صواب ہو سکتا ہے۔ اس کے تصفیے تجربے کے نہیں جا سکتے۔ اور کوئی دعوے دار دوسرے کا قبضہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ دونوں کے نزدیک جانِ فلسطین یہی ہے۔ سلیمان ثالث کی اس عنایت پر راضی ہوں یا نہ ہوں، یہودیوں کے لئے تو یہ لبا غنیمت ہے۔ یہودیوں کو "بہتر نصف" یعنی ساحلی علاقہ دے دینے کا خیال؟ عذر یہ ہے کہ یہودی آبادیاں ہی یہاں ہیں۔ یہاں انھوں نے لاکھوں کروڑوں روپیہ لگایا ہے۔ فلسطین کا یہ ساحل بحرِ روم کی ایک زبردست دیوار ہے ملے



ہاتھ سے کھو دینا کیسے ممکن ہے۔ اس کا برطانوی استعداد کے سلسلے میں نہایت مفید ہے۔ حیفہ کی بڑھتی ہوئی بندرگاہ جس نے چند سال میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ اسکندریہ اور بیروت کی مشہور اور قدیم بندرگاہیں مات کھا گئیں۔ خیال تو فرمائیے۔ جنگِ عظیم سے پہلے حیفہ کے اٹھنے کے حساب سے مال کی مقدار ۸ لاکھ سے کم تھی۔ ۱۹۳۲ء میں ۵۰ لاکھ ہو گئی۔ درآں حالیکہ انہی سالوں میں اسکندریہ کے مال کی مقدار ۲۰ لاکھ سے ۳۰ لاکھ اور بیروت کی ۱۲ سے ۲۴ لاکھ رہی۔ اہل الرائے کہتے ہیں کہ عنقریب حیفہ

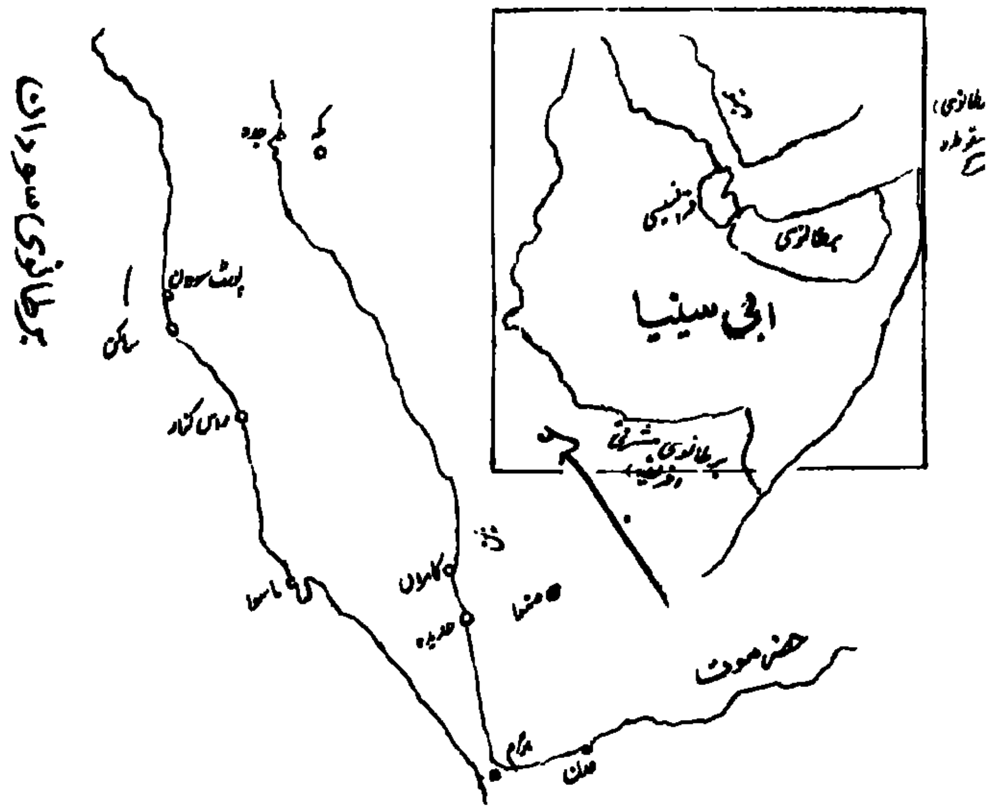
بحر روم کا سب سے بڑا بندرگاہ ہو جائے گا۔ اور مارسیلز کا مقابلہ کرے گا۔ حیفہ کی اہمیت کی کچھ اور وجہیں بھی ہیں۔ (۱) عراق سے تیل کے پائپ کی جو لائن فلسطین سے گذرتی ہے اس کا مخرج یہیں ہے فلسطین کی ریلوں کا مرکز بھی یہی بندرگاہ ہے۔ جنگ عظیم میں تیار کی ہوئی برطانوی ریل اور جنگ سے پہلے کی عثمانی حکومت کی بنائی ہوئی ریلوے کا مقام اتصال بھی یہی شہر ہے ریل کا یہ سلسلہ ایک طرف مصر سے مل جاتا ہے اور دوسری طرف شرق اردن سے (۲) ان لائنوں کے علاوہ دو لائنیں اور شروع ہونے والی ہیں۔ ایک عراق کی پائپ لائن کے ساتھ ساتھ شرق اردن ہوتی ہوئی بغداد جائے گی اور دوسری حیفہ سے شامی طرابلس تک۔ اس طرح افریقہ، ایشیا اور یورپ تینوں مل جائیں گے (۳) برطانیہ نے ایک ہوائی مستقر تو (۔۔۔۔۔۔) میں بنا رکھا ہے۔ اب نقش ثانی حیفہ کی سرزمین پر قائم کیا جائے گا۔ ————— ایسا عظیم الشان بندرگاہ نہ مسلمانوں کو دیا جا سکتا ہے اور نہ یہودیوں کو، اور بظاہر خود بھی لینا ٹھیک نہیں، کہ ساحل تو اصولاً زیر انتداب ہوگا ہی اس لئے حیفہ کو بین الاقوامی بندرگاہ کا نام دے کر دنیا کو وسیع القلبی کا ثبوت دیا جا سکتا ہے بین الاقوامی ہونے کے باوجود بھی ظاہر ہے ان اندھوں میں کون راجہ ہوگا۔ مسلمانوں کا اس تقسیم میں نقصان ہی نقصان ہے۔ اس لئے انھیں برطانوی انتداب سے نجات کا لالچ دیا جائے گا۔ ایسی آزادی جو بیت المقدس کی غلامی کے بدلے میں ملے۔ ہم نہیں سمجھتے عالم اسلام کو کیسے قبول ہوگی، اور پھر آزادی بھی آزادی نہیں جو حصہ مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے۔ وہ سیاسی و معاشی حیثیت سے بھی پست ہے۔ لیکن جب کعبہ پر جو حرم ثلاثہ میں سب سے افضل ہے مسلمان غیروں کا اثر گوارا کر سکتے ہیں تو کیا اس معاملے میں وہ دیر سویر برطانوی فیصلے کو قبول نہیں کر لیں گے؟

یمن و اطالیہ | آپ کو یاد ہوگا کہ جنگ حبش کے دوران میں جب ابی سینیا کی وطنی حکومت دم توڑ رہی تھی اطالیہ کے ایک ذمہ دار رکن سلطنت نے کہا تھا کہ "ہم حکومت روما کے گذشتہ عظمت و اقتدار کو واپس لانا چاہتے ہیں۔" یہ الفاظ کچھ اضطراری طور پر ادا نہیں ہوئے تھے بلکہ ایک سوچے سمجھے نقشہ فتوحات

کے اظہار کے طور پر کیے گئے تھے۔ اطالیہ کی عام رفتار سیاست روزانہ اس کی شہادت پیش کرتی رہتی ہے جنگ حبش کی کامیابی کے بعد تو اس کے حوصلے اور بلند ہوگئے ہیں اور اس فال نیک نے اسکی امیدوں میں جان ڈال دی ہے۔ آج اگر حکومت اپنے آپ کو دنیا کی کسی حکومت سے ہیٹا نہیں سمجھتی تو خود عوام الناس بھی اپنے آپ کو سلطنت عالم کی وراثت سے حق دار سمجھتے ہیں۔ اطالیہ ابھی جارحانہ کارروائی میں پیش قدمی کرنا نہیں چاہتا بلکہ بعض کو اپنی قوت و سطوت سے ڈرا کر اور بعض کو سبز باغ دکھا کر راستہ صاف کرنا چاہتا ہے اس وقت بحیرہ روم اور بحیرہ احمر اس کی توجہ کے مستقل مرکز ہیں۔

البانیا کو سایہ عاطفت میں اسی لئے لیا گیا ہے کہ بحیرہ روم میں حریفوں کا مقابلہ کرسکے لیبیا کے مسلمانوں کو بھی اسی لئے پرچایا جا رہا ہے۔ مصر کے امتیازات کی تنسیخ میں سرگرمی بھی اسی لئے دکھائی گئی ہے کہ اسکندریہ کی بندرگاہ کا ملک کم سے کم اخلاقی طور پر مرہون احسان رہے شام پر جو نظریں اٹھ رہی ہیں اس میں بھی یہی راز پوشیدہ ہے۔ بحیرہ احمر کی اہمیت اٹلی آج سے نہیں مدتوں سے جانتا ہے اسی لئے سنہ [illegible]ء میں ابی سینیا کی ایک بندرگاہ آساب کو خریدا گیا تھا۔ بحیرہ احمر اور ابی سینیا میں اٹلی کا یہ پہلا قدم تھا۔ ۵ سال بعد ابی سینیا کو تو وہ ہضم کر گیا۔ لیکن دوسرا خطرہ ہنوز باقی ہے اس کے سینے دہ تاک میں ہے یمن کی، چند سال پیشتر اپنی اسی غرض کی خاطر وہ امام یمن کو ابن سعود کے خلاف اکسا رہا تھا لیکن ابن سعود کی غیر متوقع فتح نے تعلقات میں بدمزگی پیدا کردی اور یہ کوشش جاری نہ رہ سکی۔ لیکن ابی سینیا پر مستقل قبضہ رکھنے کیلئے کسی نہ کسی شاداب علاقہ کا انتظام ازبس ضروری ہے، اور اس سے زیادہ یہ کہ بحیرہ احمر میں سرخ خطرے کے مقابلے کی قوت پیدا کی جائے ادھر ابی سینیا خشکی میں بھی برطانیہ سے گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف برطانوی سوڈان ہے۔ دوسری طرف مشرقی برطانوی افریقہ تیسری طرف کینیا۔ اور یوگنڈا کی برطانوی نوآبادیاں اور سمندر میں تو برطانیہ ہی برطانیہ ہے۔ عرب کے ساحل پر حضرموت، عدن، پیرم، کامران، اور پھر خود افریقی ساحل پر پہنچے زنجبار اور پورٹ سوڈان برطانوی بندرگاہیں ہیں۔ اور سابقہ استحکامات کے باوجود مضبوط سے مضبوط تر بنائی جارہی ہیں۔ حال ہی میں جزیرۂ پیرم کو نہایت اہتمام کے ساتھ مسلح کیا گیا۔ پیرم کا جزیرہ عدن اور

اور حدیدہ کے درمیان ہے۔ یہ اگرچہ بہت چھوٹا ہے لیکن اپنے محل وقوع کے اعتبار سے نہایت
اہم ہے اور ساتھ ہی پٹرول کے چشموں کا خزانہ بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔ کامران کو بھی جو اس سے بڑا جزیرہ
ہے اور حدیدہ کے شمال میں واقع ہے۔ برطانیہ نے جنگی قلعہ بنالیا ہے۔ یمن کے ساحل پر کئی چھوٹے چھوٹے
جنگی جہاز پہلے سے قائم کر رکھے ہیں ——— یہ حالات ہیں جن کی وجہ سے اطالیہ یمن کی طرف پھر
توجہ کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ اسی لئے اسلام نوازی اور مسلمان پروری کے ڈھونگ رچائے جارہے



ہیں۔ دین متین کی حفاظت و صیانت کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ عام مسلمانوں کی تائید
حاصل کرے اور پھر اپنا کام نکالے۔ اس کا پروپیگنڈا بہت کچھ کامیاب ہے۔ فلسطین میں میلاد النبی کی
مقدس تقریب میں مسولینی کی تصویروں سے رونق محفل کا کام لیا گیا۔ سنا ہے ان تصویروں کو لوگ
بڑی وقعت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس قدر کی وجہ تو یہ ہے کہ فلسطین برطانیہ سے

بیزار ہے وہ اسے "الد الخصام" جانتا ہے اس بڑے دشمن کا خاتمہ کرنے کے لئے چھوٹے دشمنوں سے دوستی کر لینا مفید مطلب ہے۔ اسی لئے مسلمان ادھر مائل ہو رہے ہیں عربی اخبارات جو اطالیہ کے اصل ارادوں سے واقف ہیں تیز و تند مضامین لکھ رہے ہیں اس لئے وزیر خارجہ اطالیہ کو پارلمنٹ میں اس اعلان کی ضرورت پڑی کہ اٹلی کی سیاست خارجہ کا تقاضا ہے کہ وہ عربی ممالک اور عالم اسلام سے تعلقات پیدا کرے کیونکہ بحیرۂ روم میں عربی عناصر کو خاص اہمیت حاصل ہے بعض اخبارات نے عربی اطالوی تعلقات کو خراب کرنے کے لئے نہایت مذموم طریقہ اختیار کر رکھا ہے مگر ہم اس کا جواب عمل سے دیں گے اور دنیا کو بتا دیں گے عربی اطالوی تعلقات کو دنیا کی موجودہ سیاست میں کتنا دخل ہے" ثبوت کے طور پر آپ نے یہ بھی بتلایا کہ ہم نے مصر کے اس مطالبے کو سب سے پہلے تسلیم کیا کہ حدود مصر سے اجنبی امتیازات کا خاتمہ کر دیا جائے یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہم قول سے نہیں بلکہ عمل سے عربوں سے تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان اخبارات کی غرض یہی نہیں ہے کہ مسلمانوں کو اطالیہ کے ناپاک ارادوں سے خبردار کریں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ بحیرۂ روم میں برطانوی استحکامات کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے جواز کی صورت نکل آئے۔

اطالوی وزیر کو تسلیم ہے کہ سیاسیات خارجہ کے تقاضے سے مجبور ہو کر مسلمانوں سے تعلقات قائم کر رہا ہے۔ اس کے خود یہی معنی ہیں کہ سیاسیات خارجہ جب چاہے گی اس تعلق کو توڑ ڈالے گی تو لکم زور عضو پر گراں گزرتا ہے۔ آج سیاست عالم کا سب سے کم زور عضو مسلمان ہے۔ لازماً وہ شکار ہونا چاہئے اور جب تک وہ خود قوی نہیں بنتا۔ دنیا کی کوئی قوت اس کو بچا نہیں سکتی۔

مسلم ایشیائی معاہدہ۔ جنگ عظیم کے خوفناک نتائج سے متاثر ہو کر دنیا دیرپا صلح و امن کی ضرورت سے بے چین ہو رہی تھی۔ اسی وجہ سے اتحاد عالم کے نظریے کی بڑی تعریف کی گئی اور جمعیت اقوام کو دنیا کی بے چینیوں، حربی مصیبتوں کا ایک آسمانی علاج سمجھا گیا تھا۔ لیکن قوت اور طاقت کے رواج نے بتلایا کہ چالاک قومیں امن سے بھی جنگ کے فوائد حاصل کر لیتی ہیں اور دوستی کے باوجود دشمنی سے باز نہیں آتیں۔ اس لئے آج جمعیت اقوام کی طرف سے عام مایوسی اور نفرت پیدا ہو گئی ہے

اور اب طبقاتی اتحاد کی طرف میلان ہے بلقان کی ریاستوں اور مسلمان حکومتوں کا اتحاد اسی نظریے کے ماتحت شروع ہوا ہے۔ مسلم ایشیائی معاہدے نے تمام مسلمان حکومتوں کو ایک مسلک میں منسلک کر دیا ہے۔ شام کی جمہوریت کی شمولیت کے بعد بغداد اور انگورہ کا درمیانی خلا بھی دور ہو جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ دنیا کی عام سیاسی رفتار کی بدولت ع

پھر سلے ہیں۔ سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

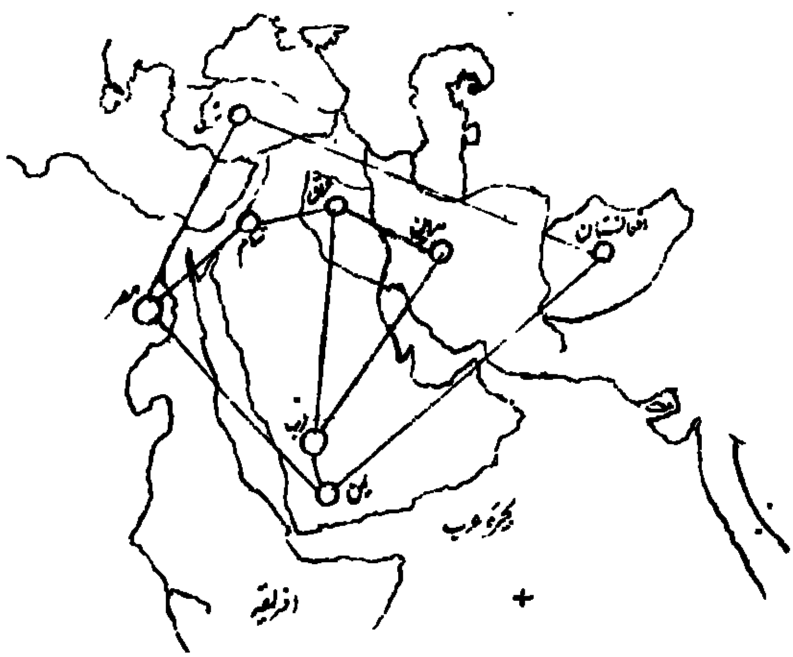
لیکن ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ یہ اتحاد اتنا مذہبی نہیں ہے جتنا سیاسی۔ اور اسی لئے سیاسی معاہدوں کے مد و جذر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ترکی ایران اور اُن کے بعد مصر میں وطن پرستی کا جذبہ جس نہج پر پرورش پا رہا ہے وہ کسی مذہبی اتحاد کی توقع دلاتا بھی نہیں ہے بہر حال سیاسی خوف و خطر ہو یا مذہبی اخوت و محبت کسی نہ کسی بہلانے سے تو سہی ....

....

اگر اتحاد کے اس جذبے میں خلوص و محبت کی کوئی رمق ہے تو اس سیاسی معاہدے میں بھی مذہبی گہرائی پیدا ہو جائے گی۔ اس معاہدے کا ہیرو ترکی ہے اور ترکی ادھر بلقان کی ریاستوں کے ساتھ مربوط ہو گیا ہے۔ اس طرح اس طبقے کو صرف اسلام تک محدود نہ سمجھنا چاہئے انفرادی طور پر عراق نے تعلق مضبوط کیا ہے۔ یمن اور سعودی عرب سے اور عراق مصر کی طرح برطانیہ کے ساتھ جکڑا ہوا ہے اور اس کی فوجی نقل و حرکت برطانوی احکامات کی پابند ہے۔ فرکی بھی برطانیہ کا مرہون منت (مقروض) ہے۔ اسی لئے برطانیہ اس اتحاد سے خوش ہے اور اس کو اپنے حق میں مفید جانتا ہے۔ اس لئے کہ آج اطالیہ کا مقابلہ سب سے ضروری ہے۔ اور اطالیہ چونکہ مسلمان ملکوں میں گھسنا چاہتا ہے۔ اس اتحاد سے ان ملکوں کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جائے گا اور برطانوی تعلقات قائم رہیں گے۔

اسلامی ممالک کے اس اتحاد میں ایک داخلی فائدے کا بھی امکان ہے اور وہ یہ ہے کہ ان ملکوں کی تمدنی افراط و تفریط ایک دوسرے سے مل کر کوئی درمیانی راہ پیدا کر لے اور سب صراط مستقیم پر گامزن ہوں۔ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب معاہدہ محض کاغذی نہ ہو۔ بلکہ برادرانہ

دردمندی کے ساتھ ایک دوسرے کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر یہ دردمندی نہیں ہے تو اس معاہدے سے کچھ زیادہ توقع رکھنی نہیں چاہیے۔



تعلیمی دُنیا

آیندہ ماہ اگست میں جاپان کے صدر مقام ٹوکیو میں ایک عالمی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوگی اس میں دنیا بھر کے متمدن ممالک سے تقریباً ایک ہزار نمائندے شرکت کریں گے۔ یہ تقریب دراصل دنیا کی تعلیمی انجمنوں کی جمعیتہ کا ساتواں اجلاس ہے اس سے پہلے اسکے بہت اہم اور مفید جلسے۔ آکسفورڈ، انگلستان، جنیوا (فرانس)، السنور (ڈنمارک) وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔ جہاں تعلیمی دنیا کے ماہرین اور مشاہیر یکجا جمع ہو کر تعلیم جدید کے نظریوں پر مبادلۂ خیالات اور بحث و تمحیص کرتے رہے ہیں۔ ٹوکیو کانفرنس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جاپان پہلا ایشیائی ملک ہے جہاں یہ کانفرنس منعقد کی جارہی ہے۔ حکومت جاپان کانفرنس کی ہر طرح مالی اور اخلاقی امداد کررہی ہے۔ ہندوستان سے بھی ماہرین تعلیم کا ایک وفد کانفرنس میں شمولیت کی غرض سے روانہ ہوگیا ہے

کچھ عرصے سے حکومت ایران کی وزارت تعلیم عامہ نے اپنی توجہ مسئلہ تعلیم بالغان اور مکاتیب شبینہ کی طرف مبذول کی ہے۔ حکومت کو یقین ہے کہ اگر اس مسئلہ کو صحیح طریق سے ہاتھ میں لیا جائے تو بہت سے ناخواندہ افراد جو بچپن میں تعلیم سے محروم رہ گئے تھے۔ اس نعمت سے فیضیاب ہوسکیں گے۔ یہ مدرسے حکومت کے قوانین خصوصی کے ماتحت اور قابل اساتذہ کی زیر نگرانی کھولے جارہے ہیں۔ سارے ملک میں ان مدرسوں کی روزانہ حاضری بہت تیزی سے ترقی کررہی ہے۔ تقریباً ۷۰ ہزار افراد نے اب تک اپنے نام درج کرائے ہیں۔ اس اقدام سے عوام میں عام دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ٹرکی کے تعلیمی جہاد کے بعد ایران کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ ہندوستان میں تعلیم بالغان کا مسئلہ اب تک حکومت کی توجہ کا شرمندۂ احسان نہ ہوا جو کچھ تھوڑا بہت اس سلسلے میں ہوا ہے وہ محض چند افراد کی ذاتی کوششوں یا بعض قومی کام کرنے والے اداروں

کی جانب سے ہوا۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک دو مقالے پڑھ دیئے گئے یا بمبئی کے کاریگروں یا پنجاب کے کسانوں کے لئے ایک دو کے مدرسے کھول دیئے گئے۔ ہندوستان کی عبرت ناک جہالت اور بے علمی کا علاج جس نظام تعلیم میں ہے اس کا سب سے اہم شعبہ شاید تعلیم بالغان ہی کا ہوگا۔

ایران میں شاہزادی شاہ دخت شمس پہلوی کے زیر صدارت ایک مرکز نسواں قائم کیا گیا ہے جس کے مقاصد میں طبقۂ نسواں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت، امور خانہ داری اور پرورش اطفال کی تعلیم، لڑکیوں میں ورزش جسمانی کی ترغیب، حفظان صحت اور بے کس عورتوں کی امداد کے لئے سماجی سدھار کی انجمنیں کھولنا شامل ہے۔ طہران کے مرکز نسواں میں تین شعبے ہیں، ادب، کھیل، سماجی سدھار۔ یہ مرکز اپنے مقاصد کے پرچار کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتا ہے مثلاً تصاویر، مفید کتابوں اور رسالوں کی اشاعت۔ اس مرکز کی شاخیں مملکت ایران کے بہت سے صوبوں میں کھل چکی ہیں۔

جرمنی آج کل مختلف ممالک سے علمی اور تعلیمی تعلقات کو بڑھانے اور مستحکم کرنے کی فکر میں ہے۔ طلباء اور اساتذہ کو جرمنی کی تعلیم گاہوں سے مستفید ہونے کے مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں چنانچہ حال ہی میں ترکی کے ۵۰ اساتذہ، مدرسوں کے مہتمم اور صیغۂ تعلیم کے افسروں نے جرمن اکاڈمک ایکسچینج سروس کی دعوت پر برلن، ہیمبرگ، بریمن، ہیڈل برگ وغیرہ کی تعلیمی سیر کی۔

موسم گرما کی تعطیلات کے اختتام پر سنٹرل پارک آف کلچر اینڈ ریسٹ' موسکو نے مدرسے کے بچوں کے لئے دس دن کا تہوار منایا۔ اس تقریب میں تقریباً دس ہزار بچے شریک ہوئے۔ پہلا دن "یوم موسیقی" تھا۔ اس روز روس کے بہترین لوگوں اور گیت لکھنے والوں نے بچوں کو محظوظ کیا۔ دوسرا دن "یوم ادب" تھا۔ اس دن بچوں نے اپنے محبوب مصنفین سے ملاقات کی۔ تیسرا

دن "یوم جغرافیہ" تھا۔ اس دن سب بچوں نے مل کر ایک کھیل کھیلا جس کا نام "دنیا کے گرد ایک سفر" تھا "یوم تاریخ پر" ایام ماضی کی سیر" کا کھیل کھیلا گیا۔ ایک دن غیر زبانوں کے لئے مخصوص تھا۔ یہ دلچسپ تہوار جس کا نام " درسی سال کو خوش آمدید" تھا دس دن تک منایا گیا۔ دہلی میں بھی پچھلے دنوں میونسپل باغات میں یوم اطفال منایا گیا تھا جس میں ہزاروں بچوں نے شمولیت کی ہندوستانی بچوں کے لئے یہ غیر معمولی مگر بے حد دلچسپ تجربہ تھا۔ امید ہے اس مفید تحریک کو آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔ اور اس تہوار کو تعلیمی حیثیت سے زیادہ مفید اور کارآمد بنایا جائے گا

ماسکو میں دو سال سے بچوں کی کتابوں کا ایک عجائب خانہ قائم ہے جس میں کم و بیش ہر ملک اور ہر زمانے کے بچوں کی نصابی اور دوسری کتابیں موجود ہیں۔ یہ ادارہ ادب کے اس شعبے میں علمی تحقیقات کرتا رہتا ہے اور ان کے نتائج کو ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں منتشر کرتا رہتا ہے۔ بچوں کے کتب خانے۔ ٹریننگ کالج۔ بچوں کے لئے لکھنے والے مصنفین اور ناشرین اس ادارے سے پورا فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں۔ یہ ادارہ ماہرین تعلیم کے جلسے منعقد کرتا ہے تعلیمی نمائشوں کا انتظام کرتا ہے۔ والدین اور ماہرین تعلیم کو حسب ضرورت مشورہ دیتا ہے۔ اسی میں بچوں کا ایک دارالمطالعہ بھی ہے۔ نیز تصاویر اور چکنی مٹی، موم وغیرہ کی اشیاء کی نمائش کا مستقل طور پر انتظام ہے جو بالعموم کتابوں کے مضامین کی تصریح اور توضیح میں کام آتی ہیں۔

ہندوستان میں اس قسم کے تعلیمی عجائب خانوں کا تو کیا ذکر اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کی بنائی ہوئی اشیاء کی نمائش بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ علی گڑھ کانفرنس کے سلسلے میں جامعہ کی نمائش یا مدن اسکول کی نمائش نقاشی محض اتفاقی واقعات ہیں۔ ایسی مفید تحریکات کے لئے کوئی مستقل اور منظم مرکزی انتظام نہیں ہے۔ ہارٹوگ کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں مرکزی تعلیمی کتب خانوں اور عجائب خانوں کی سفارش کی تھی مگر جہاں (بقول مارکھم و ہارگریوز کی رپورٹ کے) ملک بھر کے عجائب خانوں پر محض سات لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہو جو کسی یورپی صدر مقام کے ایک معمولی عجائب گھر کے سالانہ خرچ کے لئے

ناکافی ہو وہاں کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں ایسے مفید ادارے کھل سکیں گے؟

حکومت ہند کے ایجوکیشنل کمشنر ۳۳-۱۹۳۲ء کی رپورٹ میں تعلیم کی عام ترقی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"نظام تعلیم کے نقائص ایک مرتبہ نہیں۔ بلکہ بار بار جتائے گئے۔ اور اس کی اصلاح کے لئے ضروری تجاویز بھی پیش کی گئیں۔ لیکن جب سے صیغۂ تعلیم متعلقہ محکمہ قرار دیا گیا کسی صوبجاتی وزارت نے بھی تعلیمی خرابیوں کے انسداد کی بنیادی کوشش نہیں کی وزرا نظام تعلیم میں اوپر کے درجوں میں جماعت بندی کی اصلاحی تشکیل نہ کر سکے۔ کیوں کہ انہیں طاقتور مخالفین کی نکتہ چینی کا اندیشہ تھا۔ ابتدائی درجوں میں انھوں نے مالی اور ذہنی اسراف کے انسداد سے بے چارگی ظاہر کر دی"

مگر سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالات کی ذمہ داری تمام تر وزرا، پر رکھی جا سکتی ہے۔ کیا ان کو اختیارات کلی دئے گئے تھے۔ کیا محکمہ تعلیم جیسے اہم صیغے کے لئے مناسب رقم میزانیہ میں منظور کی جاتی تھی۔ کیا گورنر کے ہاتھ میں خصوصی اختیارات کا طلسم نہ تھا۔ کیا محکمہ کا نظم ونسق ایک ڈائرکٹر کے ہاتھ میں نہ تھا۔ جو اپنی ترقی کا راز گورنر کی خوشنودی میں سمجھتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کو کلی اختیارات تفویض کر دئے گئے تھے تو کیا جماعت بندی کے سالوں کو ادھر ادھر کرنے سے نظام تعلیم کی بنیادی خرابیوں کا انسداد ہو سکتا ہے؟ اور شاید یہ سوال پوچھنا بھی بے محل نہ ہو کہ" وزرا کی حکومت سے پہلے اس نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے حکومت ہند نے کیا کیا تھا۔ اور جن علاقوں میں اب تک انتظام براہ راست حکومت کے افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ مثلاً دہلی، اجمیر، بلوچستان وغیرہ۔ وہاں کیا تعلیمی انقلاب ظہور پذیر ہو چکا ہے۔

پروفیسر سیدین (علی گڑھ) کے نام نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے مرکزی دفتر سے ایک خط موصول ہوا ہے کہ پروفیسر زیلاکس (فن لینڈ)، پروفیسر پیری بووے (جنیوا) اور پروفیسر فوسٹر (انگلینڈ)

تعلیمی دنیا کے تین مشاہیر آیندہ اکتوبر میں ہندوستان کے مختلف تعلیمی مرکزوں کا دورہ کریں گے۔
نیو ایجوکیشن فیلوشپ ایک بین الاقوامی جماعت ہے جس کا نصب العین نصاب اور طریقۂ تعلیم کے نئے اصولوں اور جدید تعلیمی نظریوں کی اشاعت اور ترویج ہے۔ اس کی شاخیں دنیا کے ہر متمدن ملک میں موجود ہیں۔ یہ جماعت وقتاً فوقتاً مختلف ممالک میں تعلیمی وفود بھیجتی رہتی ہے تاکہ نہ صرف دوسرے ممالک کے نظام تعلیم کا مطالعہ اور تجزیہ ہو سکے بلکہ تعلیمی دنیا کے کارکنوں کے مابین ایک تمدنی اور علمی رشتہ قائم ہو جائے۔ یہ وفد علی گڑھ میں دو دن قیام کرے گا۔ وشوا بھارتی یونیورسٹی نے بھی اک دعوت نامہ بھیجا ہے۔ یہ وفد اگلے دسمبر میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے اجلاس لاہور میں بھی شرکت کرے گا۔

علی گڑھ ٹریننگ کالج نے اس سال مدرسین اور دیگر اصحاب کے لئے جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں تعطیلات میں مفید تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ کورس ۱۸ مئی سے شروع ہوا اور ۳۱ مئی کو ختم۔ تقریباً سائٹھ اصحاب جن میں انٹرمیڈیٹ کالج، ہائی اسکول اور ٹریننگ اسکولوں کے اساتذہ شامل تھے، کورس میں شریک ہوئے۔ ان میں سے بعض دور دراز مقامات سے آئے تھے۔ نصاب اس طریق پر مرتب کیا گیا تھا کہ دو ہفتے کی قلیل مدت میں شامل ہونے والے اصحاب کو تعلیم جدید کے نظریوں اور چند یورپی ممالک کے نظام تعلیم سے واقفیت ہو جائے۔ مختلف مضامین کی نصاب میں اہمیت، اور ان کے طریق تعلیم سے بالعموم اور انگریزی زبان کے طریق تعلیم سے بالخصوص روشناسی ہو جائے۔۔ ساتھ ہی ہندوستان کے نظام تعلیم پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالی جائے کورس ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ ڈنمارک، روس انگلینڈ اور جرمنی پر لیکچر ہوئے انگریزی زبان کی تعلیم کے سلسلے میں ڈائرکٹ میتھڈ، نثر، نظم، مضمون نویسی اور صرف ونحو کی تعلیم وتدریس پر تقریریں ہوئیں۔ ہندوستانی طریقۂ تعلیم اور ہندوستانی تعلیم کے دیگر اہم مسائل پر لیکچر ہوئے اور شرکا کی ذہانت کی آزمائش کے نئے طریق سے امتحان لیا گیا۔ جو بہت دلچسپ ثابت ہوا۔
نصاب میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا کہ تقریروں اور مقالوں کا اساتذہ کے روزمرہ کام

ان کی مشکلات اور عملی مسائل سے گہرا تعلق ہو۔ اس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ ہر لکچر میں خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ہر ہفتے میں دو بار اساتذہ کی عملی مشکلات پر گفتگو اور ہر بحث کے لئے وقت مخصوص کر دیا گیا تھا مختلف مضامین کے سلسلے میں نہ صرف نصاب میں ان کی اہمیت اور اُن کے طریقۂ تعلیم پر بحث کی گئی بلکہ ہر مضمون کے سلسلے میں کتابوں اور سامان و آلات کی جو اس کی تعلیم میں کار آمد اور مفید ہیں نمائش بھی کی گئی۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ نے بھی چند ایسے لکچر دیئے جو علمی اور تعلیمی لحاظ سے عام فائدے کے تھے۔ طلبہ کی سہولت اور امداد کے لئے مختلف لکچروں کے خلاصے ٹائپ کر کے تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ تاکہ اُن کا مطالعہ کر کے ان پر بحث کر سکیں اور اُن کے پاس کورس کی ایک مستقل یادگار موجود رہے

۱۴ر جون کے اسٹیٹسمین میں ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون جامعہ ملیہ دہلی پر شائع ہوا ہے، جس میں جامعہ کے پچھلے پندرہ سالوں کی تعلیمی تاریخ اور کارگزاریوں پر مفصل نظر ڈالی گئی۔ فاضل مدیر اس مضمون کے دوران میں لکھتے ہیں:۔

یہ ادارہ ہندوستانی مسلمانوں کی اس تمنا کا بہترین مظاہرہ ہے کہ اُن کے نوجوانوں کی تعلیم ان بلند نظریوں اور اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہو جو اُن کی ادبی اور تمدنی روایات کی حامل ہے۔ ان کی تربیت میں غیر ملکی اور اجنبی اثرات بہت کم ہوں۔ غیر ملکی تمدن و تہذیب سے وہی کچھ اخذ کیا جائے جو کار آمد اور مفید ہو" فاضل مدیر نے جامعہ کے نصاب اور طریق تعلیم پر اظہار استحسان کیا ہے اور کارکنان جامعہ کی بے غرض اور سچی قربانی کی تعریف کی ہے۔

ودیا بھون اودے پور (راجپوتانہ) میں واقع ہے۔ یہ مدرسہ ہر سال دو ہفتوں کے لئے میواڑ کی کسی خوب صورت جھیل کے کنارے قدرتی مناظر کے دامن میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ان ایام کے لئے پہلے سے ہی خاص نصاب مرتب کیا جاتا ہے۔ جماعتیں کھلی ہوا میں بیٹھتی ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ

خیموں میں رہتے ہیں۔ بچوں کو ان کی عمر کے مطابق اور جذباتی نشو و نما اور ذہنی ترقی کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے۔ پچھلی مرتبہ ایک گروہ نے دیہاتی آبادی کی سماجی اور اقتصادی حالت کا مطالعہ کیا تھا اور چند تاریخی مقامات بھی دیکھے تھے۔ دوسرے گروہ نے دو تاریخی مقامات کی جغرافی اور تاریخی سیر کی۔ چھوٹے بچوں کے گروہ کیمپ ہی میں رہتے۔ اور وہ گرد و نواح کے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور جزیروں کی سیر کرتے رہے۔ دیہاتی گھروں، ان کی سماجی حالت، نباتات اور حیوانات کا مطالعہ کرتے رہے۔ اسی دوران میں انھوں نے ملک کی تاریخ کے چند ڈرامے بھی تیار کیے۔

وزیر اعظم اڑیسہ کی صدارت میں اڑیسہ یونیورسٹی اسکیم کی تشکیل کے لئے ایک کانفرنس منعقد ہوئی جو وزرا، کالجوں کے پرنسپل صاحبان اور ڈائرکٹر تعلیمات پر مشتمل تھی۔ اس میں اڑیسہ کے لئے ایک یونیورسٹی بنانے پر زور دیا گیا۔ اور اسکیم کو مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی۔ حکومت ٹراونکور کے سامنے آج کل ٹراونکور یونیورسٹی کی تجویز زیر غور ہے۔ جو ملیالم زبان اور تہذیب و تمدن کے تحفظ اور تحقیقات کا مرکز ہوگی۔ اس سلسلے میں سر سی، وی، رامن اور دوسرے مشہور ماہرین تعلیم کو اک مشاورتی کمیٹی میں شمولیت کی دعوت دی گئی ہے۔ آسام یونیورسٹی کا مسئلہ بھی اخباروں میں زیر بحث رہ چکا ہے۔ صوبہ سرحد اور سندھ کے لئے بھی علیحدہ یونیورسٹیوں کی اہم ضرورت ہے۔ صوبہ سرحد کے لئے تو اک علیحدہ یونیورسٹی کی سفارش پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی نے بھی کی تھی۔ صوبہ سندھ، زبان، تاریخی اور تمدنی روایات کے لحاظ سے صوبہ بمبئی سے علیحدہ ہے۔ تعلیمی اعداد و شمار کے لحاظ سے بھی بہت پسماندہ ہے۔ اس کی تعلیمی ضرورت کو اک علیحدہ یونیورسٹی ہی پورا کر سکتی ہے۔

[redacted]

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیرادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۸ || اگست سنہ ۳۷ء || نمبر ۲

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپے (صہ) — فی پرچہ آٹھ آنے (۸/)

(پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس۔ دہلی)

شمالی ہند کے دیہاتی شعراء میں جدید انقلابی رجحانات

"میں نے یہ مضمون ۱۴، ۱۵ ار نومبر سنہ کو ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی ہندی اردو کانفرنس میں جو الہ آباد میں منعقد ہوئی تھی، پڑھا تھا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری سید سجاد ظہیر صاحب نے مجھ سے اسی وقت لے لیا تھا۔ میرے پاس اس مضمون کی کوئی نقل تک نہ تھی جو میں کسی رسالے میں خود طبع کرا دیتا لیکن جب مدت تک ظہیر صاحب نے کہیں اُسے چھپنے کے لئے نہ بھیجا، تب میں نے دریافت کیا کہ آخر میرا مضمون کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ ان سے اسی وقت ایڈیٹر صاحب رسالہ "نسیم" پٹنہ اپنے رسالے کے لئے لے گئے تھے، مگر اُن کا رسالہ بند ہو گیا۔ اور یہ مضمون اُن کے دفتر میں رکھا رہا۔ آخر بہت سعی و محنت کے بعد یہ واپس ملا ہے اور اس نوٹ کے اضافے کے ساتھ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔" مظلبی

دیہاتی شعراء کا ذکر کرنے سے پہلے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کی تمدنی اور اقتصادی حالت کے متعلق موٹی موٹی باتیں بتا دی جائیں۔

ہم دیہاتی آبادی کو حسب ذیل حصص میں منقسم کر سکتے ہیں:-

زمیندار، کسان زمیندار، کسان، مزدور کسان، ساہوکار، زمیندار ساہوکار اور کمین

زمیندار وہ شخص یا اشخاص، جو مالکان اراضی ہیں اور کسانوں سے لگان وصول کر کے ایک حصہ اس کا حکومت کو بطور مال گذاری ادا کرتے ہیں، اور باقی اپنے صرف میں لاتے ہیں۔ کسانوں کے مقابلے میں اُن کی مالی حیثیت بہت اچھی ہوتی ہے۔ اپنے بیشتر کام وہ بیگار یا بہت سستی مزدوری پر لوگوں سے کراتے ہیں۔ مزدوری اکثر ششماہی غلہ کی صورت میں فصل کی پیداوار آنے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ لیکن مزدور چونکہ قلاش ہوتا ہے اس لئے اس کو وقتاً فوقتاً جو غلہ بطور پیشگی ...

دیا جاتا ہے، اس پر سود لگایا جاتا ہے۔ اور ششماہی حساب ہو کر معلوم ہوتا ہے، کہ مزدور مقروض ہے
یہی حالت ایک قسم کی دائمی غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کسان زمیندار، وہ چھوٹی چھوٹی زمینوں
کے مالک جو اپنے ہاتھ سے زمین کاشت کرتے ہیں ـــــ کسان یا کاشتکار، جو ایک مقررہ لگان
زمین، زمیندار کو ادا کرتا ہے۔ اور نقصانات قحط سالی، ژالہ باری، کمی پیداوار، خود برداشت کرتا
ہے۔ اور زمین پر اپنی محنت اور قرض سے حاصل کردہ سرمایہ لگا کر فصل حاصل کرتا ہے۔ روپیہ، بیج
کپڑا وغیرہ تمام ضروریات مہاجن یا کسی دوسرے ساہوکار سے نہایت گراں سود پر قرض لیتا ہے
فصل کے ختم ہونے پر حساب ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ سب پیداوار ساہوکار کے حوالے کر دی
جاتی ہے۔ اور قرضہ بدستور باقی رہتا ہے۔ اور پھر دوسرے سال اس قرضے میں مزید قرضے کا اضافہ
کرتے رہتے ہیں۔ خریدتے وقت بازار سے گراں نرخ پر اسے غلہ ملتا ہے۔ اور جب بیچتا ہے تو بازار
سے ارزاں نرخ پر پیداوار ساہوکار کو دیتا ہے ـــــ مزدور کسان، وہ مزدور جس کے پاس
نہ بیل ہوتے ہیں، اور نہ جس کی اس قدر ساکھ ہوتی ہے کہ زمیندار اس کو براہ راست زمین
کاشت کرنے کے لئے دے، اور ساہوکار، بیج وغیرہ ضروریات، اس لئے وہ کسی کسان یا زمیندار
کے ہاں محنت کا شریک ہو جاتا ہے۔ دو بیل اس کے سپرد کئے جاتے ہیں بیلوں کے لئے چارہ جنگل
سے لانا، اور کاٹ کر کھلانا، کھولنا، باندھنا۔ ہل جوتنا، بیج بونا۔ اور فصل اٹھانا، یہ سب کام
اس کو سال بھر تک انجام دینے ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر پیداوار کا چوتھا حصہ اور بعض جگہ
پانچواں اور چھٹا حصہ بعد منہائی اس حصے کی لگان کے اسے دیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کسی زمیندار
کا شریک ہوتا ہے اس لئے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو کسان مزدوروں کا ہوتا ہے۔ جن کا ذکر
زمیندار کے ذکر میں کیا جا چکا ہے ـــــ ساہوکار، مہاجن یا ساہ۔ وہ سرمایہ دار
جو زمیندار کسانوں۔ اور کسانوں کو تمام اجناس وغیرہ قرض دیتا ہے۔ جس پر وہ شرح سود
عام طور چالیس روپیہ سینکڑہ تک لیتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ چند سال میں زمیندار کسان
اور کسان کی ہر چیز ساہوکار کی ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسے اپنا ان داتا سمجھنے لگتے ہیں۔

ساہوکار زمیندار ـــ اگر زمیندار ناسمجھ اور فضول خرچ ہے تو بہت جلد زمینداری ساہوکار کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ اور جب ساہوکار اور زمیندار ایک ہو جاتے ہیں، تو بہت دردناک مصائب سے کسانوں کو آشنا ہونا پڑتا ہے جو سابقہ زمیندار کے ظلم و ستم کو بھلا دیتے ہیں۔ لیکن یہ حالت پنجاب میں دوسری شکل اختیار کرتی ہے۔ دیہات کے متمول ساہوکار کسانوں کا خون پی کر آہستہ آہستہ شہروں اور منڈیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے بااثر زراعت پیشہ اقوام کے زمینداروں اور کسانوں کو قرض روپیہ دیتے ہیں کہ وہ دیہات میں مزدورت مند کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں کو زیادہ شرح سود سے قرض دیں۔ اور اس طرح ایک نئی قسم کے زمیندار ساہوکار پیدا ہو جاتے ہیں۔ ....

کمین، حجام، بہشتی، کمہار، کھاتی، لوہار، چمار اور جھنگی جو اپنے اپنے پیشے بہت حقیر معاوضوں پر انجام دیتے ہیں، اور گاؤں کی مشین کو چلاتے ہیں، اُن کی حالت اور کسانوں کی مالی حالت میں سوائے کمین اور شریف کے امتیاز کے کوئی فـــرق نہیں ہوتا۔

حکومت کے کارندوں کی ایک جماعت اور اُن کی ذریات بھی گاؤں کی زندگی کا ایک جزو ہے۔ جن میں پٹواری، نمبردار، چوکیدار، مکھیا شامل ہیں۔ اور پنجاب کے دیہات میں بجائے مکھیا کے سفید پوش اور ذیل دار۔ ان کے علاوہ بعض پیشہ ور قزاق جو وکیلوں، پولیس اور تحصیل کے عمال سے تعلق رکھتے ہیں اور خود ساختہ مقدم یا چودھری اور ٹھونڈا کہلاتے ہیں، اور اُن کا کام زیادہ تر رشوت کے سودے طے کرنا اور حصہ بٹانا ہوتا ہے۔

ہمارے دیہات کی زندگی سادگی، شرافت، غربت و فلاکت کا ایک مرقع ہے۔ جس کو ہر نیا آدمی ہزار پردے ڈالنے پر بھی چند دن میں سمجھ لیتا ہے اُن کے رسم و رواج آئین و ضوابط ایک ایسے مشترک کنبے کے منہدم آثار معلوم ہوتے ہیں جس کو گذشتہ زمانوں کے حالات نے آہستہ آہستہ منتشر کیا ہے اور یقیناً کبھی اس کے افراد ایک جان اور ہزاروں قالب بن کر رہتے ہوں گے۔

ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ فلاں مذہب کے پرستار ہیں۔ بہت دشوار ہے۔ کیونکہ

وہ توہم پرست ہیں۔ اکثر مذہبی عقیدوں کے متعلق وہ یہ اندیشہ رکھتے ہیں۔ کہ اگر وہ صحیح ہوئے تو نقصان نہ پہنچ جائے، اس لئے ان کو مان لو۔ مبادا انکار کی صورت میں قحط پڑ جائے یا پیداوار نہ ہو یا مویشیوں اور آدمیوں میں بیماری پھیل جائے۔ ایشور یا خدا، مذہبی اوتار، پیر پیغمبر اور دیوتاؤں کو وہ محض مذکورہ وجہ کے سبب تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر جب بارش نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے تو وہ اپنی سیدھی سادھی زبان میں بہت سادگی سے ایشور کو فحش گالیاں دیتے نظر آتے ہیں یا خدا کے ظلم پر بہت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ گو شروع شروع میں وہ اسے رضامند رکھنے کے لئے گیہوں کے دلیے، چاول کی گنجیاں بھی اس کے نام پر دان پن اور خیرات کرنے کے لئے پکا کر خود کھاتے اور اوروں کو کھلاتے ہیں۔

تمام ہندو دیہات میں جہاں ایک مسلمان کا بھی گھر نہیں ہوتا، پیروں کے فرضی مزار ملتے ہیں۔ جن پر چڑھاوے چڑھائے جاتے اور منتیں مانی جاتی ہیں اور فرضی پیر صاحب کی کرامات بیان کی جاتی ہیں۔ مسلمان دیہات میں ماتاؤں کے مٹھ اور کھیڑا دیوٹ نظر آتے ہیں۔ عورتیں جن پر کھیل تباشے چڑھاتی ہیں، کہ کہیں بچوں کے سیتلا نہ نکل آئے یا کھیڑے کا دیوتا ناراض ہو کر کوئی اور مصیبت نازل نہ کر دے۔ غرض مذہبی اعتقادات محض اس شک و شبہ کی بنیاد تک ہیں کہ کہیں وہ صحیح نہ ہوں۔ پنڈت اور ملا کا گاؤں میں ضرور اقتدار ہوتا ہے۔ لیکن اس کا سبب مذہبی عقیدت نہیں ہے بلکہ شادی بیاہ، کریاکرم، تجہیز و تکفین کے مراسم کی ادائیگی ان کے ذریعے ہوتی ہے۔ نیز تعویذ، گنڈوں، ٹونے، ٹوٹکوں سے وہ گاؤں کے اندر اپنا اثر رکھتے ہیں۔ پنجاب کے بعض اضلاع میں پیروں کا بہت بڑا اثر ہے۔ لیکن اس میں بھی مذہبی عقیدت کے بجائے یہ حقیقت کارفرما ہے کہ وہ سب بہت بڑے زمیندار اور جاگیردار ہیں اور ان کے مظالم کی دھاک اور تجارت کی چھوٹی شہرتیں ان کے اقتدار کا باعث ہیں نیز یہ شبہ بھی ؎

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

اُن کو بچوا رہا ہے جو کسانوں کی مذہبی عقیدت کا اصل اصول ہے۔

مذہبی تہوار ، تیرتھ جاترا اور عرسوں وغیرہ کی شرکت ، بیشتر موسمی میلوں کی شرکت کے مرادف ہے ۔ میلے دیہات کی جان ہیں ۔ عورتوں کے گاتے ہوئے جھرمٹ کے جھرمٹ ، اور الگوجے بجاتے ہوئے بانکے نوجوانوں کی ٹولیوں کے گشت اور پھر کسی جھرمٹ اور ٹولی کی مٹ بھیڑ یہ ایسی دلچسپیاں ہیں کہ جو ہر موسم کی تبدیلی اور بالخصوص بہار کی جان ہیں۔ اور وہ مصائب ہیں جن میں دیہات کی پرجا ہر وقت مبتلا رہتی ہے ۔ میلے ، ٹھیلوں ، چوپئی کے مقابلوں ، ہلیار لوں کی گتوں اور ہولی کے کھیلوں کے ذریعے ہی بھلائے جاتے ہیں۔

گنگا ، جمنا ، نربدا وغیرہ بڑے بڑے دریاؤں کا ماتا ۔ مائی اور دیوی سمجھا جانا بھی اُسی نقصان کے خوف اور نفع کی توقع کے سبب ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے ۔ کیونکہ دریا کھیتوں کو اپنی طغیانی سے زرخیز بھی کرتے ہیں اور بستیوں کو دریا برد بھی کر دیتے ہیں ۔

دیہات میں بہن یا بیٹی کی طرف بدنگاہی سے دیکھنا قتل ہو جانے کے مترادف ہے ۔ گاؤں کے چمار اور بھنگی کی بیٹی بھی ہر شخص کی بہن یا بیٹی سمجھی جاتی ہے ۔ اور بہو سارے گاؤں کی بہو کہلاتی ہے اس کا بھگا دیا جانا یا کسی قسم کی بد اطواری کا اس سے یا اس کے متعلق کسی سے سرزد ہونا سارے گاؤں کی بدنامی اور رسوائی تصور کی جاتی ہے ۔ گویا ہر فرد کے ناموس کی حفاظت سارے گاؤں کے ناموس کی حفاظت ہے ۔

دیہات کی اقتصادی حالت ایک دردناک داستان غم ہے ۔ دو فیصدی آدمی مشکل سے ایسے ملتے ہیں جو پیٹ بھر کر کھانا کھالیں اور گرمی اور جاڑوں میں کافی لباس رکھتے ہوں ، باقی آبادی اکثر فاقوں سے دوچار رہتی ہے ۔ جاڑوں کی راتیں آگ جلا جلا کر گذاری جاتی ہیں ۔ اور گرمیاں بوسیدہ کپڑوں سے ستر پوشی کرکے ۔ وہ برسات میں ملیریا کا شکار ہوتے ہیں ۔ ملیریا ختم نہیں ہونے پاتا کہ سردی نمونیہ اپنے ساتھ لاتی ہے اور وہ موت کا پیغام ہوتا ہے ۔ زراعت کے لئے مسلسل محنت اور مشقت ، ان کا مشغلۂ زندگی ہے ۔ جس سے ہر سال قرضے کی رقم بھاری ہوتی چلی جاتی ہے ۔ لیکن وہ سوائے اس کے کچھ اور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ گھر ، در ، مویشی زمین سب قرض کی

نذر نہ ہو جائیں ۔ اب وہ صنعتی مرکزوں، شہروں کا مزدوری کے لئے رخ کرتے ہیں۔ جہاں گو اسی قدر دردناک مصائب سے اُن کو واسطہ پڑتا ہے۔ مگر وہ مجبور ہیں۔ گاؤں میں ان کے لئے صرف ادائے قرض میں گرفتاریوں کے خطرے ہیں۔ زندگی گذارنے کی کوئی صورت وہاں نظر نہیں آتی، بہر نوع وہ عالی شان و دولت مند شہر کے گلی کوچوں یا خیراتی شفاخانوں میں ایک دن مردہ پائے جاتے ہیں۔ بہت ہیں جنھیں جیل کی زندگی ہی میں اپنے گذارے کی صورت نظر آتی ہے بھوک سے تنگ ہو کر وہ حقیر چوریاں کرتے ہیں۔ جو آمدنی اس سے ہوتی ہے، وہ بچنے کے لئے رشوتوں اور مقدمات کی پیروی میں چلی جاتی ہے اور وہ خود جیل جاکر اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

دیہات کے باشندے کہنا چاہیئے کہ ایک قلب مطمئن کے مالک ہیں۔ بھوک کے مصائب کو مقدر کا قصور یا پچھلے جنم کی غلطیوں کی سزا سمجھ کر جو انھیں مذہبی ادارے صدیوں سے بتلاتے ہیں وہ خاموش ہو جاتے ہیں وہ ان کا کوئی چارہ نہ سوچنے کے عام طور پر عادی ہیں۔ جب مذہبی ادارے ان کو محض تسلی دیتے ہیں کہ "اس جنم کے مصائب آئندہ جنم میں پھل دیں گے" یا اسلام میں صرف غریبوں کا حصہ ہے۔ اور وہ جنت کے مالک ہوں گے تو یہ افیم ان کو بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتی ہے۔ غرض ایک شدید جمود طاری ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ختم ہونے میں کتنی مدت صرف ہوگی اعلیٰ تعلیم جو روشن خیالی پیدا کر سکتی ہے وہ میسر ہی نہیں ہے اور جن کو معمولی نوشت و خواند آگئی ہے وہ عموماً چھوٹے سرمایہ داروں کی اولادیں ہیں۔ جو سرکاری ملازمتوں کے آرزومند ہیں۔ گرداور پٹواری سے لے کر تحصیل کے چپراسی تک کی ملازمت اگر مل جائے تو گویا بہت بڑی کامیابی انھیں ہو گئی۔ سیاسی خیالات کی اشاعت جو دیہاتی آبادی کو بیدار کر سکتی ہے قطعاً وہاں نہیں ہونے دی جاتی۔ سرکار کو تو غرض ہی کیا کہ وہ سیاسیات سے ان کو باخبر کرتی جہاں سے وہ سستے سے سستا سر بیچنے والا سپاہی فوج اور پولیس کے لئے بھرتی کرتی ہے لیکن اکثر ہمارے ملک کی خیرخواہی کا دم بھرنے والے ان سیاسیین نے بھی دیہات میں آزادی وطن کے خیالات کو داخل ہونے سے روکا۔ جو بیشتر سرمایہ دار تھے۔ اور ہیں۔ اور جنھیں یہ اندیشہ تھا کہ دیہات کی

آبادی سرکار کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے قبل اُن سود خوار اور اُن کا خون پینے والے ساہوکار اور زمینداروں کے خلاف عدم ادائیگی قرض ولگان نہ کر بیٹھے جو ان کو صدیوں سے کھا رہے ہیں لیکن باوجود اس عام کوشش کے کہ دیہات کو سیاسی تحریک سے اُدھر اور بے خبر رکھا جائے وہ بے خبر نہیں رہے۔ بازار، ہاٹ، تحصیل، تھانے، اور ضلع کی کچہریوں میں وہ آتے جاتے ہیں جو سنتے ہیں وہ آکر گاؤں میں سنایا جاتا ہے۔ چوپال اور چوک کے الاؤ پر یہ خبریں نہایت حیرت اور تعجب سے کہی اور سنی جاتی ہیں۔ اکثر اس پر تنقیدیں کی جاتی ہیں۔ مذاق اڑائے جاتے ہیں ریمارک کئے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔ اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ باتیں گو اس طرح روز ہوتی اور ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ گو بہت تھوڑے ہی سہی، مگر اپنے اثرات ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔ جن سے ماحول آہستہ آہستہ متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ دیہاتی شاعری بھی گو سیاسی اور خصوصاً انقلابی خیالات سے بہت کم متاثر ہوئی ہے۔ مگر پھر بھی خواہ بہت خفیف ہی سہی گر ضرور کچھ نہ کچھ اثر ڈھونڈنے سے ملتا ہے۔

دیہاتی شاعری کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ قسم جس میں کبیر اور بھیک سے اخلاقی واعظین اور روحانیت کے پرستاروں کا تتبع کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی شاعری وہ ہے جس میں پرانے مذہبی قصوں، کہانیوں، اور جدید دیہاتی ہنگاموں کے سورماؤں کی بہادریوں کو بھجنوں، گیتوں چوبولیوں اور سانگوں کا لباس پہنایا گیا ہے۔ تیسری قسم عاشقانہ شاعری کی ہے۔ لیکن اپنی زندگی اور اس کی روزانہ کشمکش، مصائب و آلام کے متعلق چونکہ انھوں نے بہت کم غور کیا ہے، اس لئے اس کا پتہ نہیں ہا بہت کم ہے۔ تاہم جدید انقلابی خیالات چونکہ محنت کش جماعتوں کی تباہی سے دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے ان میں کچھ نہ کچھ انقلابی رجحانات ضرور پائے جاتے ہیں۔ اور اگر ہم پوری طرح تجسس اور تحقیق کر سکیں تو ان رجحانات کا سراغ اس زمانے سے ملتا ہے، جبکہ جدید خیالات مغربی ممالک سے آکر ہندوستان کی شہری آبادی میں پھیلنے بھی نہ پائے تھے جیسا کہ آپ کو دلیر کے کلام کے اقتباسات سے معلوم ہوگا جو آج سے ساٹھ برس قبل کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جو میرے خیال میں دیہات کا پہلا انقلابی شاعر ہے اور وہ ضلع سہارنپور کا رہنے والا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ

اور بھی شعرا ہیں۔ جن کے کلام میں کہیں کہیں پتے کی بات مل جاتی ہے۔ دلگیر سے بھی قدیم شعرا میں سعد اللہ اور کھٹے میواتی شاعروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

زمانہ حال کے کلام میں بھی ان خیالات کا رنگ نظر آتا ہے اور بعض میں دلگیر سے بھی زیادہ گہرا۔ ایسا کلام بھی ہے جو گایا جاتا ہے۔ لوگ شوق سے سنتے ہیں۔ مگر اس کے خالق کا پتہ نہیں لگتا۔ کہ وہ کون تھا۔ ایسے اقتباس بھی آپ کو اس مضمون کے آخر میں ملیں گے۔

دیہاتی ادب اور جدید رجحانات ایک ایسا وسیع مضمون ہے جس کے لئے بہت مہلت تلاش تجسس اور غور کرنے کے لئے ملنی چاہئے تھی، جو اتفاق سے اس سطور کے راقم کو میسر نہیں آسکی ہے تاہم مجھے بڑی خوشی اس بات پر ہے کہ میں کلام دلگیر سے آپ لوگوں کو روشناس کرا رہا ہوں جو قطعاً ایک انقلابی شاعر ہے۔ اور جس نے اپنا کلام اس وقت طبع کرایا تھا، جبکہ ہندی اور اردو شعرا گل و بلبل کے فرضی عشق اور مدبھری نینوں کو سراہ رہے تھے یا پیروں، دیوی، دیوتاؤں کے خوارق عادات معجزوں کے نظم کرنے اور فرضی سورماؤں کے جھوٹے قصے منظوم کرنے میں مصروف تھے۔

کلام دلمیر کا جو مطبوعہ نسخہ مجھے ملا ہے۔ وہ نامکمل اور منتشر ہے۔ نہ شروع کے ورق ہیں اور نہ آخر کے، بیچ میں سے بھی ورق جا بہ جا ندارد ہیں۔

دلمیر کا عاشقانہ کلام بھی خالص دیہاتی رنگ لئے ہوئے ہے گو اس نے غزلیں لکھیں ہیں اور حمد و نعت سے بھی بہ رسم کہن کی تقلید میں اُسے آراستہ کیا ہے مگر یہ سب اپنے رنگ میں ہے اور اس میں کسی کا اتباع نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے حریف کو بے تکلف ایک ٹھیٹھ دیہاتی کی طرح گالی دیتا ہے۔ مثلاً مجنوں کا اور اپنا مقابلہ کرتا ہے۔

مجنوں مہارے کے اُوڑ[۱] کرے گا۔   خجلوں خجلوں تاڑا کا ڈھیٹا[۲]

سو برابّی[۳] دلمیر عشک[۴] ماہیں   ٹانگ تلے اور شاڑا کا ڈھیا

---

[۱] برابری [۲] نکال دیا، بھگا دیا [۳] دفعہ، مرتبہ [۴] عشق [۵] سالا

پنڈتوں کی غیب دانی کو فریب اور قابل سرزنش قرار دیتا ہے۔

کہدے سے پانڈے سانچی سانچ — مہلے کرم کے ریکھا کی باںچ[1]
بولا پانڈا سنو پدھان[2] — کدھی نہ آوے سانچ نے آنچ
اب کے سیر[3] کرو من کھول — بھرلو ناج سو کوٹھے پانچ
پاہڑا[4] چلو کھا۔ کھا ناج — جابڑ ہرنا بھریں کلانچ
کہے دلیر لو پانڈا جھوٹ — سر پہ مارو جوتی پانچ

جنت کی حوروں پر اردو شعراء اور اپسراؤں پر ہندی شعرا نے بہت کچھ کہا۔ انکا مذاق اڑایا ہے اور آرزوئے وصل بھی بیان کی ہے۔ مگر دیہاتی شاعر اس کے متعلق بالکل جداگانہ نظریہ پیش کرتا ہے۔

پہلے شعر میں وہ اپنی بیوی کی اس حرکت پر کہ وہ پرچھائیں دکھاکر غائب ہوجاتی ہے۔ اس کو کہتا ہے کہ کس ساسو کی یہ حور ہے۔ حور کا نام آتے ہی اس کا خیال اسے جنت کی حوروں کی طرف متوجہ کردیتا ہے۔ جن کو وہ بہشت کی بہوال کہتا ہے۔ گویا بہشت ایک گاؤں ہے۔ اور جس طرح دیہاتی کہتے ہیں کہ "اری تو کس گاؤں کی بھوڑیا ہے؟" وہ انھیں اس اصول پر بہشت کی بہوئیں کہتا ہے۔ پھر یہ خیال کہ حوروں کی تقسیم تو قیامت کے بعد عمل میں آئے گی۔ آخر کچھ نہ کچھ بہشت میں وہ کرتی ہی ہوں گی۔ اور اپنا دل بہلاتی ہوں گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ڈھول بجاتی اور رانجھا گاتی ہیں۔ پھر کہتا ہے کہ معلوم نہیں بات صحیح ہے یا جھوٹ۔ کہتے ہیں کہ اللہ میاں ان سے راضی ہیں اور حوریں اُن کے عشق میں مخمور ہیں۔ پھر وہ اس ساری کہانی کو جھوٹ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے دشمن ملاّن لوگ ہمیں دھوکہ دیتے ہیں۔ مرد حور ہے اور عورت حور ہے۔ جن کے دم سے ساری کائنات رنگین ہے۔ اصل قطعہ اس طرح ہے :۔

---

[1] تحریر، [2] پڑھ [3] چودھری، سردار [4] کاشت [5] اس طرح۔

چھائیں دیکھوں بیاجے دور ۔۔۔ نُو ساسو[1] کی کیسی جور
جور، نو۔ بہت کی ببوال ۔۔۔ نت مالک کے رہیں مجور[2]
رانجھا گادیں، ڈھول بجاویں ۔۔۔ ناچیں، کودیں کریں پھوڑ[3]
صاحب ان سوں لاجی کہئے ۔۔۔ اوہ صاحب عنک[4] میں چور
پوجارے بیری ملاں سلاں ۔۔۔ ہیں بہکادیں کہہ کہہ جور
ڈورا نارلش[5] جور سے بیتر[6] ۔۔۔ جن سے دھرتی نورم نور

پاؤلاں کے دیہہ[7] ناہیں دے
ولیراہت پانر گھور

انسانوں کی معاشی اور اقتصادی اونچ نیچ جس کو زمانے نے قسمت اور تقدیر کا کرشمہ سمجھ رکھا ہے۔ شاعر کے لئے حیران کن ہے۔ کہ اگر یہ کرشمہ قدرت ہے تو اس میں آخر کیا مصلحت ہے

کیوں کرمن کی ریکھ نیاری ۔۔۔ چیتر، بانجھ، پھوڑ جن ہاری
کور رانی کوں موتی بیگم ۔۔۔ کور منگا کی پیسن ہاری
ایکاں کے سر چیتر براجے ۔۔۔ ایکاں کے سر جوتہ کاری
کوائے راجہ کوائے پرجا ۔۔۔ کوائے داتا کوائے بھکاری
ایکاں کے گل موتن مالا ۔۔۔ ایکاں کے پایاں بیڑی بھاری
ایک سہر کی چیتر کامنی ۔۔۔ ایک گاؤں کی ٹھیٹھ گنواری
اک پہرے کمکھاب[8] کا ستنا[9] ۔۔۔ بیٹھے گھاگرہ ایک اوگھاری[10]
کوائے حاکم کوائے ٹھاکر ۔۔۔ کوائے بوئے کھیت کیاری

---

[1] ساس، خوشدامن ۔ [2] حضور [3] فتور [4] عشق [5] مانس ۔ مرد [6] عورت
[7] جسم بدن [8] کمخواب [9] پاجامہ [10] برہنہ

جاڑے ماں کوائے پٹوا اوڈھے   کینن تاپ کے رین لبھاری
کنہیں کھوائے مُرگا چاول   کاہوٹے نہ بھوسی ادھاری

مختلف مذاہب کے پرستاروں کی شیخی اور پرستش کا یہ انجام کہ "راہ خدا" میں بے وجہ ہدیہ خلقت کا برباد ہوتا ہے اس طرح بیان کرتا ہے:-

اپنے اپنے راگ گا دیں سبھی نبائے   سننے وا ترا سنے ہے جو واکے من میں لئے
کے ہندو، کے مسلماں[1] کے ہووے انگریج   سب کے سر بھروں پڑتی نبے کھودی سہائے
ایک کہے رام جی - دوجا کہے کھدا[2]   ہردوار کی پیڑیاں کوئی ڈبکی کھائے
ایک گیا نو جائے ہے ایک جا ہے اجمیر   ایک پوجے ہے پاتھرا اک گنگا جی نہائے
مندریں بندر بُڑیں[3] تکہ[4] لوٹیں ٹھگ   صاحب تیری راہ میں پرجا گا ٹھو کٹائے

بھوک کے دردناک نتائج اس طرح بیان کرتا ہے:-

بھوک سوں ماتا، جائی تج دے[5]   بھوک سوں جائی مائی تج دے
بھوک سوں باہنڑ[6] تجے باہنڑا کو   بھوک سوں بھائی، بھائی تج دے
بھوکی کامن[7] تجے کنت[8] نے   بھوکا کھسم[9] لگائی تج دے
بھوکے بھجن نہ ہوں صاحب کے   بھوکا نواج[10] پڑھائی تج دے
بھوکا کاجی[11] رہے نہ راجی   بھوکا اوگاہ[12] اوگاہی[13] تج دے
بھوکا حافج[14] کران[15] بھول جائے   بھوکا ملّاں کو کائی[16] تج دے
بھوکے پیٹ گرب[17] نا ٹھیرے   بھوکا گرب جنائی تج دے

---

[1] مسلمان [2] خدا [3] لوٹیں [4] چوری کریں [5] چھوڑدے [6] بہن [7] بیوی [8] شوہر [9] خصم [10] نماز [11] قاضی [12] گواہ [13] گواہی [14] حافظ [15] قرآن [16] اذان [17] حمل

بھوکا وکیر نسیر کئے جوڑے　　سیراں جوڑی جوڑائی تج مے

کہتا ہے کہ لالچ نے ہر جگہ گھر کر لیا ہے اور لالچی لوگوں نے ملک اجاڑ کر اس میں لالچ کو بسا دیا ہے :-

سب کے منو سمایو لوب　　سگ پر جانوں بھایو لوب
ئے بھکرئے راج کنوار　　چوڑہ سر کٹوایو لوب
لوب سے ڈوبے ساہوکار　　مول سوں بیاج سوایو لوب
لوبی لوگ اُجاڑیں دیس　　اوجڑ بگڑ بسایو لوب

کہتا ہے کہ حق اور صداقت رشوت سے شکست پا چکے ہیں :-

نہ کہیں ہم کدھی مروڑ کی ایک　　اور سانچی کہیں کروڑ کی ایک
گھونس[۱] دیتی مکدمہ[۲] جینا۔　　نیم[۳] کی لاکھ اور اکوڑ کی ایک

اس کے نزدیک روپیہ کیا قوت رکھتا ہے۔ اور وہ جو ایک کسان ہے اس سے کس قدر دور ہے :-

اوہ ہی دوکھ ٹھریا ہے　　اوہ ہی جیو جیویا ہے
ڈوبے اوہ ہی تریا ہے　　اوہ ہی ناؤ کھویا ہے
باہنڑ کوائے نہ بھیّا ہے
سب کا رام رُوپیا ہے
اوہ ہی لائے من میں لاج　　اوہ ہی کھوائے بھوکا ناج
اوہ ہی سنوارے بگڑے کاج　　اوہ ہی چھلنی اوہ ہی چھاج
باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیا ہے

---

[۱] رشوت　[۲] مقدمہ　[۳] انصاف

بنا روپیوں چلے نہ گاڑی　　　بنا روپیوں اوپجے واڑی
بنا روپیوں بوئے نہ سارّی[1]　　　بنا روپیوں سوکھیں ہاڑی[2]

باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

بنا روپیہ برہمی نہ بھالا　　　بنا روپیہ گورا نہ کالا
پیا گجھونہ[3] سوار رسالہ　　　کرچ، برچ ترزار نہ بھالا

باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

یوہی روپیہ بُرا گلام　　　یوہی روپیہ جہا حرام
یوہی روپیہ کاڈھے کام　　　یوہی روپیہ جہا حرام

باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام روپیا ہے

سب کا میت رُوپیّا ہے　　　سب کی ریت رُوپیّا ہے
سب کی پیت رُوپیّا ہے　　　سب کا گیت رُوپیّا ہے

باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

یوہی روپیہ نیم دھرم ہے　　　یوہی روپیہ لاج سرم ہے
یوہی روپیہ تم اور ہم ہے　　　یوہی روپیہ رحیم کرم ہے

باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیّا ہے

۱؎ ربیع　۲؎ ہڑی　۳؎ پیادے

موہے روپیہ سپنے آئے　　آنکھ کھولے تو چھولک جائے
سو سو ڈھب سوں من للچائے　　کدھی جاگتوں ہاتھ نہ آئے

باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیا ہے

جو دلگیر نے دے رُوپیا　　اوہ ہے واکا دھرم کا بھیا
اوہ ہے واکا کنور کنھیا　　اوہ ہے واکا کُلم[1] جِیا

باہنڑ کوائے نہ بھیا ہے
سب کا رام رُوپیا ہے

ہندوستانی کسان کی فلاکت کی تصویر کس انداز میں کھینچا ہے۔

پاؤں جوتی سر نا پاگ　　ایسے ڈوبے ہمارے بھاگ
نئے لاگے بھاگن میں سوا[2]　　مکا کی روٹی چنے کا ساگ

شاعر ایک دردناک تصویر کھینچتا ہے۔ بھوکے بچے گھر میں ماں سے لپٹ کر رو رہے ہیں۔ اور ڈیوڑھی پر شیخ جمال (ایک فقیر) اللہ کے نام پر بھیک مانگ رہا ہے۔ خدا کے متعلق یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ ایسا سخی ہے کہ وہ چیونٹی کو بھی رزق دیتا ہے۔ شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

کن داتا نے بکسا[3] مال　　مٹکی کے ماہیں چون[4] نہ دال
چھورے روئیں ماں کے نار　　ڈیوڑھی مانگیں سیکھ جمال

کسان کی زندگی ختم نہیں ہوتی بس وہ جیت گئی ہے اور وہ ہار چکا ہے۔

سگڑی عمریا بیتی سو بیتی　　ہم ہیں ہارے وہ ہی جیتی
جگ ماں آکے کے سکھ پایو　　دھرتی جوتی کھینی کھینی

---

[1] خاندان زندہ کرنے والا [2] لطف، مزا [3] بخشا [4] آٹا

کرّاں چلائے باہن[1] باہے　　سدا لکھائی[2] کو تھی رہتی[3]

جب تک فصل کی پیداوار اس کے دانت کے نیچے نہ آئے وہ اسے اپنی سمجھنے سے ڈرتا ہے :۔

ہاتھوں بڑھ کر آئی ایکھ　　اب کے بھلی کمائی ایکھ
دلوں رکھاوئیں[4] اپنا کھیت　　راتوں ہڑیں[5] پرائی ایکھ
کولہو گڑ گئے ایکھ کے ماہیں　　گھر کوں ناہیں سمائی ایکھ
اودو کبیر گنڈیری چونکھ
اب جان۔ رس پہ آئی ایکھ

ضلع میرٹھ کے رہنے والے حسنو کی کنڈلیاں مشہور ہیں۔ لیکن ہمارے مضمون سے متعلق ہمیں صرف ایک کنڈلی ملی ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ ہم (کسانوں) سے تو فقیر اچھے ہیں :۔

کبھی تو اوڑھیں شال دو شالے کبھی جو گڈری چیرن کی
کبھی جو کھائیں باسی کوسی کبھی تو تھالی کھیرن کی
حسنو کہے کھدا مرا جانے ہم سے موج پھکیرن کی

گردھر جو غالباً برج کا رہنے والا ہے۔ اپنے کو کب راے کے خطاب (شاہ شعرا) سے مخاطب دیتا ہے۔ اس میں یہ حسن ہے کہ راے کے معنی بھاٹ کے ہیں اور وہ قوم سے بھاٹ ہو خلق خدا کے فائدے کے لئے گردھر اس طرح قربانی کی تلقین کرتا ہے :۔

پانی باڈھا ناؤ میں کر گھر میں باڈھے دام
دونوں ہاتھ ا لیچئے[6] یہی سیانا کام
یہی سیانا کام نام ہر کا لیجے
پرمارتھ کے کاج سیس اپنا دیجے۔

---

[1] بنجر زمین کو نرم کرنا [2] نظر آئی [3] خالی [4] نگرانی کریں [5] چرائیں [6] انڈیلنا، پھینکنا

کہیں گردھر کب رائے یہی مردن کی بانی
جان جائے تو جائے نہ ہے آنکھوں کا پانی

گاؤں میں جو لوگ ذرا اُلکواں سا دوپٹہ باندھ کر اور سرکاری عہدے داروں سے میل بڑھا کر چودھری اور مقدم بن بیٹھتے ہیں اُن کے متعلق کہتا ہے۔

سوہی[۱] پگڑی باندھ کر ہوئے مقدم لوگ
ہوئے مقدم لوگ گلی میں رنڑ[۲] جماویں   آپ نہیں جا نڑ اور رے بلے وکوف[۳] بناویں
کہیں گردھر کب رائے مرے نہ چوہی
گاؤں کو لگ گیا روگ باندھ کر پگڑی سوہی

جھوٹ بول کر کسانوں کو لوٹنے والے زمیندار کے گاؤں سے کہتا ہے کہ "کسانوں کو چلا جانا چاہیے"۔

ٹھاکر تو جھوٹا بڑا جس کے من میں پاپ   رعیت تو بھوکن[۴] مرے چھپ کے جیمیں[۵] آپ
چھپ کے جیمیں آپ بھید کہیں نہ پھوٹے   ایسے بے ایمان بانہہ دے رعیت لوٹے
کہے گردھر کب رائے انت کو لٹھے نہ لوٹا
تج دیو وہاں کا باس[۶] جہاں کا ٹھاکر جھوٹا

مہاجن کی تول اور جھونک کی بے ایمانی اس طرح بیان کرتا ہے:۔

گھی میں سو گھی گھٹے، گھٹے دال میں دال   آٹا میں سوا آٹا گھٹے میری تیری ہوگی راڑ
مری تری ہوگی راڑ ٹکہ نا دے سے
کہیں گردھر کب رائے ارے دنیا کے کنیہ[۶]
سب جاتوں میں بدجات[۷] تری ہے بیٹی چودھنیا

---

[۱] لنگواں [۲] فساد [۳] بے وقوف [۴] کھانا کھانا [۵] گاؤں، لباپٹ
[۶] تخمینہ یا اندازہ یا جانچ کرنے والا [۷] ذات

برف اور انسان کا مقابلہ

ابھی کچھ روز ہوئے یہ خبر ساری دنیا نے حیرت سے پڑھی کہ ایک روسی ہوا باز نے قطب شمالی پر سے اُڑ کر روس سے امریکہ کا سفر کیا۔ یہ خبر دراصل اس طویل کشاکش کی ایک منزل کا پتہ دیتی ہے جو تخلیق آدم سے لے کر آج تک انسان اور اس کے ماحول میں جاری ہے۔ یہ کشاکش کہیں بہت سخت ہے، کہیں ذرا نرم، مگر تاریخ انسانیت کا بڑا حصہ ہے اسی سے عبارت کبھی انسان اپنی زندگی قایم رکھنے کے لئے مظاہر فطرت سے لڑتا اور ان پر قابو پاتا ہے، کہیں محض اپنی قوت کی آزمائش کے لئے بلا افادی وجوہ کے اس مہم کو سر کرتا ہے۔ کہیں دریاؤں کے طوفانوں کی بلا خیزی کو زمین کی زرخیزی کا ذریعہ بناتا ہے، کہیں سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنا علم وہاں نصب کرنا چاہتا ہے، کہیں اپنی ایجادوں سے زمین کی طنابیں کھینچ کر ربع مسکوں کو ایک شہر کی سی حیثیت دیدیتا ہے، پہاڑ کاٹتا ہے، سمندر پاٹتا ہے، تہ آب چلتا ہے، ہوا میں اُڑتا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ اپنی زندگی کو ترقی دینے کے سامان کرے یا کائنات پر اپنی سرداری کے احساس کو قوی کرنے کے مواقع نکالے۔ اس جہاد میں انسانیت کے وہ گروہ پیش پیش رہتے ہیں جن میں ولولہ اور امنگ ہوتی ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں، دوسرے ہم جیسے ان کے کارناموں کی خبریں پڑھتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں۔ آیئے آج اسی قسم کے ایک معرکہ کا حال سنائیں، شاید اس سے پڑھنے والوں میں بھی کچھ ولولہ پیدا ہو اور وہ انسانیت کے اس فرض کو بس دوسروں کے سر ڈالدینے پر قانع نہ رہیں، خود بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائیں۔

انسان کو قدرت کا جو منظر سب سے زیادہ تنگ کرتا ہے وہ سردی ہے اور برف۔ اس نے شمالی ملکوں کے باشندوں کی زندگی عذاب کرنا چاہی، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے

مقابلہ کرتے کرتے وہ محنت کش اور سخت کوش ہو گئے۔ اور اس کے خلاف وہ وہ حملے کئے کہ آپ یہ زچ ہے۔ شمالی ممالک کو اس برف کی وجہ سے ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے ملکوں تک جنوبی سمندروں ہی کے راستہ پہنچ سکتے ہیں۔ اس میں بڑا چکر پڑتا ہے اور بہت وقت لگتا ہے۔ اس لئے صدیوں سے ان ملکوں کے جہاز رانوں کے سامنے یہ مقصد رہا ہے کہ کسی طرح شمالی سمندروں سے ہو کر مشرقی ممالک تک پہنچ سکیں۔ امریکہ کی دریافت کے بعد سے تو برابر یہ مقصد سامنے رہا ہے کہ ایشیا تک اس شمالی راستہ سے پہنچا جائے۔ لیکن چونکہ یہ راستہ سال میں زیادہ مدت یخ بستہ رہتا ہے اس لئے اس کٹھن منزل کے طے کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا رہا ہے۔ غالباً پہلی مرتبہ ایک انگریز سر ہیو ولوبی نے اس راستہ سے چین پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ۲۰ مئی ۱۵۵۳ء کو لندن سے اپنے جہاز "ایڈورڈ بوناونچر" میں نکلے۔ لیکن مرمانسک کے قریب برف میں پھنس گئے اور ان کا جہاز، سازوسامان، سب تباہ ہوا اور انہوں نے خود بھی اس مہم میں اپنی جان ہاری۔

اس ناکامی نے ہمتیں پست کر دیں۔ اور مدت تک کسی نے پھر اس مہم کو سر کرنے کا خیال نہ کیا۔ مگر آدمی یونہی مستقل طور پر ہار مان لیا کرے تو ترقی کیسے کرے۔ کوئی ۳۲۶ سال بعد یعنی ۱۸۷۸ء میں سویڈن کے ایک جہاز راں، نارڈنسکیولڈ نامی نے یہ سفر کر ہی ڈالا۔ یہ گوتھن برگ سے اپنے جہاز "ویگا" میں روانہ ہوا اور ۱۲½ مہینہ میں آبنائے بیرنگ پہنچا۔ اس نے ایک مرتبہ راستہ میں اپنا جہاز برف میں جم جانے دیا اور پھر جب گرمی میں برف پگھلی تو آگے بڑھا۔ یہی طریقہ اس کے بعد کئی جہاز رانوں نے اختیار کیا، اور ایک سردی برف میں گزار کر منزل مقصود کو پہنچے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک گرم موسم میں پورا سفر طے نہ کر سکا، نہ وِٹ کِتسکی، نہ ٹول، نہ نانسن، نہ امنڈسن۔

۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ ایک روسی برف شکن جہاز "سبریاکو" نے پروفیسر آٹو شمٹ کی کپتانی میں ارخنجلسک سے ولاڈی وسٹاک کا سفر ایک ہی موسم میں طے کیا۔ یہ ۲۸ جولائی کو چلے تھے

اور پہلی اکتوبر کو اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں ولاڈی وسٹاک سے چل کر مغرب کی طرف مرمانسک تک کا سفر ۱۹۳۴ء میں ایک دوسرے برف شکن جہاز "لیوٹکے" نے ۸۳ دن میں پورا کیا۔

ان دونوں کامیاب سفروں کے بعد سے روس کے حوصلہ مند جہاز راں اس فکر میں ہیں کہ اس برفستانی سمندر میں آمد و رفت کا مستقل اور باضابطہ سلسلہ قایم کردیں اور یوں گویا مشرق سے تعلق کے باب میں قدرتی جغرافیہ کی "تصحیح" کردیں۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں ان کے دو جہازوں نے جو معمولی مال کے جہازوں سے بہت ہی کم مختلف تھے ایک ہی گرم موسم میں آمد و رفت کے دونوں سفر انجام بھی دیئے۔ ان کے ساتھ جو برف شکن جہاز تیار رکھے گئے تھے ان سے برائے نام ہی کام لینا پڑا۔ یہ چاروں جہاز خوب لدے ہوئے تھے، ہر ایک میں دو دو ہزار ٹن سے زیادہ وزن کا مال بھی تھا اور بہت سے مسافر بھی۔

اس راستہ کو مستقل بنانے کا کام ۱۹۳۲ء سے پروفیسر اشمٹ اور پروفیسر سمولیکووچ کے زیر نگرانی انجام پا رہا ہے، پہلے یہ ایک کمیٹی کے افسر تھے اب ایک مستقل قومی وزارت ان کے سپرد ہے، جس کی نگرانی میں کوئی ۲۰ ہزار کلومیٹر لمبا شمالی ساحل ہے، اس کے قریب قریب کے تمام جزیرے ہیں اور مشرقی سائبیریا کا وہ تمام حصہ جو عرض البلد کے شمال میں ہے۔ یعنی ان ماہروں کے سپرد وہ سارا علاقہ ہے جو برف سے چھین کر انسان کو دلانا ہے۔ روسی حکومت نے ماہروں کو صرف وزارت کی خشک عزت ہی نہیں بخشی ہے بلکہ ان کے کام کی تکمیل کے لئے وسائل بھی دے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ان کو نصف ارب روبل خرچ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

اس اہتمام اور اس صرف کثیر کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ روس کی بلا روک ٹوک رسائی کسی ایسے سمندر تک نہیں ہے جو عالمی تجارت کی شاہراہ ہو۔ روس دو سو سال سے اس کی فکر میں ہے، پر کوئی تدبیر راست نہیں پڑتی۔ اب اس نے اسی لئے اس صحرائے برف کو سر کرنے کی ٹھانی ہے۔ دوسری وجہ فوجی ضرورت ہے۔ یاد ہوگا کہ ۱۹۰۴-۵ء کی روس جاپان

والی جنگ میں روسی بیڑہ احتیاطاً نہر سویز میں سے نہیں گذرنا چاہتا تھا تو اسے سارے افریقہ کیا تقریباً ساری دنیا کا چکر کاٹ کر اپنے حریف کے مقابلہ کے لئے آنا پڑا تھا اگر یہ بیڑہ موقع جنگ پر جلد پہنچ سکتا تو کیا عجب ہے کہ جنگ کا رنگ ہی پلٹ جاتا۔ آج پھر روس و جاپان کے تعلقات کچھ بہت شگفتہ نہیں ہیں۔ کوئی ذرا سا واقعہ بھی ان میں ان بن کرا دینے کو بہت ہے۔ اور منچوریا پر عملاً قبضہ کرنے کے بعد سے تو روس کو بڑا ڈر یہ ہے کہ جاپان جب چاہے آسانی

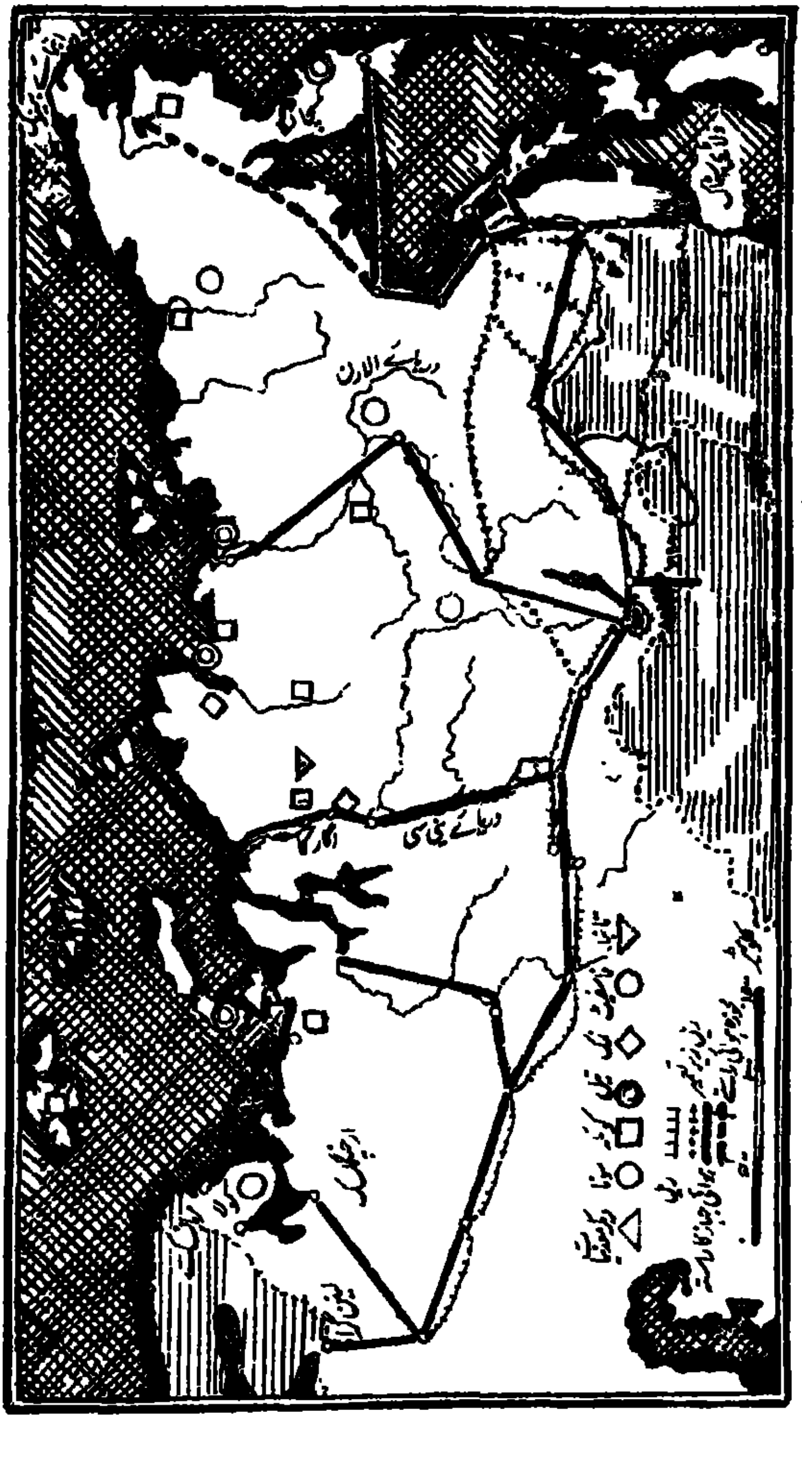


سے ماسکو اور بحر الکاہل کے تعلق کو توڑ دے سکتا ہے۔ اس لئے مشرقی سائبیریا اور بحر الکاہل کے روسی ساحل کی حفاظت کے لئے یہ شمالی بحری راستہ بہت ہی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے بیڑے کو آسانی سے مشرق کی طرف بھیج سکنے ہی کی خاطر روسیوں نے سنہ ء سے سنہ ء تک کی دو سالہ شدید کوشش سے بالٹک اور بحر ابیض کو ملانے کے لئے ایک نہر تعمیر کی ہے۔ اس نہر کے لئے پہلے تو انھوں نے جھیل لڈوگا اور

جھیل اونیگا کو ملایا اور پھر اونیگا کے شمال میں سمندر سے جا ملایا۔ اس نہر کے بننے سے یہ ہوا کہ لین گراڈ سے آرچینجلسک کا راستہ جہاں پہلے ۲۸۴۰ میل تھا اب کل ۴۶۰ میل رہ گیا ہے۔ اس نہر سے ایک تو شمالی علاقہ کے جنگلوں کی لکڑی کو یورپ کی منڈیوں تک پہنچانے میں سہولت ہوگی دوسرے اس کی گہرائی اور چوڑائی ایسی رکھی گئی ہے کہ اوسط درجہ کے جنگی جہاز اور خصوصاً آبدوز کشتیاں اس میں سے گذر سکینگی۔



اس شمالی راستہ کے کھل جانے سے روس کی معیشت ایک ایسے وسیع رقبہ سے استفادہ کریگی جو ابتک عملاً مردہ پڑا تھا۔ اس لئے کہ اس علاقہ میں صرف پوستین کے لئے برفستانی جانوروں کے چمڑے، یا مچھلی کے تیل اور لکڑی ہی کی پیداوار کا سامان نہیں ہے بلکہ جدید تحقیقات کی رو سے کوئی ۲۲۸ مقامات پر معدنی ذخیرے مل سکتے ہیں، کوئی ۴۰ جگہ تو کوئلہ ہے، پھر تیل بھی ہے اور سونا بھی، سیسہ بھی اور تانبا بھی، ٹین بھی جست بھی۔

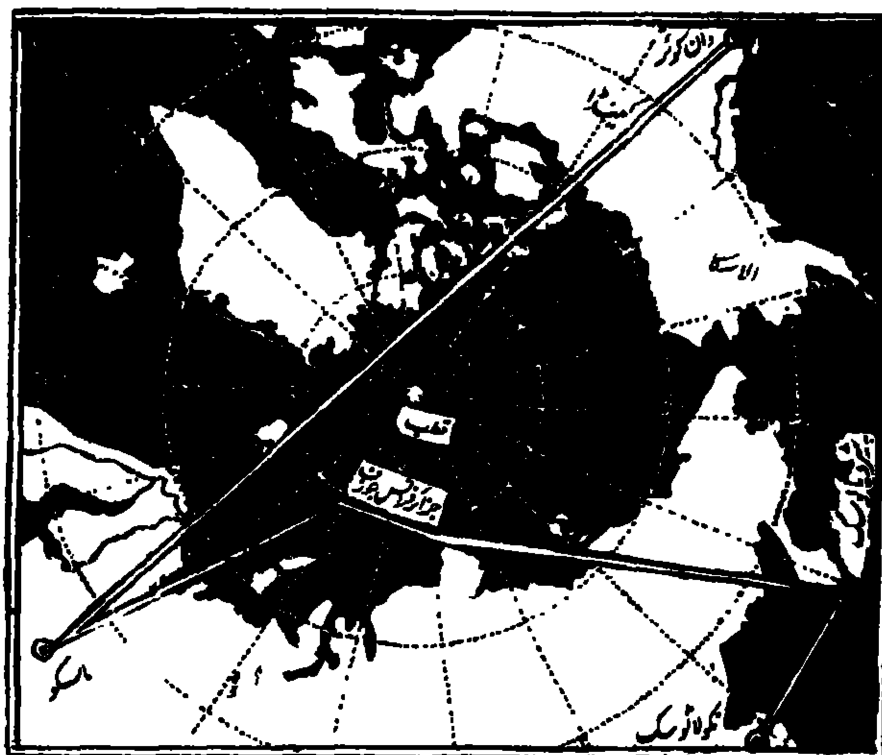


اس شمالی جہاز رانی کے لئے اسی علاقہ میں کوئلہ کا ملنا بہت سازگار ہوگا۔ متعدد مقامات پر کوئلہ کی کانوں کا کام چالو بھی ہے۔ جزیرہ نمائے کولا میں نہایت قیمتی فاسفیٹ نکلے جا رہے ہیں۔ نورلسک کے قریب تانبے کے ذخیرہ کا اندازہ کوئی پونے دو لاکھ ٹن کیا گیا ہے۔ بعض جگہ سونا بھی نکالا جانے لگا ہے۔ دریائے وِٹم کے علاقہ میں سونا کوئی دس پندرہ سال سے نکل رہا ہے۔ اب دریائے آلدان کی وادی میں اس کا کام شروع ہو رہا ہے، یہاں ۲۳ء میں کل ۴۰۰ آدمی بستے تھے، آج ۵۰ ہزار کی آبادی ہے!

اس علاقہ کے اہم مقامات میں آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ بندرگاہ اِگارکا جو دریائے ینیسی کے چوڑے دہانے پہ واقع ہے کس تیزی سے بڑھا ہے۔ ابھی ۲۸ء میں اس ویران مقام میں ۴۴ آدمی بستے تھے، شاید اس لئے کہ آدمی بالکل نہ ہوں تو مقام پر ویرانی کا اطلاق نہ ہو پائے۔ اب گرمی کے زمانہ میں یہاں ۲۰ ہزار کی آبادی ہو جاتی ہے۔ پچھلی گرمی میں یورپ سے ۲۸ جہاز یہاں آئے۔ یہاں سے زیادہ تر لکڑی لد کر جاتی ہے۔ ۳۰ء میں کوئی ۶ ہزار ٹن لکڑی گئی تھی، ۳۵ء میں کوئی سوا لاکھ ٹن! روسی حکومت نے اس علاقہ میں ریڈیو کے مرکز قائم کر دئے ہیں، ہوائی جہازوں کا وافر انتظام ہے، اور برف شکن جہاز بھی وقت ضرورت مدد کے لئے مستعد رہتے ہیں اور ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ لندن سے اِگارکا تک کا فاصلہ بلا کسی دقت کے ۱۸-۲۰ دن میں طے ہو جاتا ہے۔

اب شمالی ساحل پر اور اس کے قریب کے جزیروں میں روس نے ۷۰ ریڈیو کے مرکز قائم کر رکھے ہیں۔ ان میں سے ۴۰ پورے سال بھر کام کرنے والے مرکز ہیں۔ پھر قطبی تحقیق کے مرکز ہیں جن کے ساتھ ہوائی جہاز بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ مرکز موسم کے تغیرات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور جہازوں کے کپتانوں کو برابر اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ انھیں کس طرف سے راستہ صاف ملیگا۔ ہوائی جہازوں کے ذریعہ ان مرکزوں کا تعلق ملک سے قائم رہتا ہے اور رسد پہنچتی رہتی ہے۔ اور اس برفانی علاقہ میں اڑنے کا تجربہ روس والوں نے اپنے ہوا بازوں کی ایک فوج کو فراہم کر دیا ہے۔

۳۶ء کے ختم تک ۲۷۰۰۰ کلومیٹر کے ہوائی راستوں کی ترتیب کا تہیہ ہے۔ ماسکو سے ولاڈی وسٹاک کو جو ہوائی سروس ہے اس سے متعدد شاخیں اور نکالی گئی ہیں۔ لیکن روسی ہوابازوں کے پیش نظر جو سب سے بڑا مرحلہ مدت سے رہا ہے وہ یہ کہ کسی طرح قطب شمالی کے اوپر سے اڑکر امریکہ پہنچا جائے۔ مارچ ۳۶ء میں ایک دلیر روسی ہواباز نے ماسکو سے فرانس جوزف جزیرہ تک کا فاصلہ ۲۴ گھنٹہ میں طے کر لیا تھا۔ مگر خیال تھا کہ چند سال میں یہ لوگ اڑکر امریکہ پہنچ جایا کریں گے۔ مگر حوصلہ مند ہوابازوں کے لئے یہ انتظار کٹھن تھا۔ چنانچہ چند مہینہ بعد پچھلے ۲۰ جون میں ایک ہواباز روس سے امریکہ اڑکر پہنچ ہی گیا۔ اب یقین ہے کہ چند سال میں ہوائی سفر کا یہ راستہ عام ہو جائے گا۔ انسان اپنی کوشش سے زمین کی طنابیں کس طرح کھینچ رہا ہے!



عہدِ حاضر کا فلسفہ

ادھر قرونِ وسطیٰ کا خاتمہ ہوا اور ادھر فلسفہ پر تیزی سے عمرانی اور سیاسی رنگ چڑھنے لگا۔ ولیم اوکم جیسا جید فلسفی قیصر کے دربار میں ایک تنخواہ یاب ملازم تھا اور اس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ پاپائے روم کے خلاف مضامین اور رسائل تصنیف کرے۔ ان دنوں بہت سے تیز و تند مسئلے اربابِ کلیسا کے باہمی اختلافات سے وابستہ تھے۔ چنانچہ سترھویں صدی میں فلسفے کو جو فروغ نصیب ہوا وہ کم و بیش کاتھولکی کلیسا کی سیاسی مخالفت ہی کا نتیجہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ مالبرانش ایک پادری تھا۔ مگر پادریوں کو اب تک یہ اجازت نہیں کہ وہ اس کے فلسفے کو تسلیم کریں۔ اٹھارھویں صدی میں لاک کے جو معتقد فرانس میں، اور انیسویں صدی میں بینتھم کے جو پیرو انگلستان میں گذرے، وہ سب کے سب سیاسیات میں انتہا پسند لبرل تھے۔ اور موجودہ لبرل نظریات کی تشکیل انہیں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن ہم جوں جوں آگے بڑھتے جائیں، فلسفیانہ اور سیاسی عقائد کا یہ لزوم ہمیں ٹوٹتا نظر آئے گا۔ ہیوم اگرچہ فلسفے میں انتہا کا آزاد خیال تھا مگر سیاسیات میں اسی حد تک شاہ پرست تھا۔ روس (جس پر عہدِ انقلاب تک قرونِ وسطیٰ کی کیفیت طاری رہی)، البتہ ایک ایسی سرزمین ہے جہاں فلسفہ اور سیاسیات کا باہمی تعلق اور ممالک کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ سُرخ پوش مادہ پرست ہیں اور سفید پوش مین پرست۔ تبت میں یہ تعلق اور بھی زیادہ گہرا ہے۔ دربار کا دوسرا اعلیٰ افسر فلسفی ہوا کرتا ہے۔ اور فلسفے کی یہ ایک ایسی بڑی عزت ہے جس کی نظیر دوسری جگہ ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

بیسویں صدی میں نظری فلسفہ تین مذاہب میں بٹ گیا

۱۔ پہلا مذہب ان فلسفیوں کا ہے جو مقبول عام المانی فلسفے کے حامی ہیں۔ یعنی جن کا مرجع اکثر و بیشتر کانٹ اور کمتر ہیگل کی ذات ہے۔

۲۔ دوسرا مذہب نتائجین[لہ] اور برگسان کا ہے

لہ نوٹ صفحہ ۶۲۲ پر ملاحظہ فرمائیے

۳۔ تیسرا ان مفکرین کا جو مختلف فلسفوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ فلسفہ نہ کوئی خاص قسم کی صداقت رکھتا ہے۔ اور نہ اس صداقت کے حاصل کرنے کا کوئی خاص اسلوب۔ سہولتِ تفہیم کی خاطر ان اصحاب کو موجودئین کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر یہ اصطلاح پوری پوری صادق نہیں آتی۔ ان مختلف مذاہب کی حدود کچھ زیادہ سختی کے ساتھ معین نہیں ہیں۔ افراد وقت واحد میں مختلف مذہبوں کو مانتے اور مان سکتے ہیں۔ چنانچہ ولیم جیمس کو موجودیت اور نتائجیت دونوں کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر رائٹ ہیڈ کی تازہ ترین تصنیفات میں برگسانی مابعد الطبیعیات کی حمایت موجودیاتی طریقوں سے کی گئی ہے۔ اکثر فلسفی باوجود قوت استدلال کی کافی نمائش کے آئن شٹائن کے عقائد کی نسبت یہ حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ وہ کانٹ کی زمانی اور مکانی موضوعیت کی بنیاد حکمیات کی سرزمین پر استوار کرتے ہیں۔ اس طرح مذاہبِ فلسفہ کا حقیقی فرق اُن کے منطقی فرق کے مقابلے میں بہت کم واضح اور نمایاں ہے۔ لیکن منطقی فرق بہت مفید ہوتے ہیں کیوں کہ ان سے آراء کی تبویب میں مدد ملتی ہے

بیسویں صدی میں المانی تصوریت صرف دفاعی پہلو اختیار کئے ہوئے ہے کیونکہ ایسی نئی کتابیں ہر سال دھڑا دھڑ شائع ہوتی چلی جاتی ہیں جنھیں پروفیسروں نے تو نہیں البتہ دوسروں نے ضرور اہم تسلیم کیا ہے اور جنھوں نے متعدد نئے مذاہب کی بنیاد ڈالی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص "مطبوعاتِ جدیدہ" کے تبصروں سے اندازہ لگانا چاہے تو وہ بھی خیال کرے گا کہ میدان انھیں نئے مذاہب کے ہاتھ ہے مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ اگر امریکہ کی واحد مثال کو نظر انداز کر دیا جائے تو جرمنی، فرانس اور برطانیہ عظمیٰ میں فلسفے کے بہت سے معلم اب بھی ایسے ہیں جو دل و جان سے مستند المانی روایات کے حامی ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نوجوان اس جماعت میں شامل ہو جائے تو اسے ان ممالک میں پروفیسری کا عہدہ

(نوٹ صفحہ ۶۲۷، نتائجی ترجمہ ہے۔ (Pragmotist) کا جس سے وہ فلسفی مراد ہے جو سائنس فکر اور حوادث کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے یعنی ان کی صداقت یا قیمت کو وہ اس معیار پر پرکھتا ہے کہ وہ انسانی اغراض اور اعمال پر کیا اثر ڈالتے ہیں۔

حاصل کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی۔ البتہ شاہل نہ ہونے کی صورت میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان معاملات کے مخالفین کہتے ہیں کہ ان میں خرابی یہ ہے کہ وہ سرتاسر المانی ہیں اور ایک لحاظ سے بھی بجیم پر فکرکشی کی ذمہ دار ہیں۔[1] لیکن ان کے حامی اتنے ممتاز اور جلیل القدر ہیں کہ یہ اعتراض پنپنے نہیں پاتا۔ انہیں میں ایمیل بوترو اور برنارڈ بوسینکے کا بھی شمار ہے۔ جنہوں نے مرتے دم تک بین الاقوامی کانگریس میں فرانسیسی اور برطانوی فلسفے کی نمائندگی کی ہے۔ بے دینی اور انقلاب کے مقابلے میں مذہب اور قدامت پرستی کی حمایت اسی طریق فلسفہ کے حصے میں آئی ہے کیونکہ مذہب اور قدامت پرستی میں جہاں دیرینہ روایات کی ایک قوت ہے۔ وہیں نئے خیالات کے فقدان کی بڑی کمزوری بھی ہے

انگریزی بولنے والے ملکوں میں اس مذہب فلسفہ کی پیروی کا آغاز بیسوی صدی کی ابتدا سے کچھ پہلے ہوا۔ میں نے ۱۸۹۳ء میں فلسفے کا سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا اور یہ وہ سال تھا جب کہ بریڈلے کی مشہور کتاب "شہود و حقیقت" زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ بریڈلے ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے انگلستان میں المانی فلسفے کو مقبول عام بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کا امتیاز یہ تھا کہ وہ اپنے پیش روؤں کی لکیر کا فقیر نہ تھا۔ اس کی دو تصنیفوں یعنی منطق اور شہود و حقیقت نے مجھ پر اور علیٰ ہذا میرے اکثر ہم عصروں پر گہرا اثر ڈالا اور اگرچہ میں اب ان کتابوں کے خیالات سے متفق نہیں ہوں لیکن پھر بھی انہیں نہایت احترام کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔

ہیگل کے فلسفے کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ حقیقی دنیا کے متعلق اگر ہم کو کچھ علم ہو سکتا ہے تو صرف منطق ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ بریڈلے بھی اس کا قائل ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ظاہری دنیا بالذات متناقض اور اس لئے محض فریب نظر ہے۔ اور حقیقی دنیا چونکہ از روئے منطق غیر متناقض ہے اس لئے اس میں حیرت انگیز خواص پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ زماں اور مکاں دونوں کے

---

[1] جارج سنتایانا۔ المانی فلسفے میں خودستائی۔ مصنف

مادراء ہے۔ اس میں ایک دوسرے سے علاقہ رکھنے والی متنوع چیزیں موجود نہیں ہیں۔ اسے ذوات کا اختلاف گوارا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ موضوع اور معروض کی تفریق بھی منظور نہیں ہے۔ حالانکہ علم میں یہ فرق لازمی طور پر متضمن اور موجود ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا صرف وجود مطلق پر مشتمل ہے جو فکر یا ارادے سے نہیں بلکہ احساس سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہماری تحت القمری دنیا یکسر فریب اور تمام تر التباس ہے۔ اور اس میں آئے دن جو باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں یا ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ حقیقتاً غیر اہم ہیں۔ ایک ایسا عقیدہ لازماً قاطع اخلاق ہونا چاہئے۔ لیکن ایک تو اخلاق کا تعلق طبائع سے ہے، اور دوسرے وہ منطق کا پابند نہیں ہے۔ پیروان ہیگل کا بنیادی اخلاقی اصول یہ ہے کہ ہمیں اپنے کردار کی بنا اس عقیدے پر رکھنی چاہیے کہ ہیگل کا فلسفہ برحق ہے مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر وہ برحق ہو تو ہمارے کردار کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

اس فلسفے پر دو جانب سے حملے ہوئے۔ ایک جانب تو منطقی تھے جنہوں نے ہیگل کے مغالطات کی دھجیاں اڑا دیں اور یہ ثابت کر دکھایا کہ تعینات اور کثرت، امکان اور زمان حقیقت میں بالذات متناقض نہیں ہیں۔ اور دوسری جانب وہ لوگ تھے جنہیں منطق کی پیدا کردہ دنیا کی ترتیب اور تنظیم ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان کے سرخیل ولیم جیمس اور برگساں تھے۔ ان حملوں میں صرف فروعی اختلاف تھا۔ کوئی منطقی تناقض نہ تھا۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف ضرور تھے کیونکہ علم کی مختلف قسموں کی پیداوار تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور فرق ان میں یہ بھی تھا کہ ان میں سے ایک یکسر علمی تھا اور دوسرا تمام تر انسانی۔ علمی تنقید کا استدلال یہ تھا کہ ہیگل کا فلسفہ باطل ہے اور انسانی تنقید کا یہ کہ وہ ناپسندیدہ ہے۔ کامیابی قدرتاً ثانی الذکر کی قسمت میں تھی جو اسے حاصل ہو کر رہی۔

انگریزی بولنے والی دنیا میں ولیم جیمس پہلا شخص ہے جس نے المانی تصوریت کو بُری طرح پچھاڑا۔ لیکن یہاں ولیم جیمس نفسیات کا امام اور اصول نفسیات کا مصنف نہیں۔ بلکہ فلسفے کا استاد جس کے خیالات چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں دنیا کے روبرو اس کی زندگی کے آخری سالوں میں اور اس کی وفات

کی وفات کے بعد اس کے مضامین کے اس مجموعے میں دوبارہ شامل کیا گیا۔ جس کا نام بنیادی تجربیت[۱] ہے۔ اس میں وہ اپنے طبعی میلان کو غیر معمولی دلآویز پیرائے میں یوں بیان کرتا ہے :-

"مجموعی حیثیت سے ہم چونکہ متشکّکین نہیں ہیں اس لئے نہایت آزادی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے مختلف عقیدوں کے محرکات کیا ہیں۔ چنانچہ مجھے اپنے عقیدے کا کھلے دل سے اعتراف ہی کیونکہ یہ معلوم ہے کہ سب عقیدوں کے محرکات اصل میں جمالیاتی ہیں۔ منطقی نہیں ہیں۔ کائنات کا یہ تصور کہ وہ کامل ہے۔ اور مکان کی پوری وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ایسا تصور ہے جس سے میرا دم الٹنے لگتا ہے۔ کیونکہ اس کا وجوب جس میں امکانات کو کوئی دخل نہیں اور اس کی وہ اضافات جن کے نہ مضاف ہیں اور نہ مضاف الیہ مجھے یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ گویا میں نے ایک ایسے عہد نامے پر دستخط کئے ہیں جس پر محفوظ حقوق کی کوئی دفعہ نہیں یا میں ایک ایسے وسیع دارالاقامہ میں رہتا ہوں جو سمندر کے کنارے واقع ہے اور جس میں کوئی ایسی علیحدہ خوابگاہ نہیں کہ بوقت ضرورت سماج کی سورشوں سے اس میں پناہ لی جا سکے۔ علاوہ اس کے اس میں فریسی اور گنہ گار کے پرانے جھگڑے کو بھی کچھ دخل ہے۔ شخصی طور پر اگرچہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ہیگل کے سب پیرو برخود غلط ناصح نہیں ہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ سب برخود غلط ناصح آگے چل کر ہیگل کے پیرو بن جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی میت کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے غلطی سے دو پادریوں کو بلایا گیا۔ ان میں سے ایک نے جو ذرا پہلے پہنچا تھا اتنا ہی کہا تھا کہ "میں حشر اور حیات ہوں" کہ دوسرا آیا اور کہنے لگا کہ "میں خود حشر اور حیات ہوں"۔ کامل فلسفہ ہم میں سے بہتوں کو اس دوسرے پادری کی یاد دلاتا ہے۔ کیونکہ کائنات کی طرح وہ بھی کمال کا مدعی ہے ...."

مجھے یقین ہے کہ ولیم جیمس کے سوا کسی دوسرے کو یہ کبھی نہیں سوجھی کہ ہیگل کے فلسفے کو ایک ایسے دارالاقامہ سے تشبیہ دے جو سمندر کے کنارے واقع ہے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں اس مضمون کا شمہ برابر اثر نہ ہوا کیوں کہ یہ زمانہ فلسفۂ ہیگل کے شباب کا تھا۔ اور فلسفیوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان

[۱] مرتبہ رالف بارٹن پیری ص ۲۷۶ تا ۲۷۸ - مترجم

کی طبائع ان کی آثار میں میں کتنا دخل رکھتی ہیں سنہ ۱۹۱۲ء میں جب معرکۃ الآرا مقالہ شائع ہوا تو فضا بدل چکی تھی اس تبدیلی کے اسباب کئی تھے جن میں سے ایک ولیم جیمس کا وہ اثر بھی تھا جو اس کے تلامذہ پر مترتب ہوا۔ یوں تو شخصی طور پر اسے کما حقہٗ جاننے اور سمجھنے کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا۔ لیکن اس کی تحریرات کے مطالعے سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ اس کی فطرت کے ترکیبی عناصر تین ہیں۔ اور انھیں سے اس کے نادیۂ نظر کی تشکیل بھی عمل میں آئی ہے:۔

(۱) پہلا عنصر وظائف اعضا اور طب کی تعلیم کا ہے جس نے آگے چل کر نہایت بلند پایہ اور معدود رس نتائج پیدا کئے۔ چنانچہ فلاطون، ارسطو، اور ہیگل کے خوشہ چین ادیب فلسفیوں کے مقابلے میں جو ایک سائنٹیفک اور خفیف سا مادی میلان اس میں پیدا ہو گیا تھا وہ اسی تعلیم کی بدولت تھا۔ اس عنصر کا رنگ اس کی تصنیف "نفسیات" میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ البتہ جہاں ایسے دو مفروضات میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا پڑا۔ وہاں یہ رنگ ضرور پھیکا پڑ گیا۔ چنانچہ اختیار کی بحث انھیں مستثنیات کی ایک مثال ہے۔

(۲) دوسرا عنصر متصوفانہ اور مذہبی میلان کا ہے جو اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا اور جس میں وہ اپنے بھائی کا شریک تھا۔ اس کا رنگ ایک تو اس کی کتاب "عزم للیقین" میں گہرے طور پر جھلک رہا ہے اور دوسرے اس کی دلچسپی میں جو اسے روحانیت کی تفتیش سے تھی۔ اور

(۳) تیسرا عنصر یہ ہے کہ اس نے امریکی ضمیر کے پورے جوش اور خلوص سے کام لے کر اپنی طبیعت کی اس نزاکت کو جس میں بھی وہ اپنے بھائی کا شریک تھا جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی، اور اس کے عوض والٹ وہٹمین کا عمومیت پسندانہ رنگ پیدا کرنے کی سر توڑ کوشش کی ہے۔ اس کی طبیعت کی نزاکت اوپر کی محولہ عبارت سے بخوبی روشن ہے کیوں کہ اس میں ایک ایسے دار الاقامہ سے اس نے اپنی بیزاری کا اعلان کیا ہے جس میں کوئی علیحدہ خواب گاہ نہیں۔ (حالانکہ یہ چیز وہٹمین کو بہت پسند آتی) اور اس کے عمومیت پسند ہونے کا ثبوت اس کے اس دعوے سے ملتا ہے کہ وہ گنہ گار ہے۔ فریسی نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اس سے مدت العمر میں اتنے گناہ سرزد ہوئے ہوں گے کہ دوسرا انسان اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس مقام پر اس کا وہ شرمیلا پن جو اس کی عادت میں داخل تھا۔ ہاتھ سے جاتا رہا۔

بہترین انسانوں کا حقیقی شرف عموماً ایسی صفات کے اجتماع کا نتیجہ ہوتا ہے جنھیں ایک دوسرے کے بالکل نقیض فرض کیا جاتا ہے۔ جیمس کا بھی حال یہی تھا۔ چنانچہ اس کے ہم عصروں نے اس کی اہمیت کا کبھی پورے طور پر اندازہ نہیں کیا۔ اور جو اندازہ کیا اس سے وہ کئی درجے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے مذہبی امیدوں کو سائنس کے نظریات کی حیثیت دینے کے لئے نتائجیت کی وکالت کی اور مادہ و ذہن کے قدیم تضاد کو مٹانے کے لئے یہ انقلابی نظریہ ایجاد کیا کہ شعور کوئی چیز نہیں۔ اس کے فلسفے کے یہ دو حصے ہیں جن میں سے ہر ایک کے مؤید الگ الگ ہیں۔ شلر اور برگسان پہلے حصے کے حامی ہیں اور نووجودیین دوسرے کے مشہور آدمیوں میں صرف ڈیوی ایک ایسا شخص ہے جو جیمس کا پورا پورا یار شاطر اور رفیقِ سفر ہے۔ ان دونوں حصوں میں ہر اعتبار سے چونکہ زبردست فرق ہے اس لئے ان پر جداگانہ غور اور فکر کی ضرورت ہے۔

جیمس کی کتاب "عزم للیقین" کا سالِ تصنیف ۱۸۹۶ء ہے۔ اس کی دوسری کتاب "نتائجیت" ۱۹۰۷ء میں چھپی۔ شلر کی تصنیف "انسانیت" اور ڈیوی کی تصنیف "منطقی نظریہ پر چند خیالات" ۱۹۰۳ء میں طبع اور شائع ہوئیں۔ غرض بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں فلسفیانہ دنیا کی تمام تر توجہ نتائجیت کی طرف مبذول تھی۔ اسی زمانے میں برگسان نے اپنے فلسفے کا صور نہایت بلند آہنگی سے پھونکا اور دنیا کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ لیکن اس کے فلسفے میں بھی نتائجی رنگ نتائجیت سے زیادہ رچا ہوا ہے۔ نتائجیت کے بانی تین ہیں:

(۱) ولیم جیمس (۲) ایف سی ایس شلر (۳) جان ڈیوی

یہ تینوں اگرچہ ایک ہی مذہب کے علمبردار ہیں لیکن آپس میں زبردست اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے پہلا نتائجیت کے مذہبی پہلو کی وکالت کرتا ہے، دوسرا ادبی پہلو کی اور تیسرا علمی پہلو کی۔ اس میں شک نہیں کہ ولیم جیمس ایک جامع الحیثیات شخص تھا، مگر یہ اس کی مذہبیت تھی جس نے نتائجیت میں اپنے لئے ایک راہِ اظہار ڈھونڈھ نکالی۔ لیکن ان اختلافوں کی تفصیل کا یہ محل نہیں بلکہ برعکس اس کے ہمارے مقصد کے لئے مفید امر یہ ہے کہ ہم ان کو نظر انداز کر دیں اور اصل عقیدے کی طرف متوجہ ہوں۔

نتائجیت ایک قسم کی متشکیکیت پر مبنی ہے۔ معادیئ فلسفے کا دعویٰ تھا کہ وہ مذہب کے اساسی

عقائد کو بہ دلائل صحیح ثابت کر سکتا ہے اس کے مخالفین کہتے تھے کہ وہ اُن کی تردید کر سکتے ہیں۔ یا کم از کم اسپنسر کی طرح یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انھیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن لوگوں نے پھر بھی یہ محسوس کیا کہ اگر انھیں ثابت نہیں کیا جا سکتا تو ان کی تردید بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہی حال ان عقیدوں کا ہے جنھیں اسپنسر جیسے لوگوں نے مسلّم قرار دیا ہے۔ کسی علّت و معلول کا قضیہ، قانون کا تسلسل، حافظے کا عموماً قابل اعتماد ہونا، استقرار کی صحت وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان کو کسی خالص عقلی نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو نتیجہ سوئے لا ادریت کے اور کچھ بر آمد نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ان پر جتنا بھی غور کیا جائے یہی معلوم ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر نہ ثابت ہو سکتے ہیں اور نہ جھٹلائے جا سکتے ہیں۔ بنا بریں جیمس کا استدلال اس بارے میں یہ تھا کہ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو عملی انسانوں کی طرح ان امور پر کبھی شک و شبہ نہیں کرنا چاہئے جس غذا نے کل تک ہماری پرورش کی ہے اس کے متعلق یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ آج ہمارے لئے زہر نہیں بن جائے گی۔ بعض اوقات ہم غلطی کر گذرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ لہٰذا یقین کا معیار یہ نہیں کہ وہ حقیقت سے کتنا مطابق ہے (کیونکہ حقیقت تک ہماری رسائی کبھی ہوتی نہیں) بلکہ یہ ہے کہ وہ ہماری حیات کو بڑھانے اور خواہشات کو پورا کرنے کی کتنی اہلیت اپنے میں رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مذہبی یقینیات اکثر و بیشتر اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ اور بدیں وجہ حقیقی کہلانے کے مستحق ہیں۔ جیمس نے اپنی تصنیف "مذہبی واردات کے تنوعات" میں شروع سے آخر تک یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی بنا پر یہ کہتا ہے کہ سائنس کے جملہ مسلّمہ نظریے حقیقی کہے جا سکتے ہیں کیوں کہ وہ "چلتے" ہیں حق کی تعریف یہی ہے اور ہمیں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ علم نہیں۔

اس نظریے کا انطباق اگر سائنس اور مذہب کے عام مفروضات پر کیا جائے تو بحث و تمحیص کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ لیکن اگر نتائجیین "چلنے" کے مفہوم کو ذرا احتیاط سے ظاہر کریں اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دیں کہ سائنس اور مذہب کے عام مفروضات میں ہمیں واقعتہً حق کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ تو پھر رد و قدح کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن ہم کیوں نہ ایسی معمولی مثالوں کی طرف رجوع کریں۔ جن میں حقیقت کی معرفت اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ نتائجیین بیان کرتے ہیں۔ فرض کیجئے

کہ آپ نے بجلی چمکتی ہوئی دیکھی۔ اب یا تو آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ گرج سنائی دے گی یا یہ خیال کرتے ہیں کہ بجلی اتنی دور کوندی ہو گی کہ گرج سنائی نہ دے سکے، یا اس کے متعلق کچھ سوچتے ہی نہیں ہیں۔ آخری صورت کی معقولیت میں تو کوئی کلام نہیں مگر ہم کیوں نہ یہ فرض کریں کہ آپ پہلی دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں۔ جب آپ کو گرج سنائی دیتی ہے تو آپ کے تیقن کی یا تو تصدیق ہو جاتی ہے یا تردید لیکن خواہ تصدیق ہو یا تردید، ان میں سے کوئی بھی فائدہ یا عدم فائدہ کی منت کش نہیں ہوتی، بلکہ یہ واقعہ کی شرمندہ ہوتی ہے جسے گرج کے سننے کا احساس کہا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نتائجیین کی توجہ خاص طور پر ایسے یقینیات کی طرف منعطف ہے جن کی تصدیق تجربے کے واقعات سے نہیں ہوتی، حالانکہ دنیوی معاملات میں روزانہ کام آنے والے بیشتر یقینیات ——— مثلاً فلاں کا پتہ فلاں ہے ——— ایسے ہیں جن کی تصدیق تجربے سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان صورتوں میں نتائجی معیار محض فضول اور غیر ضروری ہے۔ اب رہیں گرج جیسی لاتعداد مثالیں، سو ان میں بھی اس کا انطباق قطعاً نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہاں نہ حقیقی یقین کو باطل یقین پر کوئی عملی فوقیت حاصل ہے اور نہ ان میں سے کوئی مفید اور کوئی مضر ہے۔ فلسفیوں کی یہ ایک عامۃ الورود غلطی ہے کہ وہ ہمیشہ نچکوہ مثالوں کے درپے رہتے ہیں۔ اور ان مثالوں کی طرف اعتنا نہیں کرتے۔ جن سے روزمرہ زندگی میں سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

ہر چند کہ نتائجیت میں انتہائی فلسفیانہ صداقت موجود نہیں، تاہم محض نہایت اہم اوصاف ضرور پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس حق کو ہم پا سکتے ہیں اس کو وہ مافوق الانسانی نہیں بلکہ انسانی قرار دیتی ہے۔ یعنی یہ مانتی ہے کہ وہ انسانوں کی طرح خطاکار اور تغیر پذیر ہے۔ اس طرح حق ہمیشہ انسانی سوانح کے دائرے ہی میں ہوتا ہے اس سے خارج نہیں ہوتا۔ جو چیز اس سے خارج ہوتی ہے وہ واقعہ ہوتی ہے حق نہیں ہوتی کیونکہ حق یقینیات کا ایک خاصہ ہے اور یقینیات نفسی حوادث ہیں سا سوا اس کے یقینیات کو واقعات سے جو نسبت ہے اس میں منطق کے بدیہی تصور کی سی سادگی نہیں پائی جاتی۔ یہ دوسرا وصف ہے جو نتائجیت میں پایا جاتا ہے۔ یقینیات مبہم اور ملتف ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص واقعہ

کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ واقعے کے کئی مبہم مجموعوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ منطق تجربی نصورتی قضیوں کی طرح بالکل برحق یا بالکل باطل نہیں ہوتے بلکہ حق اور باطل کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ یکسر سپید یا یکسر سیاہ نہیں ہوتے بلکہ بھورے رنگ کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ حق کا ذکر نہایت ادب اور احترام سے کرتے ہیں ان کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وہ اس کی جگہ "واقعہ" کو دیں۔ اور یہ ذہن نشیں کرلیں کہ جن محترم صفات کے آگے اُن کا سرِ نیاز خم ہو جاتا ہے وہ انسانی یقینیات میں محض عنقا ہیں۔ اس عقیدے سے جس طرح نظری فائدے حاصل ہوتے ہیں اسی طرح عملی فائدے بھی مترتب ہوتے ہیں مثلاً عوام جو آپس میں ایک دوسرے کو ستاتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں اس کی وجہ اس عقیدے کے بموجب یہ ہے کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں حق کا علم حاصل ہے۔ گویا بڑا نصب العین "جن کا ذکر عوام احترام آمیز خوف کے لہجے میں کرتے ہیں حقیقت میں ایک دھوکے کی ٹٹی ہے جس کی آڑ میں دشمنوں کا شکار کھیلا جاتا ہے۔

لیکن نتائجیت کا اس سے تاریک پہلو ایک اور ہے۔ اس کے نزدیک حق ایک ایسی چیز ہے جو یقینیات سے تعلق رکھتی اور انھیں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے لہٰذا ایسے یقینیات تیار کئے جاسکتے ہیں جو قانونِ تعزیرات کے ذریعے منوائے جاتے ہوں، چنانچہ سترھویں صدی میں کیتھولک کلیسا نے کیتھولک ممالک میں اور پروٹسٹنٹ مذہب نے پروٹسٹنٹ ممالک میں یہی کیا۔ قوت اور اقتدار والے حکومت پر قبضہ کرکے اور اپنے مخالفین کی رایوں کا گلا گھونٹ کر "حق سازی" کا باضابطہ کارخانہ کھول سکتے ہیں۔ یہ نتیجے اس غلو کی پیداوار ہیں جس میں نتائجیت بے طرح مبتلا ہوگئی ہے مانا کہ حق کے کئی درجے ہیں۔ اور وہ خالص انسانی حالات یعنی یقینیات کا ایک خاصہ ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اس کے درجے بھی بالکل انسانی حالات پر منحصر ہیں اس کے سوا اگر ہم اپنے یقینیات کے حق کو بتدریج ترقی دیں تو نصب العین کے قریب ہوتے جائیں گے، اور نصب العین کی تعیین "واقعہ" کرتا ہے۔ جس پر ہمیں صرف ان چند چھوٹے چھوٹے حالات کی حد تک کچھ معمولی سا اختیار حاصل ہے۔ جو ہمارے کرۂ پر یا اس کے قریب رونما ہوتے ہیں۔ اصل میں نتائجی نظریے کا نمونہ وہ اشتہار بازہے جو اپنی گولیوں کے متعلق بہ تکرار یہ بیان کرتا ہے کہ ان کے ایک ڈبے کی قیمت پچاس روپیہ ہے اور اس طرح لوگوں کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ اسے ایک روپئے میں مانگیں پھر جب سودا چک جاتا

ہے تو وہ اپنے کو حقیقت سے زیادہ قریب پاتا ہے کیونکہ اگر عوام کو اتنے وثوق سے نہ باور کرایا جاتا تو اتنی قیمت نہ اٹھتی۔ انسان کے خود ساختہ حقائق کی یہ مثالیں دلچسپ تو بے حد ہیں مگر مختصر بھی اتنی ہی ہیں۔ لوگ اس بارے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں اور پروپیگنڈا کی شراب سے اتنے مخمور ہو جاتے ہیں کہ ان کی بدمستیوں کی تان آخر کو جنگ، وبا اور قحط جیسے ناگوار واقعات پر ٹوٹتی ہے یورپ کی موجودہ تاریخ چشم بینا کے لئے نتائجیت کے اس پہلو کی غلطی کا ایک روشن ثبوت ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ نتائجیت کے ماننے والے برگسان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں فلسفوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نتائجین کہتے ہیں کہ حق کا معیار افادہ ہے اور برگسان کہتا ہے کہ ہماری عقل حق کی معرفت میں حائل ہے کیوں کہ وہ عملی ضروریات کی پیدا وار ہے اور دنیا کے ان تمام پہلوؤں کو یکقلم نظر انداز کر دیتی ہے جو اس کی توجہ کو جذب کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ہمیں "وجدان" نامی ایک ایسا ملکہ حاصل ہے جس کا استعمال کچھ دشوار نہیں۔ اس کے ذریعے ہمیں مستقبل کے سوا ماضی اور حال کا پورا علم بخوبی ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ اتنے بڑے علم کا ہمیشہ حاضر رہنا دقت کا باعث ہے۔ اس لئے ہم نے اپنے میں ایک ایسی چیز پیدا کر لی ہے جو دماغ کہلاتی ہے اور جس کا واحد وظیفہ "نسیان" ہے لیکن جہاں وہ بھول کا عادی ہے وہیں ضروری ہے کہ ہم اس کے متعلق ہر چیز کو یاد رکھیں۔ وہ بالکل ایک چھلنی کی طرح ہے جس میں چھننے سے صرف وہی چیزیں رہ جاتی ہیں جو مفید اور بنا بریں غیر صائب ہوتی ہیں۔ برگسان کے نزدیک افادہ خطا کا معیار ہے اور حق صرف ایک ایسے باطنی غور و فکر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جس میں عملی فائدے کے افکار کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ بایں ہمہ برگسان نتائجین کی طرح عمل کو عقل پر اور تمثیل کو سیلیت پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ڈسڈیمونا کو وجدان کے ذریعے مار ڈالنا، بادشاہ کو عقل کے ذریعے زندہ چھوڑ دینے سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نتائجین برگسان کو اپنا دوست جانتے ہیں۔

برگسان کی پہلی کتاب "زماں اور اختیار" ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی اور اس کی دوسری کتاب "مادہ اور حافظہ" ۱۸۹۶ء میں مطبع سے باہر نکلی۔ لیکن اس کو عالم گیر شہرت "ارتقائے تخلیقی" کی شہرہ آفاق تصنیف کی بدولت نصیب ہوئی جو ۱۹۰۷ء میں چھپی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ کتاب اول الذکر کتابوں

کچھ بہتر اور برتر ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس میں براہین کا حصہ کم اور ادبیت کی چاشنی زیادہ ہے۔ اسی لئے اس میں سحرِ حلال کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس میں شروع سے لے کر آخر تک بس شاعری ہی شاعری ہے کوئی دلیل نہیں ہے اور بنا بریں کوئی کم زور دلیل نہیں ہے۔ اس کے سوا اور کوئی بات اس میں ایسی نہیں ہے جو ہمیں اس کے پیش کردہ فلسفے کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کچھ مدد دے۔ یہ سوال اگرچہ اہم ہے۔ لیکن برگساں نے اس کے جواب کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لی بلکہ اسے پڑھنے والوں کے سر جھونک دیا۔ اور یہ ایک لحاظ سے درست بھی ہے۔ کیونکہ جب ہم اس کے نظریات کا بہ امعانِ نظر جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حق وجدان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے عقل کے ذریعے نہیں ہوتا، اور جب وہ عقل کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا تو دلیل اور برہان سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں ہو سکتا۔

برگساں کے فلسفے کا بڑا حصہ محض روایتی تصوف پر مبنی ہے۔ البتہ اسے ذرا انوکھے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ دنیا جہان کے صوفی خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی سب بالاتفاق یہ مانتے ہیں کہ چیزیں حقیقت میں الگ الگ نہیں ہیں۔ بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے اندر داخل اور ساری ہیں۔ اب جو وہ الگ الگ نظر آتی ہیں سو یہ قصور اُن کا نہیں بلکہ تحلیلی عقل کا ہے۔ جو انھیں ایسا سمجھتی ہے اس کو باہمی تداخل کا عقیدہ کہا جاتا ہے اور یہ برمانیدیس سے لے کر بریڈلے تک ہر صوفی منش انسان میں یکساں طور پر موجود ہے برگساں بھی اس کا قائل ہے۔ اس کی جدت پسند طبیعت نے اس عقیدے میں اپنی دو اختراعاتِ فائقہ کے ذریعے ایک خاص ندرت پیدا کر دی ہے، ایک تو یہ کہ وہ وجدان کو حیوانات کی جبلتوں میں سمو دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وجدان ہی ہے جو "اکل کھری بھڑ" "ایمو فلا" کو اس بات پر اکساتا ہے کہ جس پہل روپ میں اس نے اپنے انڈے رکھے ہیں اسے اس طرح ڈسے کہ وہ مرے نہیں، بلکہ صرف مفلوج اور بے حس ہو کر رہ جائے (لیکن ڈاکٹر پیک ہم اور ان کی بیگم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غریب بھڑ سہو و خطا کے میدان میں کسی سائنس داں سے کچھ پیچھے نہیں ہے)، اس جدت نے اس کے عقیدوں میں جدید سائنس کی ایک ایسی چاشنی پیدا کر دی ہے جو بے حد دلکش ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس کی وجہ سے بہت سی حیوانیاتی مثالیں ایسی پیش کر سکتا ہے جن کی بنا پر ایک انجان اور بے خبر آدمی یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اس کے نظریے

نفسی حیاتیاتی تحقیق کے جدید ترین نتائج پر مشتمل ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ "مکان" اور "زمان" کی بالکل نئی نئی تعبیریں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تحلیلِ عقل اشیاء کو فرداً فرداً دیکھتی ہے اور اُن کے اسی الگ الگ ہونے کا نام "مکان" ہے۔ علیٰ ہذا وجدان چونکہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اشیاء ایک دوسرے میں ساری اور نافذ ہیں لہٰذا یہ باہمی "داخل ہی "زمان" یا "مرور" ہے۔ اس جدت نے اسے "زمان" اور "مکان" کے متعلق ایسی بہت سی اچھوتی باتیں کہنے کا موقعہ دیا ہے۔ جن کو اگر ہم مذکورہ اصطلاحوں کے معمولی مفہوم کے لحاظ سے دیکھیں۔ تو اُن کی گہرائی اور جدت کا کوئی ٹھکانا باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح "مادہ" چونکہ "مکان" کا پابند ہے اس لئے عقل کی ایجاد ہے۔ چنانچہ جب ہم وجدان کے نقطۂ نظر سے اسے دیکھتے ہیں تو وہ واقعی ایجاد بندہ ہی نظر آنے لگتا ہے

برگسان کے فلسفے کے اس جزو سے اگر اس کی بے نظیر انشاء پردازی کو نکال دیا جائے تو باقی جو کچھ رہے گا وہ فلاطینوس کا فلسفہ ہوگا۔ البتہ اس کی یہ ساحرانہ انشاء پردازی اس کی ذہانت اور قابلیت کی ایک روشن دلیل ہے۔ لیکن اس سے انسان صرف ادیب بن سکتا ہے، فلسفی نہیں ہو سکتا اور واقعہ یہ اس کے فلسفے کا یہ حصہ اس کی عالمگیر ہردل عزیزی اور عام پسندی کا ضامن بھی نہیں ہے اس کی شہرت تو اس کے اس عقیدے کی پیداوار ہے جو "جوشِ حیات" اور "تخلیقِ دائم" کا عقیدہ کہلاتا ہے اس کے علاوہ اس کی عظیم الشان جدت یہ ہے کہ اس نے زمان اور ارتقاء کی واقعیت کے یقین میں تصوف کو اس صناعانہ انداز میں سمو دیا ہے کہ انسانی عقل عش عش کرتی رہ جاتی ہے۔ آیئے ایک سرسری نظر اس موضوع پر بھی ڈال لیں کہ اس نے اس شعبے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کیسے کی؟

روایتی عقل کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف فکر کا عادی ہے، وقت کو بے حقیقت جانتا ہے اور مجموعی طور پر کاہل انسان کا فلسفہ ہے۔ صوفیانہ صفائے قلب کی نفسیاتی صبح روح کی وہ تاریکی شب ہے جو انسانی زندگی کی وسعتوں پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب کہ عمل کا آفتاب ترک یا بدلی کے اُفق میں غروب ہو جاتا ہے۔ اس طرح روح کا مکان جب عمل کے مکین سے خالی ہو جاتا ہے تو فکر کا دیو اس پر اپنا قبضہ جماتا ہے۔ ہماری ہستی کا ایک قانون یہ ہے کہ ہم ہمیشہ ایسے یقینیات اختیار کرتے ہیں

جو ہماری قوتِ نفس کے امین ہوتے ہیں۔ چنانچہ تحلیلِ نفسی پر اب تک جتنی کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں وہ سب کی سب اس قانون کی عجیب و غریب نظیروں سے اٹی پڑی ہیں۔ پس وہ انسان جو عمل سے بھاگ کر فکر کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی کا حقیقی مقصد فکر ہی ہے اور جو لوگ دنیوی کاروبار میں سر لبسر غرق اور محو رہتے ہیں وہ حقیقی دنیا کو نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ روایتی تصوف کا بنیادی اصول یہی ہے۔ اور اس سے اس کے بقیہ عقاید بہ آسانی مستنبط ہو سکتے ہیں کہا جاتا ہے کہ لاؤ تسے[1] اپنی مشہور عالم کتاب[2] ایک چنگی خانہ میں اتنی دیر میں تصنیف کی جتنی دیر میں کہ چنگی والوں نے اور مسافروں کے ساتھ اس کے اسباب کا معائنہ ختم کیا۔ اور غالباً بڑے فلسفیوں میں وہ پہلا شخص ہے جسے یہ فخر حاصل ہے[3]۔ اس کتاب میں اس نے بس ایک ہی راگ الاپا ہے اور وہ یہ کہ عمل بے کار ہے۔

---

[1] نام آر "اورلی" لقب "لاؤ" عرف۔ مذہب تاؤ کے بانی۔ چین کے مشہور فلسفی، صوفی اور بنی، ان کا وطن "چو" تھا۔ اور وہ وہیں کے شاہی کتب خانے میں مہتمم تھے۔ یہیں پر ۵۱۷ ق م میں کنفیوشس ان سے ملنے آئے۔ مترجم

[2] تا۔تے کنگ یعنی منہاج یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے کیونکہ مختصر عرصے میں قلم بند ہوئی ہے تاہم اس میں چینی رسم الخط کے پانچ ہزار نشانات ہیں۔ اور دو حصوں اور اکیاسی فصلوں پر مشتمل ہے۔ زبان میں اجمال اور استعارات کی کثرت ہے۔ (مترجم)

[3] لیکن کہا جاتا ہے کہ کتاب چونکہ چھوٹی سی ہے اس لئے فخر کی کوئی بات نہیں۔

"بین الاقوامی سیاست"

اسپین میں یورپ کی مختلف قومیں جس طرح فریقین کی مدد کر رہی ہیں وہ کس سے پوشیدہ ہے مگر ساتھ ہی عدم مداخلت کی کمیٹی بھی بنی ہوئی ہے۔ اور اس کے جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کہ یہی سیاست کا تقاضا ہے۔ پیرس کے ایک رسالہ (CANARD ENCHAINE) نے اس کمیٹی کی کارروائیوں کی ایک فرضی طنزیہ روئداد شائع کی ہے۔ نامہ نگار کسی طرح برطانوی دفتر خارجہ کے اس خوب صورت اور آراستہ کمرے میں پہنچ گیا ہے جہاں اس عدم مداخلت کی کمیٹی کا ایک اہم جلسہ ہونے کو تھا۔ موقع اچھا تھا، میز کے نیچے دبک بیٹھا، جو کچھ سُنا حاضر ہے ؎

لارڈ پلاؔئی متھ، انگلستان کے نمائندے (جلسے کا افتتاح فرماتے ہوئے) : حضرات : اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آج کے جلسے میں ہم وہیل مچھلیوں کے تحفظ کا اہم مسئلہ لیں۔ حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ آج وہیلوں کی نسل کو سخت خطرے کا سامنا ہے، اس کی بنیادیں، سچ یہ ہے کہ، متزلزل ہو گئی ہیں۔

مائسکی، روسی نمائندہ : لیکن، یور ایکسلنسی، اسپین کے متعلق کیا ارشاد ہے ؟

لارڈ پلاؔئی متھ (سوکھے منہ سے)، میرے مکرم دوست، میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ مجھے غیر متعلق معاملات میں الجھائیں۔ آپ پھر بھولتے ہیں کہ یہ عدم مداخلت کی کمیٹی ہے، عدم مداخلت کی۔ اور اس کے نام ہی سے واضح ہے کہ اسے اسپین کے معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ دینا چاہیئے۔

گرانڈی، اطالوی نمائندہ : بہت خوب، بالکل درست۔

فان ربن ٹروپ، جرمن نمائندہ : مسٹر مائسکی کو پرائی باتوں میں دخل دینے کی کچھ عجب افسوسناک لت ہے۔

مون تائیرو ۔ (انگریزی نمائندہ ؛ (ترش روئی سے) اگر روس کے نمائندہ صاحب اپنا یہ ٹال مٹول کا انداز اور جاری رکھیں گے تو میں مجبور ہوں گا کہ اپنی حکومت سے درخواست کروں کہ وہ مجھے اپنی کمیٹی سے واپس بلا لے۔

کوربین ۔ فرانسیسی نمائندہ: (مائسکی سے) چلو، چلو بھی، جانے بھی دو۔ ذرا صبر کرو، ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔

لارڈ پلائی متھ ۔ جیسا کہ میں اس غیر ضروری قطع کلام سے پہلے کہہ رہا تھا، وہیل جو دریائی دودھ پلانے والے جانوروں کی ایک قسم ہے ایک زمانے میں بڑی تعداد میں دستیاب ہوتی تھی ۔ اور اب وہ نہایت تیزی سے کم ہو رہی ہے ۔ ابھی کل کا ذکر ہے کہ ایک وہیل مچھلی بلباؤ کے قریب اسپینی ساحل پر جا پڑی۔

گرانڈی (نہایت پھرتی سے کھڑے ہو کر) : بلباؤ کے قریب' بلباؤ کے ؟ کیوں' ان سُرخ انقلابیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ؟ یہ تو عدم مداخلت کے میثاق کی کھلی خلاف ورزی ہے (مائسکی سے مخاطب ہو کر) آپ نے سنا ' جناب عالی' آپ نے سنا ؟ ہمارا سردار اس کو ہرگز نہیں برداشت کرے گا میں کل ہی بارسلونا کو بیس آب دوز کشتیاں بھیج دوں گا۔

لارڈ پلائی متھ ۔ مسٹر گرانڈی' ذرا' ذرا سہولت سے' ذرا ٹھہرئے ۔ ایک ہی وہیل مچھلی تو تھی!

گرانڈی (ذرا ٹھنڈے ہو کر ۔) بہت اچھا ۔ خیر ۔ تو میں دس ہی آب دوز بھیجوں گا۔

لارڈ پلائی متھ : یہ کمیٹی اپنے احساس تشکر کا اظہار کرتی ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ تعاون کی اس درجہ آمادگی ظاہر فرمائی ۔ دلی شکریہ۔

فان رِبن ٹروپ : اب چونکہ گفتگو اسپین کی آ ہی گئی ہے ' میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ایک 'وفادار' قیدی کے پیروں میں روسی موزے تھے۔

مائسکی : لیکن میں نہایت ....

گرانڈی (نہایت شدت سے) : مسٹر مائسکی مجھے اصرار ہے کہ آپ ان اہانت آمیز لفظوں کو فوراً

واپس لیں۔

مائسکی ۔ مگر میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں ہے!

گرانڈی (دھمکانہ انداز میں) : بہر حال آپ کو وہ لفظ واپس لینے ہوں گے۔

(مائسکی نے لفظ واپس لے لئے!)

لارڈ پلائی متھ : اب کہ یہ معاملہ طے ہو گیا ہے۔ آیئے پھر اس اصل مسئلے کی طرف، وہیلوں کے مسئلے کی طرف رجوع کریں .... ہمارا خیال ہے کہ نہایت سخت نگرانی . . . .

گرانڈی : میں معزز لارڈ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم یہاں آج نگرانی وغیرہ کے متعلق گفتگو کے لئے نہیں آئے تھے۔

لارڈ پلائی متھ (کچھ مایوسی کے سے لہجے میں) مگر صاحب یہاں تو ذکر صرف مچھلیوں کا ہے ۔

گرانڈی (دوسرے کی بات بے سنے) علاوہ بریں واضح رہے کہ نگرانی ہو یا نگرانی نہ ہو۔ اٹلی نے جو رضاکار بھیج دیے ہیں وہ انھیں کسی حال میں واپس نہیں بلا سکتا۔

کوربیں : (اٹھ کر) یہ نہایت تشویشناک لفظ ہیں ۔

لارڈ پلائی متھ : ناقابل قبول لفظ، ناقابل پذیرائی ۔

گرانڈی (عجلت میں) میں نے اپنا مطلب ٹھیک ظاہر نہیں کیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اٹلی فرانکو کو فوجیں بھیجنا بند نہیں کرے گا۔

کوربیں : اچھا تو یہ تو اور بات ہے، میں بھی یہی سمجھتا تھا۔

لارڈ پلائی متھ : بھائی مسٹر گرانڈی، آپ نے تو ایک منٹ کو مجھے ڈرا دیا تھا۔

گرانڈی (نہایت نرمی سے) معاف فرمائیے، زبان کی لغزش تھی۔

مائسکی : (دبے دبے) اگر میں ایک لفظ عرض کر سکوں تو ....

فان ربن ٹروپ : میں اس نفرت خیز اشتعال انگیزی کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا

مائسکی : مگر میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں ہے ۔

گرانڈی : صاحب، میں یہاں اس تو تو میں میں کے لئے نہیں آیا تھا، میں جاتا ہوں۔

لارڈ پلائی متھ (انہیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں) مسٹر گرانڈی، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جب تک وہیلوں کا مسئلہ طے نہ ہو جائے۔ آپ تشریف نہ لے جائیں۔

گرانڈی : تو پھر مسٹر ہاسکی سے کہیئے کہ زبان بند رکھیں۔

لارڈ پلائی متھ ! مسٹر ہاسکی، براہِ کرم آپ نہ بولیں

کوربیں ؛ چلو بھئی، جانے بھی دو، ہاسکی، واقعی ذرا ٹھنڈا لو۔ یہاں تو تمہارے سوا کسی اور کی آواز ہی سنائی نہیں دیتی۔

لارڈ پلائی متھ ، ہاں، تو میں پھر عرض کرتا ہوں، کہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے۔۔۔۔۔۔۔

فان رین ٹروپ (جو پارلمانی تدبیروں سے خوب واقف ہیں) تو پھر، میری رائے یہ ہے کہ اس پرالیسٹر کی تعطیلات کے بعد بحث ہونی چاہیئے۔

لارڈ پلائی متھ : (سخت مایوسی کے ساتھ) ، لیکن ان بے شمار وہیلوں کا تو خیال فرمائیے جو اس دوران میں مر جائیں گی۔۔۔ ۔۔۔۔۔

کوربیں : (بلا قصد) جیسے کہ بہتیرے چھوٹے چھوٹے اسپینی بچے۔

گرانڈی، فان رین ٹروپ، اور مون تائیرو ایک ساتھ اُٹھ کر : بس حد ہو گئی، حد، یہ نہیں برداشت کیا جا سکتا۔ (تینوں اٹھ کر کمرے سے نکل جاتے ہیں، اور دھڑسے دروازہ بند کرتے ہیں۔)

لارڈ پلائی متھ (مسکرا کر) خیر اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔ بالآخر ہم اس مسئلے کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اس وہیلوں کے مسئلے کی طرف جیسا کہ میں کہہ رہا تھا۔۔۔ ۔۔۔۔ (کوربیں اور ہاسکی بھی چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ اور لارڈ پلائی متھ اپنی تقریر کی رو میں بولے چلے جاتے ہیں) یہ وہیلوں کا مسئلہ اہم۔۔۔ ۔ ۔ ۔۔۔۔ وہیلوں کا مستقبل۔۔۔۔۔۔۔ شدید نگرانی کی ضرورت۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ وقت آ گیا ہے۔ ۔۔۔۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔

مسلمان کانگریس اور مسلم لیگ

کانگریس میں شرکت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے روز بروز اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ ذیل میں ایک "قوم پرست مسلم" نے اسی موضوع پر بحث کی ہے۔ اگر کوئی صاحب رائے بزرگ اس عنوان کے ماتحت اپنے خیالات کا اظہار فرمانا چاہیں تو ہم بڑی خوشی سے شائع کریں گے

(ایڈیٹر)

جب سے فیض پور کانگریس نے عوام کے ساتھ رابطہ بڑھانے کا اعلان کیا ہے، کانگریس کے رہنماؤں خصوصاً جواہر لال جی اور اُن کے رفیقوں کی طرف سے اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے، کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم عوام کو کانگریس میں شامل کیا جائے۔ اخباروں میں اس کی تائید میں زور دار مضامین نکل رہے ہیں۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اس کی حمایت میں تقریریں کی جا رہی ہیں۔ جواہر لال جی کی طرف سے اس سلسلے میں کئی بیانات شائع ہو چکے ہیں۔ کانگریس نے انتخابات میں کئی مسلمانوں کو کھڑا کیا اگرچہ ان میں سے اکثر ناکامیاب رہے۔ جھانسی کے مسلم حلقے کے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار کے خلاف کانگریس نے اپنا امیدوار نثار احمد خاں صاحب شروانی کو بنایا' اور ان کے لئے نہایت سرگرمی سے کام کیا۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما، مثلاً جواہر لال نہرو' پنڈت گوبند ولبھ پنت، خاں عبدالغفار خاں، مولانا حسین احمد، اچاریہ نریندر دیو، مسٹر رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر محمود اور بہت سے دوسرے رہنماؤں نے اس حلقے میں پہنچ کر رائے دہندگان کو نثار احمد خاں صاحب کے حق میں رائے دینے کی ترغیب دی۔ کانگریس نے اپنی بڑی قوت کو اس محاذ پر جمع کیا اور مسلم عوام کے اس فیصلہ کا تمام ہندوستان نے نہایت بے صبری سے انتظار کیا۔ لیکن مسلمانوں کا فیصلہ کانگریس کے امیدوار کے خلاف ہوا اور لیگ کے امیدوار مسٹر رفیع الدین منتخب ہو گئے

سوال محض ایک نشست یا چند نشستوں کا نہیں تھا بلکہ اصولی اور بنیادی سوال تھا۔ اب تک جتنے انتخاب ہوئے ہیں وہ جداگانہ حلقوں سے ہوتے رہے ہیں۔ مسلم حلقے مسلمانوں کے لئے محفوظ رہے ہیں، اور ہندو حلقے ہندوؤں کے لئے۔ ہر فرقے نے اپنے حلقے کے کام کو ایک نجی اور ذاتی معاملہ سمجھا ہے، جس میں دوسرے فرقے کے لوگوں نے کبھی مداخلت نہیں کی۔ چنانچہ مسلمان حلقوں میں اب تک صرف مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ہی کام کرتی تھیں۔ اور اپنے فرقے میں جن افراد یا جماعتوں کو زیادہ طاقت حاصل ہوتی تھی اُن کے امیدوار منتخب ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن کانگریس اب ایک نئی روایت قائم کر رہی ہے۔ کانگریس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت ہے۔ اس لئے وہ پابندیاں جو فرقہ وار جماعتوں پر عاید ہوتی ہیں، اس پر عاید نہیں کی جا سکتیں۔ اسے مسلمان حلقے میں کام کرنے کا ایسا ہی حق حاصل ہے، جیسا کہ اسے ہندو حلقے میں ہے۔ کانگریس کے ہندو کام کرنے والے اپنے سیاسی و معاشی پروگرام کے نام پر مسلمانوں میں اسی طرح کام کر سکتے ہیں، جیسے اس کے مسلمان کام کرنے والے ہندوؤں میں کر سکتے ہیں۔ کانگریس مذہب کے نام پر رائے حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ وہ ایک سیاسی جماعت ہے۔ اس لئے اپنے سیاسی و معاشی پروگرام پر ووٹ حاصل کرتی ہے۔ اسے اس سے بحث نہیں کہ رائے دہندہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اگر وہ اس کے پروگرام سے متفق ہے۔ تو اسے اُس کے امیدوار کو ووٹ دینا چاہئے۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب بلاشبہ دستور میں موجود ہیں۔ انتخاب مسلمانوں کی رائے سے مسلمان امیدوار ہی کا ہوگا۔ کانگریس کے نزدیک یہ باتیں بجائے خود ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن دستور دوسروں کا بنایا ہوا ہے اور انتخاب میں حصہ لینے کا کانگریس فیصلہ کر چکی ہے۔ اس لئے ان خرابیوں کو تو اسے فی الحال گوارا کرنا ہی پڑے گا۔ مگر قانون کے اندر رہ کر اس میں جو کچھ اصلاح کی جا سکتی ہے وہ تو کرنا ہی چاہئے۔ مثلاً ووٹروں کو مشورہ دینے اور اپنے مسلم امیدوار کے لئے کوشش کرنے سے ہندوؤں کو قانون منع نہیں کرتا۔ پھر جب یہ کوشش ہندو مذہب کا نام لے کر نہ کی جائے، بلکہ سیاسی اور معاشی پروگرام کو نمایاں کر کے، اور کانگریس کے مسلم رہنماؤں اور مسلم اراکین کے پورے اشتراک عمل کے ساتھ کی جائے تو دنیا کی نگاہ میں اس میں کوئی مذموم اور معیوب پہلو باقی نہیں رہتا۔ یہ تو کانگریس کی پوزیشن ہوئی ہے۔

لیکن مسلم لیگ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کو یہ بات ناپسند ہے۔ وہ مسلمانوں کی سیاست میں کانگریس کی مداخلت گوارا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے نمایندے کو منتخب کرنا مسلمانوں کا نجی معاملہ ہے۔ کانگریس اُن کے نزدیک ایک غیر مسلم جماعت ہے، اس لئے کانگریس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی تنظیم، قوت، روپیہ، قابلیت، پریس اور اکثریت سے فائدہ اٹھاکر مسلمانوں کے انتخابات پر ناجائز اثر ڈالے۔ اُسے مسلمانوں سے کوئی رابطہ و تعلق براہ راست نہ پیدا کرنا چاہئے، بلکہ اسے مسلمانوں کی مسلمہ سیاسی جماعتوں اور اُن کے رہنماؤں سے معاملہ کرنا چاہئے۔ درحقیقت یہی لوگ سمجھوتہ اور صلح کرنے کے اہل ہیں کیونکہ یہ مساوی سطح پر رہ کر، اور مسلمانوں کے مفاد کو پوری طرح سوچ سمجھ کر معاملہ کرسکتے ہیں (کانگریس کو ایسے لوگوں کی سرپرستی اور اُن سے معاملہ اور سمجھوتہ نہیں کرنا چاہئے جنھیں مسلمانوں کی جماعت میں کوئی اعتبار و اعتماد، عزت اور وقعت حاصل نہیں ہے اور جو محض اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ کانگریس سے گفتگو کرسکتے ہیں۔ جماعت کے نمائندہ بن کر نہیں کرسکتے) یہ مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ ایسے افراد کو کبھی بھی مسلمانوں کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور جب مسلمانوں کے صحیح نمائندوں کو نظر انداز کرکے ایسے لوگوں کو وزارتوں میں شامل کیا جاتا ہے اور ان سے مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے اور ان کی رائے کو مسلم جماعت کی رائے تسلیم کیا جاتا ہے تو گویا دنیا کو دھوکا اور فریب دیا جاتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں سے من حیث الجماعت سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ چالاکی اور عیاری اور زور اور زبردستی سے انھیں اپنی بات تسلیم کرنے کے لئے مجبور کررہی ہے جو تحفظات مسلمانوں کو دستور میں دئے گئے ہیں انھیں وہ دراصل ختم کرنا چاہتی ہے اور مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم کا پابند بنانا چاہتی ہے۔

(جواہر لال جی اور ان کے کانگریسی رفقاء اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں خصوصاً مسلم لیگ اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کو مسلم عوام کا صحیح نمائندہ تسلیم نہیں کرتے۔ وہ انھیں رجعت پسندی اور سرکار پرستی کا اڈا قرار دیتے ہیں اور زمینداروں، تعلقہ داروں، خطاب یافتوں اور سرکاری ملازموں کا آلہ کار سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح مسلمانوں کو بھی انفرادی حیثیت کے ساتھ کانگریس میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے ۔ اس بنیاد پر کسی قسم کی علاحدہ جماعت بندی نہیں کی جا سکتی اور اگر کی جاتی ہے تو وہ محض چند خود غرض اور جاہ پسند لوگوں کے فائدہ کے لیے کی جاتی ہے جو مذہب کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں ۔ اس فریب کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہیے اور عوام کے سامنے معاملات کو صحیح روشنی میں پیش کرنا چاہیے ۔ عوام بھوکے اور ننگے ہیں ۔ ان میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے ۔ ان کے لئے یہی مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں ۔ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ جماعتیں ان اہم مسئلوں کو تو فراموش کر دیتی ہیں البتہ مذہب تمدن اور زبان کی حفاظت کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتی ہیں ۔ "پراگندہ روزی پراگندہ دل" جس غریب کی زندگی کا ہی کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہے وہ زبان و تمدن سے اپنی آتما کی آگ کو کیسے ٹھنڈا کر سکتا ہے ۔

اس کے برخلاف کانگریس ان کی اس تباہ حالی کے اسباب بتلاتی ہے اور ان کے رفع کرنے کی تدبیریں پیش کرتی ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی ساری مصیبتوں کا سرچشمہ برطانوی ~~سامراج~~ ہے ۔ جب تک یہ آکاش بیل موجود ہے ہندوستان کا کوئی پودا سرسبز نہیں ہو سکتا ۔ مذہب تمدن اور زبان کی حفاظت اسی وقت کی جا سکتی ہے جب فراغت اور جمعیت خاطر ہو ۔ جب تک یہ مفقود ہیں سب کام کم زور اور بے نتیجہ رہیں گے ۔ پھر یہی نہیں بلکہ ہندوستان میں مذہب تمدن اور زبان کی ترقی میں بھی سب سے بڑی رخنہ اندازی غیر ملکی حکومت کی طرف سے ہو رہی ہے جو کسی فرقے کو پنپنے نہیں دیتی اس لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس مشترک مصیبت سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کی جائے ۔ ملکی آزادی اور خود مختاری حاصل کرنا اولین فرض ہے ۔ ملک میں فی الحال دو سیاسی قوتیں برسر پیکار ہیں ۔ ایک قوم پرست اور دوسری سرکار پرست ۔ ان کے علاوہ کوئی تیسری قوت نہیں ہے ۔ چھوٹی چھوٹی کم زور جماعتیں ہو سکتی ہیں ۔ افراد کے غیر متحد اور منتشر گروہ ہو سکتے ہیں ۔ جاہ پرست اور خود غرض اشخاص اور ان کے حامیوں کا غول ہو سکتا ہے تمدن و مذہب کی حفاظت کے لئے ادارے ہو سکتے ہیں ۔ لیکن جاندار طاقت ور واضح اور متعین سیاسی نصب العین رکھنے والی جماعتیں فی الحال صرف دو ہیں ——— کانگریس اور برطانوی ~~سامراج~~ شہنشاہیت ۔ اس لئے فی الحال کسی تیسری سیاسی جماعت کے قائم کرنے کا موقع

نہیں ہے۔ اس وقت سیاست میں شرکت کے معنی عملاً صرف یہی ہو سکتے ہیں یا کانگریس کا ساتھ دیا جائے، یا حکومت کا، یا پھر بے عملی اور کم ہمتی کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی کا ساتھ نہ دیا جائے، اور بیٹھ کر تماشا دیکھا جائے۔ مسلمانوں کی باعمل سیاسی جماعتیں یا تو ملک کی آزادی کی حامی ہو سکتی ہیں، یا برطانوی حکومت کی۔ پہلی صورت میں ان کے اور کانگریس کے اور دوسری صورت میں ان کے اور حکومت کے نصب العین میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس پوزیشن کو اگر تسلیم نہ بھی کیا جائے اور کہا جائے کہ نہیں ملک میں اور دوسری سیاسی جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں تب بھی مذہب کو سیاسی معاملات سے علیحدہ رکھنا ہی مناسب ہے۔ مذہب اور سیاست کا مشترک ساختی (فیوڈلی)، اور متوسط عہد کی یادگار ہے۔ یہ نصب العین موجودہ عہد میں اور کم از کم ہندوستان میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے آباد ہیں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت ہے اور اس کا کوئی سیاسی نصب العین کانگریس کے نصب العین سے جدا ہے، تو اسے اپنے ہم مشرب اور ہم خیال لوگ ہندوؤں میں بھی بلاشبہ مل سکتے ہیں، اور اسے ان لوگوں کو اپنے درمیان ضرور شامل کرنا چاہیئے۔ اور اپنی سیاسی قوت کو اس طرح بڑھانا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ سیاسی نصب العین کا جہاں تک تعلق ہے۔ ہندو مہاسبھا یا لبرل لیگ اور مسلم لیگ کے نصب العین میں کوئی فرق نہ ہو۔ لہذا سیاسی معاملات میں ان جماعتوں کو باہم متحد ہو جانا چاہیئے۔ رہے مذہبی اور تمدنی معاملات سو اگر کچھ ایسے معاملات ہیں جن کا تحفظ کانگریس کے بنیادی حقوق کے رزولیوشن سے نہیں ہوتا تو ان کے تحفظ کی کوشش کو مذہبی اور تمدنی جماعتوں اور اداروں کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے جو زیادہ موثر اور معقول طریقے پر اپنے حقوق کی پیروی خود کر سکتی ہیں۔

لیکن جو مسلمان مذہبی بنیاد پر سیاسی جماعت بندی کے قائل ہیں وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ عوام بھوکے اور ننگے ہیں ملک میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی انھیں مذہب جان سے زیادہ عزیز ہے وہ نہ صرف مذہب بلکہ مذہبی توہمات کے لئے پروانوں کی طرح جانیں نثار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کی جزئی تفصیلات پر مذہب کا رنگ پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے کانگریس کو اسے مذہبی رنگ دینا پڑا۔ اور

سیاست پر مذہب کے اس اثر نے مذہبی احساس کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔ سیاسی آزادی کو مذہبی آزادی کے مطلب پر پیش کیا جانے لگا، اور ہندو اور مسلمان اس کا مفہوم اپنے تمدن و مذہب کی ترقی اور احیار اور اپنے فرقے کا اقتدار سمجھنے لگے۔ پھر چونکہ تاریخی اعتبار سے مسلمان ہندوؤں پر حکومت کر چکے ہیں اور تاریخ کو جس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں ہندوؤں کو کافی ذلیل و خوار کیا۔ (محکومیت خود ایک ذلت ہے) اس لئے مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں طالب علمی کے زمانے سے ایک دلی نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ انگریزوں کی طرح مسلمانوں کو بھی غیر ملکی فاتح سمجھتے ہیں اور دونوں کے ناپاک اثر سے ملک کو آزاد کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان اس کے برعکس اس زعم میں کہ جب ایک دفعہ حکومت کی ہے تو دوبارہ بھی کی جا سکتی ہے مسلم راج کے خواب دیکھتے ہیں لیکن خود چونکہ اکثر صوبوں میں اقلیت میں ہیں اور جاہل اور نادار ہیں اس لئے بیرونی امداد پر نظر رکھتے ہیں کہ افغان یا ترک بلکہ فلسطین اور شام و مصر کے عرب ہندوستان میں مسلم راج قائم کریں گے۔ اور جب تک وہ نہیں آتے برطانیہ سے اپنے حقوق کا تحفظ کرانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہندو فرقہ پرست غیر ملکی حملہ آوروں کے خوف کی وجہ سے جب تک ان میں پوری طاقت نہ آجائے مکمل آزادی لینا نہیں چاہتے بلکہ برطانیہ سے تعلق باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

جس ملک میں مذہبی احساس قوی ہو اور رواداری مفقود ہو وہاں مذہب کی اس رقابت اور تعصب کا اثر سیاسی اور معاشی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اقلیت کے محض تمدنی و مذہبی اور لسانی حقوق کا تحفظ کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کو سیاسی اور معاشی تحفظات کی بھی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہندوستان میں آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں اور ایک ہی ملک کے دو رہنے والے جس بے رحمی اور درندگی کے ساتھ اپنے پڑوسیوں کا خون محض مذہب کے اختلاف کی وجہ سے بہاتے ہیں اور جس طرح بعد میں انصاف اور حب الوطنی کو بالائے طاق رکھ کر مذہبی جانب داریوں سے کام لیتے ہیں وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ اس وقت تو ایک بیرونی طاقت موجود ہے جو ملکی فریقین کو حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیتی اور ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتی ہے لیکن جب فریقین میں سے خود ایک فریق کا عدالت کی کرسی پر قبضہ ہوگا اس وقت وہ

کہاں تک اپنے مذہبی تعصب کو دبا سکے گا یہ مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں گذشتہ تجربے سے کوئی امید افزا رہنمائی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کو ہندو حاکمان عدالت اور سرکاری عہدہ داروں، دفتر کے محرروں بلکہ ڈاکخانہ اور ریلوے کے ملازموں، اخباروں اور رہنماؤں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ جب کبھی ہندو مسلم سوال پیدا ہوتا ہے، وہ فرقہ پروری سے کام لیتے ہیں اور مسلمانوں کو ملزم ثابت کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ملک میں ایسی انجمنیں بھی موجود ہیں اور اُن کا اثر تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے اور ان کے رکن ملک کے نہایت معزز اور با اقتدار تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگ ہیں جو علی الاعلان اپنا مقصد یہ بیان کرتی ہیں کہ مسلمانوں کا نام و نشان ہندوستان سے مٹا دیا جائے۔ مہاسبھا کی تحریک موجود ہے۔ ہندی تحریک جاری ہے۔ خود کانگریس میں فرقہ پرست ہندو موجود ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو مستقبل کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے شہری حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور ضمانت چاہتے ہیں۔

محض لوگوں کے چیخ چیخ کر یہ کہنے سے کہ مذہب کی اہمیت کا زمانہ ختم ہو گیا اس بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عملاً اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ روزمرہ کی عملی زندگی کے فیصلے بے سر و پا اور خیالی باتوں سے نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ان سے تسلی اور تسکین نہیں ہو سکتی۔ آپ کا یہ کہنا کہ صرف روٹی کا سوال اہم ہونا چاہئے کافی نہیں ہے کیونکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ لوگ پیٹ سے زیادہ اہم مذہبی باتوں کو سمجھتے ہیں اور ان کے لئے اپنا جان و مال ہر وقت نثار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مسجدوں، مندروں، دریاؤں کے گھاٹوں یا تراؤں اور اشنان کے میلوں میں کروڑوں آدمی روز مذہبی عقیدت کے ساتھ جاتے آتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی بات میں مذہب کا اثر نمایاں ہے۔ انتخابات میں مذہب کے نام پر جو امیدوار کھڑے کئے گئے وہ کامیاب ہوتے اور سیاسی و معاشی پروگرام پیش کرنے والے امیدوار ناکام رہے۔ اس لئے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کا زمانہ ختم ہو گیا۔ حقائق کو سامنے رکھ کر معاملات کا فیصلہ کیجئے۔ محض خیال پرستی اور مستقبل کے امکانات پر لوگوں کو اپنے جائز حقوق قربان کرنے کے لئے آمادہ نہ کیجئے کیونکہ اگر آپ ایسا کریں گے تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ آپ دوستی کے پردے میں دشمنی کر رہے ہیں۔

غرض کہ مسٹر جناح اور اُن کے طرف داروں، اور پنڈت جواہر لال اور کانگریسیوں کی طرف سے اس قسم کے مباحثے کا ایک سلسلہ لا متناہی جاری ہے۔ میں نے مسئلے کے پس منظر کو واضح کرنے کے لئے ذرا تفصیل کے ساتھ فریقین کی آراء اور افکار کو بیان کیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں اس مسئلے پر اپنی رائے کا بھی اظہار کر دوں۔

میں مسئلے کی باریکیوں اور پیچیدگیوں میں الجھنا نہیں چاہتا نہ غیر متعلق بحثوں میں پڑنا چاہتا ہوں میں عملی پہلو سے مسئلے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ جب ہر چہار طرف ہما ہمی، زندگی اور حرکت کا دور دورہ ہو، مسلمان جمود کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ اگر وہ رہنا بھی چاہیں تو نئے حالات اور واقعات انھیں حرکت کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ انھیں ذاتی مدافعت اور تحفظ کے لئے حرکت کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ تعطل اور جمود کے معنی بربادی اور موت کے ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمان تین کام کر سکتے ہیں۔ یا تو جو قوتیں پرورش کر رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ متحدہ طور پر یا مختلف قوتوں کے ساتھ فرداً فرداً شامل ہو کر آگے بڑھیں۔ یا اپنے لئے ایک نئی راہ نکالیں اور دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کر کے آگے بڑھیں، یا اپنی موجودہ جگہ پر ایک چٹان یا آہنی دیوار کی طرح مضبوطی کے ساتھ کھڑے رہیں اور تمام مخالف قوتوں کا تن تنہا مقابلہ کرتے رہیں کہ پھر ان کے اس طرح پڑے رہنے کو لوگ جمود و تعطل نہیں کہیں گے بلکہ مدافعتی اقدام و حرکت سے تعبیر کریں گے۔ بہر حال یہ تین راہیں ہیں ——— تیسری راہ کو میں سب سے پہلے لیتا ہوں۔ کیوں کہ اس کے متعلق مجھے سب سے کم کہنا ہے۔ اس راہ کو وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو اپنے موجودہ املاک اور مقبوضات کا تحفظ ضروری سمجھتے ہوں۔ سو موجودہ نظم و انتظام میں مسلمانوں کو من حیث الجماعت کچھ ایسے امتیازی حقوق حاصل نہیں ہیں کہ جن کے پامال ہو جانے کا نئے انتظام میں اندیشہ ہو۔ چند زمیندار اور وہ مقروض، چند تاجر جن کی حالت کچھ مضبوط نہیں، اور چند حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار جو اپنی پوری تنخواہ مہینے کے پہلے ہفتے میں بلوں کی ادائیگی پر صرف کر دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بقیہ بل کس طرح ادا کریں ——— یہ مسلمانوں کے طبقۂ امراء کی کل کائنات ہے۔ باقی سب جمہور ہیں۔ ان کی حالت کو کوئی بھی نیا انتظام

موجودہ حالت سے پست تر نہیں کر سکتا۔ ان کا سب سے زبردست مال ومتاع اُن کی وہ زنجیریں ہیں جو انہیں باندھے ہوئے ہیں۔ انھیں کو ان سے چھینا جا سکتا ہے۔ ان کے پاس دوسری اور کوئی چیز ضائع کرنے کے لئے نہیں۔ اس لئے تبدیلی اور حرکت کا اُن سے زیادہ کون خواہاں ہو سکتا ہے۔ ان کا قیام اور عدم حرکت کسی لالچ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ خاص کاہلی، کم ہمتی اور بزدلی کی وجہ سے ہے۔ کاہلی دور کیجئے جوش دلائیے یہ ضرور آگے بڑھیں گے۔

اس بات سے برطانوی مدبر اور سیاست داں بہت چراغ پا ہوں گے۔ سر آغا خاں کو بھی غالباً غصہ آئے گا کہ نصف صدی کی پیہم اور مسلسل کوشش کا یہ نتیجہ نکلا! بات دراصل یہ ہے کہ یا تو بیج شور زمین میں ڈالا گیا، یا بیج بونے والوں نے سڑا ہوا بیج بویا۔ بہرحال سبب جو کچھ بھی ہو نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے۔ ایم اے او کالج، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، اصلاح تمدن ومعاشرت کی کانفرنس، ہر ضلع میں مسلم ہائی اسکول آل انڈیا مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی، تنظیم کانفرنس، تبلیغ کانفرنس، آل انڈیا مسلم کانفرنس۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب، ملازمتوں میں نمائندگی کا تحفظ، مخصوص نامزدگیاں، وزارت میں تناسب سے زیادہ شرکت، سینکڑوں ہندو مسلم فسادات، کمیونل اوارڈ اور ہزاروں اور چھوٹی چھوٹی رعائتیں ——— سب کا ماحصل یہی ہے اور مسلمانوں کے لئے جیسے ۱۸۵۷ء میں غیر مطمئن یا مطمئن ہونے کا موقع تھا ایسا ہی ۱۹۵۷ء میں بھی ہے۔ ان کے لئے ان تمام مقویات میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی قلب ماہیت ان چیزوں میں سے کسی سے نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ اپنی سخت جانی کی وجہ سے تو بے شک انہیں کنزرویٹو پارٹی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے پاس کنزرو کرنے یعنی محفوظ رکھنے کے لئے درحقیقت کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ ان کی اکثریت تو ہمیشہ کی انقلابی ہے، اور اب بھی جب کبھی موقع ملے گا انقلابی ہی بن سکے گی ورنہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بیٹھی ہی ہے۔ اس لئے ان سے یہ توقع کرنا کہ یہ ہمیشہ اپنی موجودہ جگہ پر چٹان اور پہاڑ کی طرح کھڑے رہنا پسند کریں گے فضول ہے۔

اب رہ گئے دو باقی ماندہ راستے۔ ان میں سے دوسرے راستے یعنی اپنے لئے ایک نئی راہ نکالنے اور دوسری قوموں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے ایک عرصے سے کوششیں جاری ہیں۔ سید

جمال الدین افغانی نے اتحادِ اسلامی کی تحریک اٹھائی۔ مولانا محمد علی مرحوم ، مولانا ظفر علی خان ، مولانا ابوالکلام آزاد ، ڈاکٹر انصاری ، غرضکہ سنہ ۱۹۲۰ء تک تقریباً تمام ہی مسلمان لیڈروں نے خلافت اور اتحادِ اسلامی کی راہ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ مسلمان عوام نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ان تحریکوں کا خیر مقدم کیا۔ اور اپنی بساط کے مطابق ہر قسم کی جانی اور مالی قربانیاں ان کے لئے کیں۔ ترکی کو میڈیکل مشن بھیجے۔ خلافت کی تحریک میں شورش و ہنگامہ برپا کرکے انگریزوں کو پریشان کیا۔ ملک سے ہجرت کی۔ موپلاؤں کی بغاوت ہوئی غرضکہ خوب جوش و خروش دکھلایا گیا۔ لیکن ہندوستان کی سیاست میں کس طرح حصہ لیا جائے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات کو روا رکھا جائے ، اس کا تعین نہ ہو سکا۔ خلافت کے مسئلے پر ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ اخباروں کے کالم ، رسالوں کے صفحات اور لوگوں کے دماغ اس لٹریچر سے معمور کر دئے گئے۔ لیکن برادرانِ وطن جس چیز کے لئے شورش کر رہے تھے یعنی سوراج اس سے عامۃ المسلمین کو واقف کرنے اور دلچسپی پیدا کرانے کی زحمت بہت کم لوگوں نے گوارا کی۔ اسی لئے ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کی جو پوزیشن ہونی چاہئے وہ کسی پر پوری طرح واضح نہ ہو سکی۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے ریفارم ایکٹ پر ملک میں عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی تحریک خالص سیاسی آزادی کی تحریک تھی۔ لیکن ہماری تحریک قیامِ خلافت اور آزادی جزیرۃ العرب کے لئے تھی۔ گویا تقسیم عمل یہ کی گئی تھی کہ سوراج ہندو لے لیں اور ہمیں ترکی کا خلیفہ مل جائے اور ہمارے مقاماتِ مقدسہ عربوں کے ہاتھوں میں رہیں۔ یہ ہو جائے تو پھر مسلمان مطمئن ہیں اور انہیں کچھ اور نہیں چاہئے۔ شاعر نے اس شعر میں ؎

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آنِ من
از سقف خانہ تا بہ ثریا از آنِ تو

جب حصہ تقسیم کیا تھا تو خاکساری سے کام لیتے ہوئے اپنے لئے صرف گھریلو چیزیں رکھی تھیں اور پوری فیاضی کے ساتھ باقی تمام چیزوں کو اپنے شریک کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم نے اس کے بالکل برعکس کیا ہم نے آسمان کی سب چیزیں تو خود لے لیں اور زمین کی چیزوں کو اپنے برادرانِ وطن کے لئے چھوڑ دیا ؎

آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما !

آج کل بھی مسلمانوں میں شورشیں ہوتی ہیں تو مسجد شہید گنج کے لئے جلسے کئے جلتے ہیں تو قادیانیوں کے خلاف اور مدح صحابہ کی تائید میں۔ پھر یہ ہنگامے بھی وقتی اور موسمی ہوتے ہیں۔ پھلجھڑی کی طرح کچھ دیر بھر دکھا کر ختم ہو جاتے ہیں اور اپنا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑ جاتے۔ کوئی واضح سیاسی نصب العین متعین ہونے نہیں پاتا، کوئی منظم مستقل اور مضبوط جماعت یا ادارہ نہیں بنتا۔ مسلمانوں کے افراد جیسے پہلے منتشر تھے ویسے ہی بعد میں بھی رہتے ہیں۔ اور ان تحریکات کے رد عمل سے لوگوں میں ایک مایوس کن بے حسی ناپروائی اور غیر ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔

اس وقت لے دے کر مسلمانوں کا اگر کوئی واقعی سیاسی ادارہ ہے تو وہ مسلم لیگ ہے لیکن اس کی تنظیم جس قدر ناقص، اس کی لیڈر شپ جس قدر رلبودی اور پھسپھسی، اس کا نصب العین جس قدر کورا اس کے عناصر جس قدر غیر ہم آہنگ، اس کی رکنیت اور حلقۂ اثر جس قدر محدود اور غیر یقینی، اس کی آواز جس قدر کم زور اور اس کی جد وجہد جس قدر بے اثر ہے وہ شاید آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے لئے بھی باعث شرم ہوگی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کرنا تو کجا خود اپنے عناصر کو باہم متحد نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے ایک طاقت ور قوت بن کر اپنے واسطے ایک الگ سیاسی راہ نکالنے سے بالکل قاصر ہیں۔ یہ بات تلخ ہے ناگوار معلوم ہوتی ہے لیکن ہے بہرحال حقیقت۔ اس وقت ضرورت حقیقتوں کو سامنے رکھنے کی ہے۔ ہم نے خیال پرستیوں میں بہت زمانہ گذار دیا۔ اب بھی موقع ہے کہ سنبھل جائیں اور بے نتیجہ کاموں میں اپنی قوتوں کو ضائع نہ کریں۔

اس راہ سے بھی مایوس ہونے کے بعد اب تیسری راہ یہ رہ جاتی ہے کہ ملک میں جو قوتیں ترقی پا رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ متحدہ طور پر یا مختلف قوتوں کے ساتھ فرداً فرداً شرکت کی جائے یہ ظاہر ہے کہ سیاسی فرقہ بندیوں کا جو موجودہ انداز ہے اس کے پیش نظر مسلمان من حیث الملت کسی ایک سیاسی جماعت کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ ان میں سے جو سوشلسٹ خیال کے ہیں وہ سوشلسٹ کے ساتھ ملیں گے اور جو کنزرویٹو یا برطانیہ پرست ہیں وہ کنزرویٹو جماعت اور برطانیہ کے شریک ہوں گے۔ یہ ناگزیر ہے۔ موجودہ صورت حالات میں اس رجحان کو کوئی قوت نہیں بدل سکتی۔ سیاسی

معاملات میں مسلمانوں میں افتراق اور انتشار ضرور ہوگا چنانچہ یہ نہایت تیزی سے شروع بھی ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ انفرادی حیثیت سے کانگریس میں شرکت کر رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ تمدنی اور مذہبی معاملات میں بھی اگر ان کو سیاست سے علحدہ رکھا جائے یہی انتشار ظاہر ہو۔ سیاسی حیثیت سے مختلف الخیال مسلمان مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے تحفظ کے لئے باہم مشترک ہو سکتے ہیں اور اگر خالص تمدنی اور مذہبی اداروں کو غیر سیاسی اصولوں پر چلایا جائے تو یہ چل بھی سکتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے کچھ ادارے مسلمانوں میں موجود ہیں جن کے ساتھ سب کو ہمدردی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر مسلمان سنجیدگی سے اس بات کی خواہش کریں تو ملک کے ہر صوبے ضلع اور دیہات میں اس قسم کے اور بہت سے اداروں کی گنجائش نکل سکتی ہے اور ان کی موجودگی میں مسلمانوں کے تمدن مذہب اور زبان کی پوری حفاظت ہو سکتی ہے۔

اب رہا اس بات کا اندیشہ کہ چونکہ ہندو اکثریت میں ہیں اور چونکہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات ایک عرصے سے نہایت ناخوش گوار چلے آرہے ہیں اس لئے ہندوؤں کو حکومت کا اقتدار ملنے کے بعد اس بات کا پورا موقع مل جائے گا کہ مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور زبان کو فنا کر دیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں جہاں وہ اکثریت میں ہیں اور جب تک ڈیماکریسی کا کام اکثریت کے فیصلے سے ہوتا ہے وہ موقع تو انھیں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی جماعت بندی کے بعد بھی ایسا ہی حاصل رہے گا، جیسا کہ ان کی جداگانہ سیاسی جماعت بندی نہ ہونے کی حالت میں ہوگا۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بہر حال جداگانہ جماعت بندی کے بعد بھی اتنی ہی رہے گی جتنی پہلے تھی۔

رہا سوال مناسب احتجاج کا تو وہ جداگانہ تمدنی تنظیم کے ذریعے بھی اتنے ہی شد و مد کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جتنا جداگانہ سیاسی جماعت بندی کے ذریعے۔ بلکہ میرے خیال میں تمدنی تنظیم کا اثر زیادہ وسیع اور اس میں سیاسی پیچیدگیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی کا امکان نسبتاً کم، اور وسیع المشرب ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کرنے کا امکان نسبتاً زیادہ ہوگا۔ جب مسلمانوں کے دوسرے مذہب والوں سے سیاسی تعلقات خوش گوار ہوں گے تو وہ تمدنی اور مذہبی معاملات میں بھی اُن سے تعلقات

بجا طور پر نانہ چاہیں گے۔ اور رواداری سے کام کریں گے۔ چنانچہ جن جن غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعتوں میں مسلمان شامل ہیں اور اپنا کام وہاں خلوص اور دیانت سے انجام دیتے ہیں ان میں ان کے جذبات کا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ تعصب کی جتنی مثالیں پیش کی جاتی ہیں وہ ان ہی جگہوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں جہاں سرکار برطانیہ کا اقتدار غالب ہے۔ قومی حلقوں میں یہ وبا بہت کم ہے اور جتنی زیادہ تعداد میں مسلمان اِن میں شرکت کریں گے اور ان کی آواز وہاں اہمیت حاصل کرتی جائے گی اتنی ہی ان کی پاسداری زیادہ کی جائے گی۔ چنانچہ اردو ہندی کے مسئلہ پر مہاتما گاندھی کے تازہ ترین بیانات اُن کے پچھلے بیانوں کے مقابلے میں زیادہ رواداری پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی اور صدہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں

نتیجہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے جداگانہ جماعت بندی نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ مذہبی اور تمدنی اغراض کے لئے اپنی تنظیم ضرور کرنا چاہیئے۔

رفتار عالم

مصر ہمارا خیال تھا کہ تنسیخ مراعات کانفرنس کی کارروائیاں، بالتفصیل نہیں تو اختصار کے ساتھ ضرور اردو اخبارات میں آجائیں گی، اسی لئے گذشتہ اشاعت میں مراعات کی تنسیخ پر ایک مختصر سا تبصرہ کافی سمجھا، لیکن اردو اخبارات نے ضمنی تذکرہ کے سوا، مراعات پر بہت کم لکھا ہے اس لئے ضروری ہوا، مانتروکانفرنس کا ایک خلاصہ جامعہ میں شائع کردیا جائے۔

مراعات کی بلا مصر پر سولھویں صدی میں نازل ہوئی تھی، دنیا کا یہ واحد ملک ہے جہاں اتنے طویل عرصہ تک مراعات کا سلسلہ اپنی مکمل صورت میں جاری رہا در یں صورت کہ تمام متعلقہ طاقتیں یہ یقین رکھتی تھیں کہ مراعات کی بیڑیاں وقت کے تقاضے، زمانہ کی فضا، جمہوریت کے اصول کے سراسر منافی اور مصری حکومت کی ترقی میں سدراہ ہیں،

مراعاتی نظام کی ابتدا ترکی خلفا کے عہد میں ہوئی، جنھوں نے مخصوص عیسائی حکومتوں کی رعایا کے لئے اپنے دائرہ سلطنت میں بعض داخلی آزادیاں نوازش فرمائی تھیں، مشہور ترکی خاتون، خالدہ ادیب خانم نے جامعی تقاریر میں، ترکی کے اسباب زوال کی فہرست گناتے ہوئے ان مراعات کا بھی ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ "سلطنت کی معاشی بربادی کی رفتار کو تیز اور اس کی نحوستوں کو وسیع کردینے والی چیز یہ "مراعات" ہی تھیں، ترکوں کے قسطنطنیہ کو فتح کرنے سے پہلے بازنطینی سلطنت نے بھی غیر ملکیوں کو یہ حقوق دے رکھے تھے بحیرہ روم کے کنارے جتنے خطے واقع ہیں ان سب میں مختلف قومیں آباد ہیں اور سب تجارت پیشہ ہیں۔ ایسے ملکوں میں جہاں رسم و رواج اور تمدن میں اس قدر اختلاف ہو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ سب کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور ہر قوم اجتماعی مفاد کے لئے تھوڑی بہت قربانی کرے۔ غرض ایشیائے کوچک میں غیر ملکیوں کے

مخصوص حقوق تجارتی اور معاشی حیثیت سے ضروری تھے۔" پھر براؤن کی کتاب "ترکی میں غیر ترکی" کا حوالہ دیتے ہوئے بتلایا "عثمانی ترک جو بازنطینی سلطنت کے جانشین ہوئے اتنے قوی تھے کہ اگر چاہتے تو ان انتظامات کو منسوخ کر دیتے۔ اس لئے ان کا ان حقوق کی توثیق کرنا نہ صرف ان کی رواداری کا بلکہ ان کی مصلحت شناسی کا بھی ثبوت ہے ...... سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۲ء میں اہل جنیوا کے حقوق کی توثیق کی، سلیمان[٩١] اعظم نے ۱۵۳۵ء میں فرانس سے دوستی اور تجارت کا معاہدہ کیا اور اس کے بعد[٩٢] اور ریاستوں سے بھی تجارتی معاہدے کئے گئے۔ ان سے دونوں فریقوں کو فائدہ پہنچا اس لئے کہ دونوں کو اپنے مال کے لئے بازار کی ضرورت تھی۔

مگر جب عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی تو ان حقوق کی جو ابتدا میں صرف تجارتی حقوق تھے، صورت بدل گئی، ترکوں کی ہر شکست کے بعد ہر فتح پانے والی قوم مراعات میں اپنے لئے ایک نئی

---

٩١ سلیمان اعظم قانونی جس نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ شارلکان (اپنے وقت کا سب سے بڑا یورپی بادشاہ) کے مقابلہ میں فرانس کی مدد کی تھی، فرانس سے ایک دوستانہ تجارتی معاہدہ بھی کر لیا تھا، اس کی رو سے فرانسیسی تاجروں کو قلمرو عثمانیہ میں خاص مراعات حاصل ہو گئی تھیں۔

٩٢ سلطان سلیم ثانی نے فرانس کے ساتھ عہد سابق کی تجدید کی اور اس کے سفیر کو حق دیا کہ وہ فرانسیسی قیدیوں کو جو ترکی غلامی میں ہوں آزاد کر سکتا ہے۔ نیز تمام فرانسیسیوں پر سے جو عثمانی حکومت کے دائرہ اثر میں تھے شخصی خراج اٹھا دیا گیا، فرانسیسی کشتیاں محفوظ قرار دی گئیں اور جن کے نقصان کی تلافی حکومت عثمانیہ نے اپنے ذمہ لی، ان مراعات سے سواحل بحر روم پر فرانسیسی تجارت کو آزادی مل گئی۔ احمد اول کے زمانہ میں ہالینڈ کے ساتھ تجارتی معاہدہ ہوا اور جو مراعات فرانس کو دی گئی تھیں اس کے تاجروں کو بھی دی گئیں۔ اور فرانس کے حقوق میں کچھ اور اضافہ کر دیا گیا اور پھر رفتہ رفتہ انگلستان، ہنگری، آسٹریا، سویڈن، سسلی، ڈنمارک، پرشا، اسپین، روس، امریکہ، بلجیم، جرمنی، پرتگال، اور یونان سب ہی نے مراعات حاصل کر لیں۔

بندہ کا اضافہ کر دیتی تھی اور حکومت اس کو مجبوراً منظور کرتی تھی، اور پھر یہ حقوق صرف تجارت تک محدود نہیں رہے بلکہ عدالتی امور پر بھی حاوی ہو گئے۔ غیر ملکی لوگ اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے علیحدہ علیحدہ عدالتوں کا مطالبہ کرنے لگے یہاں تک کہ ترکی سلطنت کی رعایا میں سے بعض عیسائی فرقوں نے ان امور میں دوسری ریاستوں کی حمایت حاصل کر لی۔ اگر ان کا کوئی شخص عثمانی رعایا میں سے کسی شخص کو زدوکوب کرے تو مقدمے کا فیصلہ غیر ملک کے قونصل کی عدالت میں ہوتا تھا۔ اگر کہیں عثمانی رعایا میں سے کسی نے ان کے کسی آدمی پر ہاتھ اٹھایا تو یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ غیر ملکی جہازوں کے بیڑے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کے لئے آ پہنچتے تھے اس کے علاوہ جہاں باب عالی نے کوئی نئی اقتصادی پالیسی اختیار کرنی چاہی تو وہ حکومتیں جن کی رعایا کو یہ خاص حقوق حاصل تھے فوراً مداخلت کرتی تھیں، بغیر ان کی مرضی کے کوئی تجارتی محصول عاید یا منسوخ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ کسی جگہ ریل بنائی جا سکتی تھی۔ خواہ اقتصادی یا جنگی مصلحت سے کتنی ہی سخت ضرورت کیوں نہ ہو، پھر یہ مصیبت بھی کہ ان حکومتوں میں اکثر معاملات پر اتفاق رائے بھی نہیں ہوتا تھا۔"

مصر سلطان سلیم اول کے زمانہ میں مملکت ترکی میں شامل ہوا تھا اور ترکی کے ہر دوسرے علاقہ کی طرح یہاں بھی مراعات دی جاتی رہیں۔

جنگ عظیم کے بعد خود ترکی میں ان مراعات کا نام و نشان تک مٹ گیا، لیکن مصر چونکہ اب ترکی سے الگ تھا، اس لئے برطانوی اقتدار کے طفیل میں "نیل کا یہ فیضان" بڑی فیاضی کے ساتھ جاری رہا اور یہی نہیں بلکہ ۱۹۳۱ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ان مراعات کی مدت غیر محدود عرصہ کے لئے بڑھا دی گئی۔

مصر میں مراعاتی ملکوں کی رعایا جن پابندیوں سے آزاد تھی ان میں ایک ٹیکس[۱]، کسٹم اور ڈیوٹی اس

---

[۱] مراعاتی ملکوں نے اپنی رعایا کے لئے جن محصولوں کی اجازت دی تھی وہ صرف دو ہیں ۱۔ مکان کا ٹیکس اور ۲۔ زمین کا ٹیکس، لیکن چونکہ یہ لوگ عام طور مکان اور زمین پر روپیہ ہی نہیں لگاتے، اس لئے ان مدوں کی آمدنی بہت کم تھی۔

یں شامل نہیں ہیں) بھی تھا، اِلا یہ کہ متعلقہ حکومت خود راضی ہو، حکومت مصران اجنبیوں کو نہ رہنے بسنے سے روک سکتی تھی، اور نہ اس کو گرفتاری و جلاوطنی کا اختیار تھا، اور اس سے زیادہ یہ کہ یہ لوگ شہری حقوق میں صرف اپنے ملک کے قانون کے پابند تھے۔ گویا مصر میں ایک ہی حکومت کے اندر درجنوں مختلف قانون جاری تھے، جب قانون اس کثرت سے ہوں تو عدالت کی وحدت کیسے کافی ہوتی، بالآخر قنصلی عدالتوں کی ابتدا ہوئی (ہر ملک کے قونصل کے زیر نگرانی مقدمات فیصل ہوتے) ان عدالتوں کو ہر قسم کے مقدمات کی سماعت کا حق تھا خواہ وہ دیوانی ہوں یا فوجداری؛ لیکن ان عدالتوں نے مقدمات میں بڑی الجھن پیدا کردی۔ فریقین اگر ایک ہی ملک کے ہوں تب تو کوئی دقت نہ تھی، لیکن جب دو مختلف ملکوں سے متعلق ہوں تو فیصلہ کس قانون سے ہو؟ اس لئے مخلوط عدالتیں وجود میں آئیں (۵، ۱۸۶۴) تاکہ قنصلی عدالتوں کی بے شمار خرابیوں کا انسداد کریں۔ تمام مقدمات فوجداری، دیوانی اور تجارتی اب مخلوط عدالتوں کی طرف منتقل کر دئے گئے، جہاں ہر قوم کا اپنا منصف[۹۱] فیصلہ کرتا۔ یہ عدالتیں جہاں تمام غیر ملکی رعایا کی تجارتی اور دیوانی مقدمات فیصل کرتی ہیں وہاں وہ تنازعات بھی ان ہی کے پیش ہوتے ہیں جو اجنبیوں اور مصریوں کے درمیان پیش آتے، مخلوط عدالتوں کو یہ بھی حق تھا کہ وہ اجنبیوں کے مسائل میں مصری قوانین کو مسترد کردیں؛ اگرچہ مخلوط عدالتیں غیر معمولی طور پر اچھا کام کررہی تھیں لیکن مراعات کا دیو، مصر کی بڑھتی بیداری اور مکمل خود مختاری میں حائل تھا، اور حکومت

---

[۹۱] ان عدالتوں کے جج ساری عمر کے لئے مقرر کئے جاتے تھے اور مصری حکومت ان کا تمام صرفہ برداشت کرتی تھی، عموماً تمام مراعاتی ملکوں کو اپنے منصف کے نام تجویز کرنے کی دعوت دی جاتی تھی — بعض اوقات غیر مراعاتی ملکوں کے نمائندے بھی مقرر ہو جاتے تھے، منصفوں کی تعداد اصل میں ۲۴ مقرر ہوئی تھی (۱۶ غیر ملکی ۸ مصری) لیکن غیر معین طور پر اس میں اضافہ کیا جا سکتا تھا تاکہ غیر ملکی منصفوں کا تناسب مصری منصفوں کے مقابلہ میں بے اثر نہ ہونے پائے، ۱۹۳۷ء کے شروع میں ان منصفوں کی تعداد ۷۰ تھی (۴۴ غیر ملکی، ۲۶ مصری) صدر عدالت کا غیر ملکی ہونا ضروری تھا۔

یے لئے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ اجنبیوں پر قانوناً محصول عاید نہیں کرسکتی تھی، اور اس پابندی کی وجہ سے اسے مصریوں سے محصول وصول کرنے میں اور نئے محصول عاید کرنے میں بڑی دقتیں پیش آتیں، اور یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ امیر طبقہ (غیر ملکی تجار وغیرہ) تو محصول سے یکسر متبری ہو اور ملک کے غریب طبقہ (مصری) پر محصول پر محصول بڑھاتے چلے جائیں، برطانوی مصری[۵۱] معاہدہ کے بعد مصر کی "مکمل آزادی" یعنی جمعیت اقوام کی رکنیت کے لئے صرف یہ مراعات ہی ایک رکاوٹ رہ گئی تھی۔ اس لئے ان کی تنسیخ اور بھی ضروری تھی۔

معاہدہ میں یہ طے ہوگیا تھا جتنی جلد ممکن ہو مصری حکومت مراعاتی ملکوں سے مل کر مراعات کو ختم کردینے کی کوشش کرے۔ اور ان رکاوٹوں کو دور کرے جو مصری قانون کو غیر ملکیوں پر عاید کرنے میں حایل ہیں، اور وقفہ' انتقال' کی ابتدا کی جائے جس میں صرف مخلوط عدالتیں باقی رکھی جائیں گی اور کونسلر عدالتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس سلسلہ میں برطانیہ نے پیش از پیش عملی قدم اٹھانے اور متعلقہ

---

۵۱ اگست ۱۹۳۶ء میں برطانوی مصری معاہدہ مکمل ہوا جس کی رو سے "نہر سوئز کا طبقہ" ۲۰ سال تک انگریزوں کے تسلط میں رہے گا، برطانیہ کو حق ہے کہ وہ دس ہزار سپاہی، چار سو ہوا باز، اور انتظامی افسروں کی ایک معقول تعداد یہاں رکھے، اندر صحرائی علاقہ میں، سب فوج تو نہیں مگر افسر داخل ہوسکتے ہیں۔ برطانوی ہوائی جہاز سارے مصر کو اپنی فضائی مشق کے لئے استعمال کرنے میں مجاز ہیں اور تمام ہوائی مستقر کا بلا برطانیہ کے اختیار میں رہیں گے، اسکندریہ ۱۹۴۴ء تک خالص برطانوی بیڑہ کے لئے استعمال ہوگا، مصری حکومت کو نہر سوئز کی تمام چوکیاں اور بارکیں اپنے خرچ پر تعمیر کرنا ہوں گی، دہانہ نیل میں نئی سڑکیں اور ریلیں بنانا پڑیں گی، اور ایک ایسی ریلوے لائن بھی تیار کرنی ہوگی جو برطانوی فوجی علاقہ کو قاہرہ سے جوڑ دے۔

معاہدہ سے پیشتر ہر مصری وزیر ایک برطانوی مشیر رکھنے پر مجبور تھا، جن کی تنخواہوں کا بھاری بوجھ بھی مصری خزانہ پر تھا، اور عموماً برطانوی افسران ان عہدوں پر قابض تھے جو صحیح معنی میں حکومت کی کنجیاں تھیں، اب یہ رفتہ رفتہ غائب ہو جائیں گے، سب سے پہلے مالیات اور عدلیہ کے افسران کی باری آئے گی، ٹیکنیکل افسر

حکومتوں پر تنسیخ مراعات کے لئے اپنا اثر ڈالنے کا وعدہ کیا۔ شرط صرف یہ تھی کہ غیر ملکیوں پر کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو جدید اصول قانون سازی کے خلاف یا جس سے غیر ملکی لوگوں یا اداروں کے مالی معاملات میں کوئی تفریق پیدا ہو۔

وزارت خارجہ برطانیہ نے اس سلسلہ میں بڑی "تندہی" اور "درمندی" کا ثبوت دیا۔ فارن آفس کے مشیر قانونی دوم مسٹر ڈبلو، وی، بیکٹ ۱۲ جنوری کو مصر آئے، اور حکومت مصر سے ابتدائی گفتگو کر کے ۱۶ ار کو مراعاتی اقوام اور سوئزرلینڈ[۱] کے نام ایک گشتی خط بھیجا، جس میں ۱۲ اپریل کو مانتروین کانفرنس

بقیہ گذشتہ :- باقی رہیں گے، تا وقتیکہ اچھے تربیت یافتہ مصری ان کی جگہ لینے کے لئے مہیا ہو جائیں لیکن اب انگریز کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے پہلے ان کی پشت پر ریذیڈنسی تھی اور ریذیڈنسی کے پیچھے قلعہ کی حفاظتی فوج۔ اب ان غریبوں پر صرف ایک سفیر کا سایہ ہے اس سے ایک نئی نفسیاتی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک انگریز کی گفتگو سنئے جو مصری ریلوے کا ایک انجنیر ہے "میں سترہ سال سے کام کر رہا ہوں، اب مصریوں نے معاہدہ کر لیا ہے۔ اب میں مصر میں بس اسی وقت تک ہوں جب تک میرے وطنی دوست یہاں ہیں، میرے معاہدہ میں تین سال کی توسیع کر دی گئی ہے۔ لیکن مجھے ابھی سے معلوم ہے کہ میری جگہ کون لے گا۔ وہ ابھی ابھی برسٹل یونیورسٹی سے واپس آیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ان کا عہدنامہ بہت مناسب ہے، اب موقعہ ایسا ہی ہے کہ انگلستان کو ان لوگوں کے ساتھ دوست کی حیثیت سے رہنا ہی موزوں ہے، لیکن کسی کو یہ فکر نہیں کہ ہمارا کیا ہوگا"

[۱] جنگ عظیم کے بعد سے ۱۲ حکومتوں کو مراعات حاصل رہی ہے۔ بلجیم، ڈنمارک، فرانس، برطانیہ، یونان، اٹلی، ہالینڈ، ناروے، پرتگال، اسپین اور سویڈن۔ سوئزرلینڈ قانونی طور پر کبھی مراعاتی ملک نہیں رہا لیکن ہمیشہ مراعات سے مستفید ہوتا رہا ہے۔ جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کو معاہدات امن نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے مراعاتی حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ انقلاب روس کے بعد روس بھی تعلقات کے بگڑ جانے کے باعث "مراعات کی لازمی شرط" "قونصلر عدالت کا قیام" کو پورا

منعقد کرنے کی دعوت دی، ۲۰ فروری کو دوسرا خط بھیجا گیا اس میں امور زیر غور کی فہرست تھی، بالآخر ۱۱ اپریل کو کانفرنس شروع ہوئی، "وقفہ انتقال" (Transitional period) کے واسطے مخلوط عدالتوں کی تنظیم کے لئے مصری وفد نے ایک اسکیم پیش کی، یہی مباحثہ کی بنیاد قرار پائی، اور طے پایا کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء سے تمام مقدمات قونصلی عدالتوں سے مخلوط عدالتوں کی طرف منتقل کردئے جائیں گے اور مصری حکومت ان مخلوط عدالتوں کے لئے فوجداری کا ایک ضابطہ تیار کرے گی۔ نیز یہ کہ اجنبی اب ہر معاملہ میں مصری قانون کی اطاعت پر مجبور ہوں گے اس میں دیوانی، فوجداری، تجارتی اور مالی مسائل کی تخصیص نہیں ہوگی، البتہ مصر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا قانون، جدید اصول قانون سازی کے مطابق ہو۔ اس طرح ایک طرف تو قنصلی عدالتیں ختم ہوئیں اور صرف مخلوط عدالتیں باقی رہیں، اور پھر قانون کے مصری ہونے کی وجہ سے ان عدالتوں کی خود مختاری کا بھی خاتمہ ہوگیا، اجنبی باشندے اس بات سے بہت مطمئن ہیں کہ کانفرنس نے برطانوی مصری معاہدہ کی اس دفعہ کو جس میں اجنبی باشندوں اور اجنبی اداروں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنے پر زور دیا گیا ہے، اور مضبوط کرلیا ہے، قانوناً یہ شرط محض "وقفہ انتقال" ہی کے لئے ہے، لیکن مصری حکومت نے اپنے ایک متعلقہ اعلان میں یہ تصریح کی ہے کہ اس شرط کے معنی یہ نہیں ہیں ہم وقفہ انتقال کے بعد اجنبیوں کے معاملہ میں امتیازی پالیسی پر عمل کریں گے معلوم نہیں کہ خواہ مخواہ اپنے اوپر یہ پابندی کیوں عائد کرلی گئی ہے؟

مخلوط عدالتیں بارہ سال تک جاری رہیں گی، اس کے بعد یہ عدالتیں اپنے فرائض مصر کی

بقیہ صفحہ گزشتہ:۔ نہیں کررہا ہے، کنونشن میں ۱۹ حکومتوں نے دستخط کئے ہیں، مصر اور بارہ مندرجہ بالا حکومتوں کے علاوہ اتحادی جنوبی افریقہ، آئرش فری اسٹیٹ، کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ہندوستان بھی شامل ہے، برطانوی نمایندے نے آخری چار ملکوں کی طرف سے دستخط کئے اور اطالوی نمایندے نے شاہ اطالیہ و شہنشاہ حبشہ کی جانب سے۔

وطنی عدالتوں کے سپرد کردیں گی، عدالتوں کے سلسلہ میں مصر سے یہ شرط بھی منظور کرالی گئی ہے کہ " وہ تمام اعلیٰ اور ادنیٰ قاضی، منصف اور ملازمین جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی تاریخ تک برسر کار رہیں گے ان کے عہدے اور ملازمتیں برقرار رہیں گی"

مصری وفد چاہتا تھا کہ مخلوط عدالتوں کی قوت حاکمیہ مصری ہو، اس پر زبردست مباحثہ رہا، اس کی منظوری بہت دشوار تھی، اور بالآخر نہیں ہوسکی، اور یہ طے ہوا کہ عدالت مرافعہ میں ۱۸ اجنبی ہوں اور ۱۱ مصری، صدر اور پبلک پراسی کیوٹر کے تقرر کا اختیار اجنبیوں کو حاصل ہوگا۔ پراسی کیوٹر کے دو معاون ہوں گے، معاون اول مصری ہوگا۔ اور معاون دوم اجنبی۔

سوال یہ تھا کہ کسی ملک کے باشندے صرف وہی ہیں جو اس ملک کے اندر رہتے ہیں۔ یا دوسرے علاقوں کے وہ باشندے بھی ہیں، جو اس ملک کے زیر انتداب یا زیر حفاظت ہیں یعنی " فرانسیسی" صرف وہ ہیں جو فرانس کے اندر رہتے ہیں یا شام، لبنان، تری پولی، الجیریا، ٹیونس وغیرہ کے باشندے بھی " فرانسیسی" شمار ہوں گے، اس پر زبردست مباحثہ ہوا، " اجنبی" کے محدود مفہوم پر فرانس کو خاص طور پر اعتراض تھا، اور مصر خود بھی کچھ ' وسعت' کی طرف مائل تھا تاکہ حبش کے باشندوں کو افادی رعایا کی حیثیت سے مراعات دے سکے، اس لئے " وسیع" مفہوم کی جیت ہوئی، البتہ شام، لبنان، فلسطین، اور شرق اردن کے " انتدابی" علاقے اس رعایت سے محروم قرار پائے۔ حکومت مصر نے جرمنی، آسٹریا، ہنگری، پولینڈ، رومانیا، سوئزرلینڈ زیکوسلاوکیا، اور یوگو سلاویا کو از خود مراعات دینے کا اعلان کیا ہے موجودہ سیاسی حالات میں یہ بخششیں خلاف مصلحت نہیں معلوم ہوتیں۔

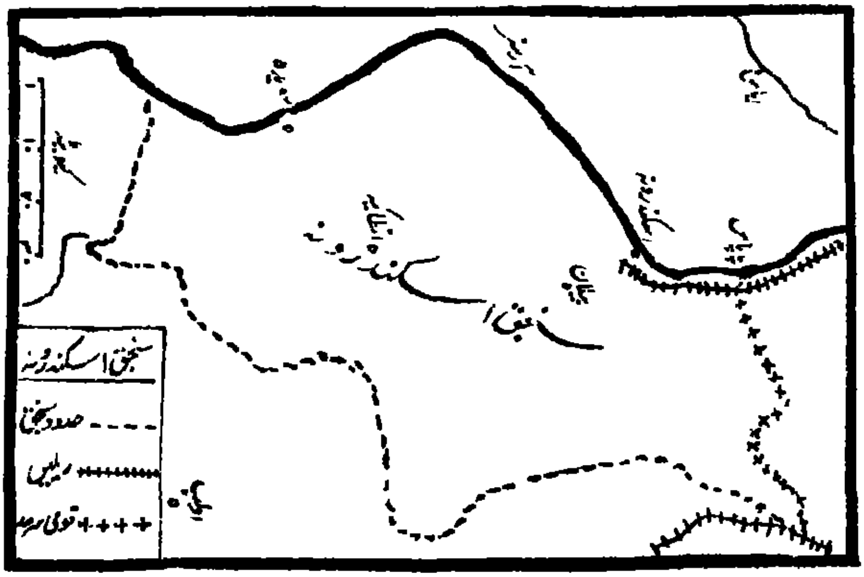
حکومت مصر نے اپنے ایک اعلان میں جس میں اقلیتوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کا اطمینان دلایا ہے یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ وہ دوسری قوموں اور ممالک سے دوستانہ معاہدے کرنا چاہتی ہے، اسی سلسلہ میں مصری امیر وفد مصطفےٰ نحاس پاشا نے امریکہ، فرانس، اطالیہ، یونان اور ہالینڈ وغیرہ کے نمایندوں سے تبادلہ خیالات بھی کیا۔

مانتروکے معاہدہ کی جن شقوں پر اعتراضات ہورہے ہیں ان میں ایک تو یہ ہے کہ مجوزہ عدالتوں میں عربی، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی چار زبانوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہوگی، اندیشہ ہے کہ عملی طور پر عربی کو کوئی اہمیت نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ مصر میں کیتھولک عیسائیوں کو تبلیغ مذہب کی وہ تمام آزادیاں بدستور حاصل رہیں گی جو اس وقت حاصل ہیں، اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ فرانس نے اس شرط پر شدید اصرار کرتے ہوئے یہ بتلایا کہ میں اسے منظور کرانے کے لئے پاپائے اعظم کی طرف مجبور ہوں، جنھوں نے حکم دیا ہے کہ "میں مصر میں عیسائی مبلغین کے رستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہونے دوں"۔ اس معاہدہ کی تکمیل پر عام طور پر مصر میں جوش مسرت کا ثبوت دیا گیا، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مصری وفد کی "کمزوری" پر سخت غم وغصہ کا اظہار کررہا ہے۔ مصر کا ایک بلند پایہ اخبار پوچھتا ہے" مانترو کانفرنس میں مصر نے کیا پایا، یہ ایک سوال ہے جو بار بار زبان پر آتا اور اخبارات کے صفحے رنگین کرتا ہے۔ مگر اب تک نحاس پاشا کی حکومت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا" البلاغ مانتروکے عہدنامہ کو مصر کی شرمناک کمزوری اور بزدلی قرار دیتا ہے، اور نحاس پاشا کی خلاف توقع "برطانیہ نوازی" پر حیرت کا اظہار کرتا ہے جب برطانوی پریس مصر کی آزادی پر پیغام تہنیت پیش کرتا ہے اور مصر سے آواز اٹھتی ہے۔

> "کیا ہم آزاد ہیں؟ ہاں مگر ہم کو دفاع کی اجازت نہیں، اور ہم سے کہا جارہا ہے کہ برطانیہ پر اعتماد کرو، ہاں ہم آزاد ہیں! مگر ہم کسی غیر ملکی حکومت سے تعلقات قائم نہیں کرسکتے، ہاں ہم آزاد ہیں! مگر مصر کو لوٹنے کھسوٹنے والے انگریز تاجروں کے خلاف زبان نہیں ہلا سکتے، ہاں ہم آزاد ہیں! مگر دفاع اور دوسرے اجنبی معاملات اور وطنی ثروت کی حفاظت میں مجبور محض ہیں، ہاں ہم آزاد ہیں اور یقیناً آزاد ہیں اس لئے کہ وزارت کی کرسیوں پر شان کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں ——— اور انگریزوں کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

(البلاغ)

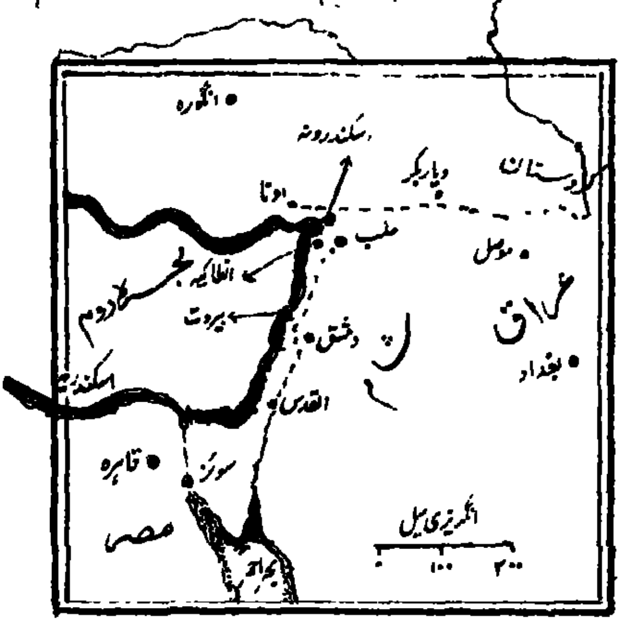
اسکندرونہ | سنجق اسکندرونہ، ایک چھوٹا سا زرخیز علاقہ ہے، ایک لاکھ اسی ہزار اس کی آبادی ہے جن میں ۳۰ فی صدی ترک ہیں اور باقی ارمنی اور شامی۔ اسکندرونہ کا بندرگاہ بھی کوئی بڑا بندرگاہ نہیں ہے۔ یہ قدرتی بندرگاہ ہے۔ حلب کا واحد بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہ خاصا ترقی کر رہا تھا لیکن سنہ ۱۹۱۹ء کے معاہدات صلح نے اس کی ترقی کو صدمہ پہنچایا۔ اس کا مقابلہ رہا بیروت سے، اور بیروت سے یہ جیت نہیں سکا۔ ضلع حلب اور مشرقی سالیشیا جہاں مختلف قسم کی پیداوار اور مصنوعات ہوتی ہیں، اسی بندرگاہ سے جاتی تھیں۔ مگر جب سے ترکی حکومت کا دائرہ محدود ہوتے ہوتے



اسکندرونہ کے شمال میں جا پہنچا تو اسکندرونہ کو زوال آگیا، اور اس کی بندرگاہ بھی ایسی ہی مردہ ہوگئی جس طرح مشرقی کاروانوں کے جنکشن حلب کے بازار سنسان ہوگئے۔

سو کر میسلون (۲۵ جون سنہ ۱۹۲۰ء) میں کامیاب ہوکر فرانسیسی جنرل گورو نے، ملک فیصل کو شہر بدر کیا اور شام کو پانچ حصوں میں تقسیم کردیا۔ حکومت لبنان، حکومت لاذقیہ، حکومت حلب، حکومت دمشق اور سنجق اسکندرونہ اس کے بعد اس تقسیم میں رد و بدل ہوتی رہی لیکن سنجق اسکندرونہ کی حکومت قائم رہی، بحیرۂ روم کی موجودہ سیاست جس سے متاثر ہوکر برطانیہ نے عراق اور مصر کو

"آزادی" بخشی، وادیٔ نیل کی مراعات کو بڑی کوششوں سے "منسوخ" کرایا، اور اب سلم فلسطین کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے پر تیار ہے، اسی نے فرانس کو مجبور کیا کہ وہ انگلستان کی تقلید کرتے ہوئے شام و لبنان کے سرکش باغیوں کے دل ہاتھ میں لے، موقعہ نازک تھا اس لئے موسیو بلوم کی حکومت نے بڑی سرعت سے کام لیا اور ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کو شام اور ۱۳ نومبر کو لبنان کے عہد نامہ پر دستخط ہوگئے مطے ہوا کہ ۲۵ سال تک شام اسی طرح فرانس کا حلیف رہیگا جس طرح مصر برطانیہ کا ہے، اور جنگ کے موقعہ پہ ہر قسم کی مدد کرے گا۔ فوج کے نظم اور قیام کا بوجھ



شام کے خزانہ پر ہوگا لیکن نقل و حرکت فرانس کے احکامات کی پابند ہوگی، معاہدہ کے پانچ سال بعد تک، فرانسیسی فوجیں اس علاقہ میں مقیم رہیں گی تاکہ اقلیتوں کی حفاظت کما حقہ کی جاسکے۔ اسی قسم کا عہد نامہ لبنان کی جمہوریت سے ہوا، اس میں فرانس کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بحری اور بری فوجیں لبنان میں رکھ سکتا ہے۔ شام کے مسئلہ کو اس طرح سلجھا کر، فرانس اطمینان کا سانس لینے نہیں پایا تھا کہ ترکی حکومت نے جمعیۃ اقوام میں یہ شکایت کی کہ "فرانس نے ناجائز طور پر سنجق اسکندرونہ کو شام کو دیدیا ہے"، اصل میں ۱۹۲۱ء میں ترکوں کا فرانس سے معاہدہ

ہوگیا تھا کہ " اسکندرونہ کا علاقہ فرانس کے زیرِ انتداب رہیگا، لیکن تمدن اور زبان کی حفاظت و ترقی کے لئے ترکی آبادی کو پورے حقوق حاصل رہیں گے " اب ترکی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ " اسکندرونہ ہم نے فرانس کے انتداب میں دیا تھا نہ کہ فرانس کے زیرِ انتداب ملکوں کے انتداب میں" اور مطالبہ یہ تھا کہ " اسکندرونہ' کو لبنان اور شام کے مساوی حقوق دیکر آزاد کر دینا چاہیئے " فرانس نے اس ناگہانی مطالبہ کو ٹالنے کی بہت کوشش کی، لیکن پھر بھی جمعیۃ اقوام نے تحقیقات کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی کا تقرر کر ہی دیا' ۲۴ مئی ۳۷ء کو اس کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کر دیں' اور جمعیۃ اقوام میں یہ طے ہوگیا کہ سنجق کو کامل خود مختاری حاصل ہوگی، البتہ معاملات خارجہ میں شام ذمہ دار ہوگا، جمعیۃ نے ایک فرانسیسی کمیٹی کی سفارش کی ہے جس کا کام تنفیذ قانون کی نگرانی ہوگا۔ سنجق اور شام کی حکومتیں ایک دوسرے کے کمشنر کا تقرر کریں گی اور شام کے قنصلی نمائندے سنجق اور وہاں کے باشندوں کے معاملات کے ذمہ دار ہوں گے، اسکندرونہ قطعی طور غیر مسلح رہیگا، نظم قائم رکھنے کے لئے تھوڑی سی پولس کافی سمجھی گئی ہے اس کی تعداد زیادہ سے زیادہ ڈیرھ ہزار ہوسکتی ہے، اقلیتوں کے نسل و مذہب اور زبان کے تحفظ کا قانون میں پورا خیال رکھا گیا ہے اور پھر جمعیۃ خود اس کی نگراں رہے گی' ترکی کو اسکندرونہ کی بندرگاہ کے استعمال کا پورا حق ہوگا، مقننہ' ایک واحد اسمبلی ہوگی جس کے چالیس ممبر منتخب ہوا کریں گے (چار سال کے لئے) عاملہ میں صدر سنجق کے علاوہ ۵ ارکان کی ایک کونسل ہوگی قانون کا نفاذ ۲۹ نومبر ۳۷ء سے عمل میں آئے گا "

اہل اسکندرونہ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ترکی حکومت اسکندرونہ کو خود لینا چاہتی ہے' دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک جماعت جس میں ترکوں کی اکثریت تھی ترکی الحاق کی حامی بن گئی اور دوسری عربوں کی جماعت نے اس الحاق کے خلاف غم و غصہ کا اظہار شروع کیا۔ حتیٰ کہ اسکندرونہ کے فسادات نے بڑی اہمیت حاصل کر لی، عام خیال یہ ہے کہ یہ سب فرانس کی شرارت ہے وہ اسکندرونہ والوں کو آپس میں لڑا کر دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ لوگ عام طور پر ترکوں سے بیزار ہیں، ناجی مکب اصل وزیر خارجہ

حواق نے پچھلے دنوں ' الاہرام ' کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا " اپنے اس قیام دمشق سے جو اثر میرے ذہن و قلب پر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اہل شام ترکوں کو اپنا دینی بھائی سمجھتے ہوئے ان سے دوستی اور محبت رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسکندرونہ کا مسئلہ بہت جلد صلح و صفائی کے ساتھ طے ہو جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک یورپی حکومت کے جاسوس اور ایجنٹوں نے اہل شام کو ترکوں کے خلاف بھڑکانے کی انتہائی جدوجہد کی ہے اور یہ پروپیگنڈا ابھی تک جاری ہے لیکن میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ان اوچھے ہتھیاروں سے کامیابی نہ ہوگی اور بہت جلد ترکوں اور شامیوں کے درمیان از سر نو دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ انگورہ میں وزیر اعظم اور وزیر خارجہ ترکی نے اہل شام سے محبت و مودت کا اظہار کیا ہے " ترکی اخبارات کا بھی یہ بیان ہے کہ " حکومت ترکیہ کی مخالفت اقلیتوں کے حقوق کی آڑ میں شروع کی گئی تھی مگر جب وہ ناکام رہی تو اب دین و مذہب کی آڑ میں مخالفت کا طوفان برپا کیا جارہا ہے اور شہرت دی جا رہی ہے کہ ترکوں کی حکومت میں، اسکندرونہ والوں کے مذہب کی خیر نہیں (البلاغ)"

جمعیۃ اقوام کے فیصلہ کا اعلان ہونے کے بعد تو تنقی کے ترکوں اور عربوں کا جوش و خروش اور بھی بڑھ گیا ہے اخبارات میں شدید قسم کی قلمی جنگ چھڑ گئی ہے ترکوں نے جب یہ کہا " شام کے عرب فرانس کے پنجۂ استعمار سے آزاد ہو چکے ہیں تو ترک کسی غیر طاقت کے کیوں محروم ہو رہیں' اس کے علاوہ اس علاقہ کا جغرافیائی، تمدنی اور لسانی رشتہ ممالک عربیہ کی نسبت ترکی سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہے " اور جب شام فرانس کے اشارہ پر لبنان کی علیحدگی کو گوارا کر سکتا ہے تو اسے ترکی کی مرضی پر اسکندرونہ و انطاکیہ سے دست بردار ہونے پر کیوں اعتراض ہے" دوسری طرف سے جواب دیا گیا کہ " اگرچہ لبنان کی علیحدگی شام پر ایک ناقابل برداشت حملہ ہے لیکن اس تقسیم کی بنا نسلی اختلافات پر نہیں بلکہ مذہبی تفاوت پر ہے، لبنان میں چونکہ عیسائیوں کی کثرت ہے اس لئے وہ مذہبی تعصب کے باعث شام کی مسلم اکثریت کے محکوم نہیں رہ سکتے'

لیکن اس کے برخلاف سنجق کے ترک مسلمان ہیں اور وہ اسلامی اخوت کے باعث شامی مسلمانوں کی برادری میں شامل ہیں، انھیں حق نہیں پہنچتا کہ وہ مغرب کی ملحدانہ قومیت اختیار کرکے شام سے دامن چھڑانے کی کوشش کریں اس کے علاوہ شامیوں کا یہ بھی بیان ہے کہ فرانس غیر مسلم ہونے کے باعث مسلمان عربوں کا دشمن ہے اس لئے وہ شام کی اسلامی جمہوریت کو کمزور کرنے کی غرض سے علیحدگی لبنان کا حامی ہے، لیکن ترکی مسلمان ہے اس کو تو ایک اسلامی حکومت کی ضرورتوں کے پیش نظر ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے جو شامی جمہوریت کو معنوی طور پر کمزور کرنے کی موجب ہو، اس سلسلہ میں ہز شکیب ارسلان کا ایک بیان بھی پیش کیا جاتا ہے کہ "اسکندرونہ میں ترکی اقلیت کی خاطر حکومت انگورہ کو عربوں پر قیامت نہ توڑنی چاہیے اور اس خطہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے خیال سے باز آجانا چاہیے، سب سے پہلے تو ترکوں کو یہ دیکھنا چاہیے کہ آج کتنے ترک اجانب کی محکومی میں زندگی بسر کرتے ہیں، روس ڈھائی کروڑ ترکوں پر حکومت کر رہا ہے چین کی حکمبرداری میں ایک کروڑ ترک زندگی گذار رہے ہیں۔ ایران ستر لاکھ ترکوں پر حکمراں ہے، بلغاریہ میں پچاس لاکھ ترک محکوم ہیں، رومانیہ میں ایک لاکھ بیس ہزار ترک غیروں کے غلام ہیں، یونانی بھی تھریس کے ایک لاکھ ترکوں کے حاکم ہیں، یوگوسلاویہ کے جنوب میں ہزاروں ترک اور روڈس وغیرہ اطالوی جزائر میں ۱۵ ہزار ترک محکوم ہیں لیکن ترکی حکومت ان بے شمار محکوموں کا کوئی خیال نہیں کرتی اس کو اگر خیال ہے تو صرف ۸۵ ہزار اسکندرونہ کے ترکوں کا جو عربوں کی اکثریت میں آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں" اسکندرونہ اور انطاکیہ کے تازہ فسادات سے متاثر ہو کر عربوں کے نقطہ نگاہ کی وضاحت میں "الشباب" نے ایک مقالہ لکھا ہے "ان تمام واقعات کی اصل وجہ یہ ہے کہ فرانس نے ترکوں سے اسکندرونہ کا وعدہ بالکل اس طرح کرلیا ہے جس طرح انگریزوں نے یہودیوں سے فلسطین کا سودا کرلیا ہے، دونوں نے عربوں کے ساتھ صریح غداری کی ہے۔ جس طرح حکومت برطانیہ ہر ممکن طریقہ سے یہودیوں کی حفاظت کرتی ہے ترک بھی اسکندرونہ کے مٹھی بھر ترکوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسلحہ اور سامان جنگ سے ان کی مدد کرتے ہیں، اسکندرونہ کے شہداء بارگاہ رب العزت میں فریاد کے سوا کیا کرسکتے ہیں"۔ شامی اخبار اور

نیا ترکوں کے خلاف جس شد و مد سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اس سے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ عرب اور ترکوں میں کوئی مذہبی تعلق بھی ہے، ہم کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتے لیکن یہ ضرور نہیں گے عربوں کے شور و غوغا سے اغیار بہت مسرور ہیں، فرانس خود نہیں چاہتا تھا کہ اسکندرونہ کو آزادی ملے اور بندرگاہ پر ترکی قبضہ تسلیم کیا جائے لیکن اتنی ہمت نہیں ہے کہ ترکی کی کھلم کھلا مخالفت کر سکے۔ شام ولبنان اور فلسطین کے سر پر ترکی کے مرد مجاہد کا مسلط ہو جانا فرانس اور برطانیہ کی استعماری پالیسی کے لئے یقیناً ایک مستقل خطرہ ہے لیکن عرب اپنے موجودہ رویہ سے اپنے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں، یہ سچ ہے کہ جمعیت اقوام کے فیصلہ سے شام کی حکومت کو صدمہ پہنچے گا لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شام کا صدمہ صرف شام کا صدمہ ہوگا۔ لیکن اگر ان ہنگاموں سے ترکی کو نقصان پہنچا تو وہ نقصان محض ترکی کا نہ ہوگا۔ ترکی نے آج سیاسی طور پر عالم اسلام کے قلب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ترکی کی ذرا سی تکلیف تمام جسم اسلام کو مضمحل بنا دے گی۔ تعجب تو یہ ہے کہ امیر شکیب جیسے جہاں دیدہ رہنما کا زور قلم بھی، جسے ترکی کی حمایت میں سب سے آگے ہونا چاہئے تھا۔ مخالفت میں صرف ہوا۔ عربوں کو یقین رکھنا چاہئے کہ وحدت عرب کا خیال کبھی پائدار حقیقت بن سکتا ہے تو وہ بھی ترکی کے زیر سایہ ہی ممکن ہے ۔ (ع۔م)

ہندوستان کی صحت عامہ | صحت عامہ کا مسئلہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ مقدم ہے۔ لیکن یہی حکومت ہند کی غفلت کا سب سے زیادہ شکار ہے۔ بخلاف اس کے مغربی ممالک میں صحت عامہ کے لئے مستقل ادارے مقرر ہیں، اور حکومتیں صحت و صفائی اور عمدہ غذا کی فراہمی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتیں۔ وہاں کی بلدیات عوام کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرتی ہیں، بیماریوں کی روک تھام کے لئے آئے دن نئے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں اور عوام کو حفظان صحت کے اصول تعلیم کئے جاتے ہیں، نیز طبی امداد پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔

ہندوستان دنیا میں مفلس ترین ملک ہے۔ یہاں کی قومی آمدنی کا اوسط فی کس چھ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حقیر آمدنی سے ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کو قوت

لایموت حاصل کرنا بھی دشوار ہے چہ جائیکہ وہ اس میں سے صحت و صفائی، اور تعلیم جیسی اہم چیزوں کے لئے کچھ گنجائش نکال سکیں۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے فاقہ زدہ لوگ جہالت اور افلاس کے باعث حفظان صحت کے لئے انفرادی طور پر کوئی کوشش نہ کرسکیں تو انھیں کسی حد تک معذور خیال کرنا چاہئے۔ عوام کی صحت کو برقرار رکھنے کی بیشتر ذمہ داری حکومت پر عاید ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اُس کی سرگرمیاں ایسی نہیں ہیں جن کی تعریف کی جاسکے۔ غریب ہندوستانیوں کی صحت عامہ کا اندازہ کرنا ہو تو مندرجہ ذیل اعداد و شمار ملاحظہ کیجئے:-

	تعداد اموات		میزان	شرح اموات فی ہزار
	مرد	عورت		
سنہ ۱۹۲۵ء	۳۱۴۰۱۹۷	۲۸۲۷۷۲۱	۵۹۶۷۹۱۸	۲۵،۳۴
سنہ ۱۹۲۶ء	۳۳۷۵۴۶۶	۳۰۸۵۲۴۴	۶۴۶۰۷۱۰	۲۷،۲۳
سنہ ۱۹۲۷ء	۳۱۴۲۴۱۱	۲۸۶۷۳۱۸	۶۰۰۹۷۲۹	۲۵،۳۵
سنہ ۱۹۲۸ء	۳۲۱۵۳۲۷	۲۹۶۴۷۸۶	۶۱۸۰۱۱۳	۲۵،۹۴
سنہ ۱۹۲۹ء	۳۲۵۵۴۰۲	۳۰۱۱۹۸۰	۶۲۶۷۳۹۱	۲۶،۲۶
سنہ ۱۹۳۰ء	۳۳۷۵۹۲۹	۳۱۰۰۵۲۰	۶۴۸۳۴۴۹	۲۷،۲۴

ان اعداد سے صاف ظاہر ہے کہ شرح اموات برابر بڑھتی رہی ہے۔

مختلف امراض کے اعتبار سے اموات کی شرح فی میل حسب ذیل ہے:-

امراض	سنہ ۱۹۲۸ء	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۳۰ء
ہیضہ	۱،۴۵	۱،۲۲	۱،۴۰
چیچک	۰،۴۰	۰،۳۰	۰،۳۰
طاعون	۰،۵۰	۰،۳۰	۰،۱۰
بخار	۱۴،۲۰	۱۴،۹۶	۱۵،۶۹
بدہضمی اور پیچش	۰،۹۲	۰،۹۸	۰،۹۸

امراض	سنہ ۱۹۲۸ء	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۳۰ء
امراض سینہ	۱٫۵۹	۱٫۶۵	۱٫۶۶
حادثات	۰٫۳۹	۰٫۳۹	۰٫۳۸

اتفاقی حادثات اور وبائی بیماریوں سے قطع نظر ہندوستانی اکثر ایسے امراض کا شکار ہوتے ہیں جو قابل علاج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ماحول میں صحت و صفائی اور طبی امداد کا معقول انتظام نہیں ہے۔ غلیظ پانی' اور ناصاف اشیائے خوردنی کے علاوہ قلت غذا بھی امراض اور اموات کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ باوجودیکہ شرح اموات مغربی ممالک کے مقابلہ میں یہاں بہت زیادہ ہے پھر بھی آبادی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور کسانوں اور مزدوروں کی فاقہ مستی کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

پچھلے دنوں شملہ میں صحت عامہ کے مرکزی مشاورتی بورڈ کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں ہز ایکسلنسی والیسرائے نے مسئلہ حفظان صحت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ صوبائی حکومتوں کو جا بجا مناسب صحتی ادارے قائم کر کے ان میں قابل تربیت یافتہ اسٹاف رکھنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ٹیکس دہندوں کے محاصل کا معتدبہ حصہ قومی صحت کو برقرار رکھنے پر صرف کیا جائے۔ ہز ایکسلنسی نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ چند سال پہلے دہلی کمیشن نے مزدوروں کی رہائش کے انتظام کے لئے کچھ سفارشات کی تھیں لیکن وہ ابھی تک شرمندۂ تکمیل نہ ہوئیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں مرکزی مشاورتی بورڈ کی تجاویز بھی "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق ثابت نہ ہوں۔ کیونکہ ان کو عمل میں لانے کے لئے کثیر مصارف کی ضرورت ہے۔ اور میزانیہ کا ۸۰ فی صدی حصہ ایسا ہے جس کے متعلق ارکان اسمبلی قطعی کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ غریب ہندوستانیوں سے جو محاصل وصول کئے جاتے ہیں ان کا بیشتر حصہ فوجی مصارف' قیام امن و آئین' اور شاہی خدمات کی نذر ہو جاتا ہے۔ ان اخراجات کے بعد تعلیم' حفظان صحت اور دیگر "غیر اہم" تعمیری خدمات کے لئے گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ (ع۔ق)

چین اور جاپان | کسی کا قول ہے اور سچ ہے کہ انسانی تاریخ کا وہ دور شروع ہو رہا ہے جس کے اہم واقعات بحرالکاہل کے ساحل یا اس کے نواح میں ہوا کریں گے۔ یہ علاقہ آج کھلی رقابتوں اور چھپی سازشوں کا جولانگاہ ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت کیا ہو جائے گا۔ ابھی دریائے آمور میں جاپان کے اشارہ پر چلنے والے منچو سپاہیوں نے ایک روسی کشتی ڈبو دی، ۲۷ روسی ڈوب کر مر گئے۔ یہ واقعہ ایک عالمی جنگ کا نقطۂ آغاز بن سکتا تھا۔ وہ تو روس اپنی اندرونی مشکلات سے دوچار تھا، نئے دستورِ حکومت کو رائج کرنے سے پہلے تمام غیر معتبر عناصر سے ہیئت اجتماعی کو صاف کرنے میں لگا ہوا تھا، ملک میں تروتسکی اور اسٹالین کے ساتھیوں کی مخالفت ذرا تشویشناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی اور ان سب سے زیادہ یہ کہ روس اپنی معاشی تنظیم کو مکمل کرنے کے لئے دل سے امن کا خواہشمند اور جنگ سے نفور ہے اس لئے یہ کڑوا گھونٹ پی لیا اور معاملہ رفت گذشت ہوا۔ لیکن یہ وہ قوتیں ہیں کہ دراقلیمے نہ گنجند، آج نہیں کل روس اور جاپان میں ٹکر ہوگی اور کیا عجب ہے کہ دریائے آمور جسے آج نقشوں میں ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے اس کے ساحل انسانی خون سے رنگین ہونے کے بعد تاریخ میں وہی شہرت حاصل کر لیں جو رائن اور ڈینیوب کو حاصل ہے۔

دریائے آمور والے واقعہ ہی کی قسم کا ایک حادثہ کہیں شمالی چین میں بھی ہو گیا۔ صحیح نوعیت ابھی متعین نہیں ہو سکی ہے۔ مگر تھی کوئی ذرا سی بات، کوئی غلط فہمی۔ کسی کمزور اعصاب والے سنتری کی گھبراہٹ یا منتشر دماغ افسر کی بوکھلاہٹ۔ اونچ نیچ ہو گئی، گولی چل گئی۔ تلافی کے مطالبے ہوئے، سمجھوتہ ہوا، جوشیلے فوجیوں نے سمجھوتہ توڑ دیا، معاملہ بڑھا اور نہایت وسیع پیمانہ پر فوج کشی شروع ہو گئی۔ اور اگر چین نے کچھ لے دے کر معاملہ نہ کر لیا تو کیا عجب ہے کہ ان سطروں کے طبع ہونے تک شمالی چین آدمیوں کے گرم خون سے سینچا جا رہا ہو۔ جاپانی فوجیں نہایت تیزی سے چین بھیجی جا رہی ہیں اور عجب یہ ہے کہ چین بھی جواب تک برابر ادھار کھائے دیتا رہا ہے اور جاپان سے ٹکر لینے سے بچتا رہا ہے وہ بھی بڑی مستعدی سے اپنی فوجیں موقع واردات پر بھیج رہا ہے۔ آخر چین اس بار اس قدر مستعد کیوں ہے اور جاپان جس سے توقع تھی کہ اب کچھ دن چین کو چین سے بیٹھنے دیگا اور باقی دنیا سے

سے صفائی کی تدبیریں کرے گا وہ پھر یکا یک ملک گیری پر کیوں آمادہ نظر آتا ہے۔

چین میں اتحاد قومی کی تحریک

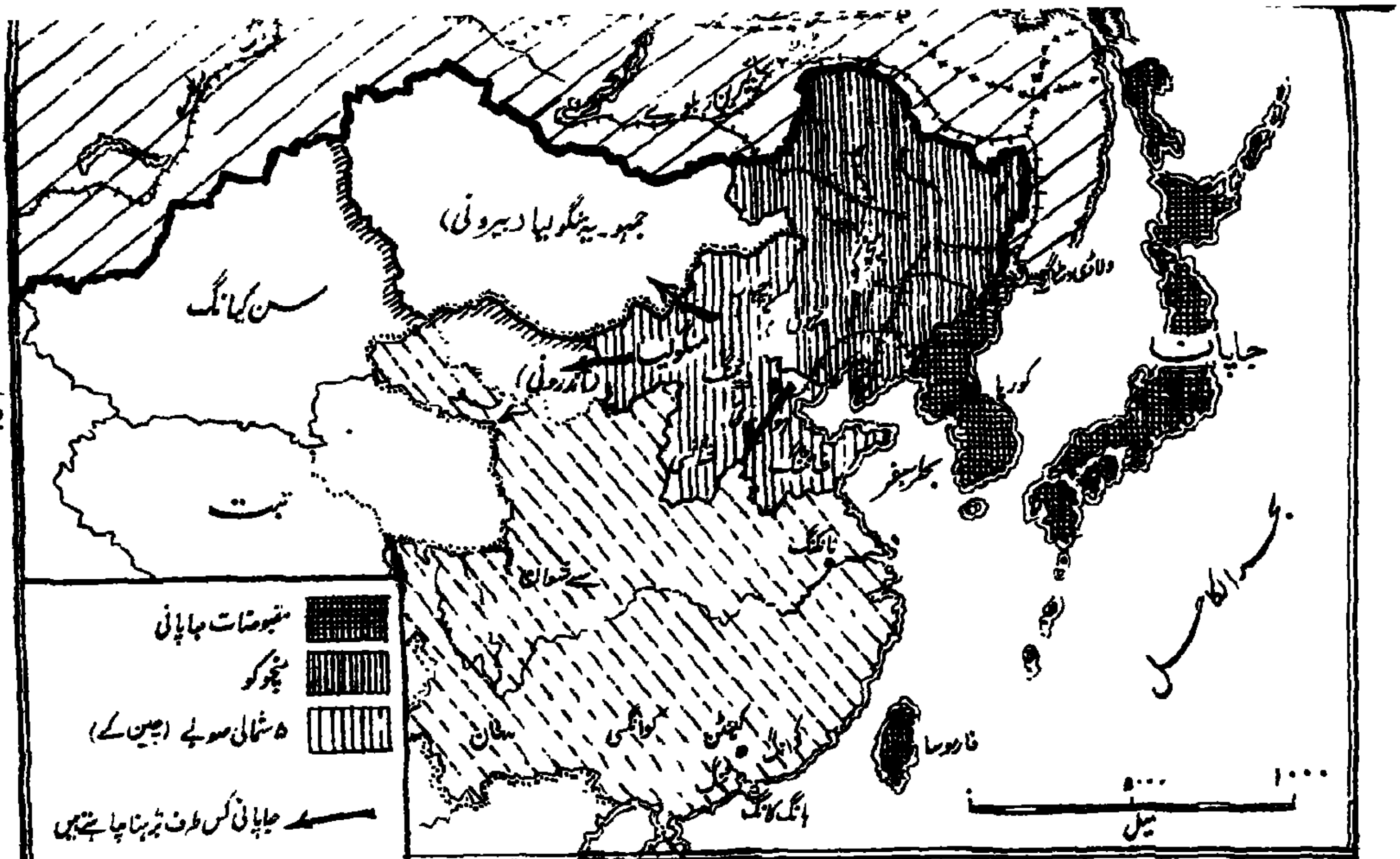
چین کی مستعدی کے لئے تو بس یہ دلیل کافی ہے کہ ننگ آمد بجنگ آمد۔ جاپان چین کے ساتھ پیہم زیادتیاں کر رہا ہے! اس کے احساس قومی کو ضرب پر ضرب لگا رہا ہے، اور برابر اس کے ملک کے گوشے گوشے چھینتا جا رہا ہے۔ چین اگر یہ سب کچھ جھیلتا رہا ہے تو اس لئے کہ کمزور ہے، جن سے مدد کی امید ہے وہ برابر ٹالے بالے بتا رہے ہیں، اور اسے ڈر ہے کہ اگر جاپان سے پوری پوری ٹکر ہوگئی تو شاید سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملے اور آگے چلکر بھی اپنے نقصانوں کی تلافی کا امکان ہاتھ سے نکل جائے۔ مگر صبر اور انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ تحمل اور بردباری کی صفتیں مہذب چینیوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن تا کجے۔ مصیبت اور پیہم مصیبت نے اب اس قوم کو بہت کچھ متحد سا کر دیا ہے اور قیاس ہے کہ اگر نانکنگ کی مرکزی حکومت اور اس کے سردار جنرل چیانگ کائی شک اب بھی جاپان کے مقابلہ کو نہ کھڑے ہوئے تو قوم کا غصہ ان کی طرف رخ کرلیگا اور انھیں ختم کر دے گا۔ اس لئے اندر اندر چیانگ کائی شک چاہے اب بھی ٹکر ٹالنے کی فکر میں ہوں مگر بظاہر مستعدی کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں۔

اتحاد قومی کی تحریک چین میں کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ ۱۹۳۱ء سے جب جاپان نے منچوریا پر قبضہ کیا اس تحریک کا کام جاری ہے۔ بات یہ ہے کہ چینی قومی زندگی اس وقت دو جماعتوں کے ہاتھ میں ہے جو کئی سال تک برسر پیکار رہنے کے بعد اب ایک مشترک دشمن کے مقابلہ کے لئے مل رہی ہیں۔ ایک چینی اشتراکی جماعت ہے اور دوسرے چیانگ کائی شک کی جماعت کو من تانگ۔ پہلے تو یہ دونوں ایک ہی تھے اور سن یاٹ سین نے چینی ہیئت اجتماعی کے لئے جمہوریت، قومیت اور اشتراک کے جو اصول سہ گانہ مرتب کئے تھے وہ ان دونوں کا دستور العمل تھے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک یہ دونوں عناصر ملے رہے اور یہ اپنے ملک کے تمام سامراجی دشمنوں اور ان کے دم چھلوں کی مخالفت میں ہم آہنگ رہے۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں ان کے ایک سربرآوردہ قاید چیانگ کائی شک نے شنگھائی کے ساہوکاروں سے ساز باز کرکے نانکنگ

میں اپنی حکومت قایم کرلی اور کمیونسٹ کو یکسر ختم کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ۔ کمیونسٹ جماعت بہت کچھ دب گئی مگر کچھ دن بعد پھر ابھری ۔ اس نے فوکیان اور کیانگ سی کے صوبوں میں اپنی سوویٹ حکومت قایم کرلی اور اتنا رقبہ اپنے زیر اثر کرلیا کہ نانکنگ کی حریف سمجھی جانے لگی ۔

باوجود اس رقابت کے جب ۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا میں اپنا اقدام شروع کیا تو کمیونسٹ جماعت نے اتحاد قومی پر آمادگی ظاہر کی ۔ مگر نانکنگ کی حکومت اپنی قوت کو برابر ان کی بربادی میں صرف کرتی رہی ۔ یہ "سرخ" فوجیں اپنے اشتراکی پروگرام سے بھی کچھ ہٹ کر قومی عزت کے برقرار رکھنے کے لئے بیقرار تھیں اور نانکنگ ان کے منصوبوں کو شکست دینے میں سرگرم ۔ ۱۹۳۲ء میں ان اشتراکیوں نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ بھی کیا اور جنرل فانگ کے زیر کمان ایک بڑا لشکر بھی جاپانیوں سے لڑنے کے لئے شمال کی طرف بھیجا ۔ مگر تحفظ قومیت کا یہ جہاد خود اپنی قوم والوں کے ہاتھوں ناکام ہوا اور فانگ کو نانکنگ کی فوجوں نے گرفتار کرکے قتل کردیا ۔
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ۔

۱۹۳۳ء میں چینی سوویٹ حکومت نے پھر اعلان کیا کہ جاپان کے مقابلہ میں وہ ہر چینی فوج کا ساتھ دینے کو تیار ہیں ۔ اشتراکیوں کی ناکامیوں اور قومی تحفظ کے لئے ان کی طرف سے جس آمادگی کا اظہار بار بار ہوا اس نے قوم کو بہت متاثر کیا ۔ اور ۱۹۳۳ء میں جو فوج ان کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی تھی اس نے ان پر ہاتھ اٹھانے سے انکار کیا اور ان سے مل گئی ۔ لیکن اس متحدہ فوج کو بھی نانکنگ کی قوت نے دبا دیا ۔ مگر اتحاد کی تحریک پھیلتی رہی ۔ ۱۹۳۴ء میں بیگم سن یات سین نے ایک اعلان شائع کیا جس کا عنوان تھا " جاپان کے خلاف چینی قوم کا بنیادی پروگرام " اس پر بیگم سین کے علاوہ کوئی ۲ ہزار سربرآوردہ اور با اثر چینی قائدوں کے دستخط تھے ۔ اس میں ساری قوم کو مسلح کرکے جاپان کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ ۱۹۳۵ء میں پھر کمیونسٹ جماعت کی طرف سے " سب چینی مرد عورتوں کے نام جاپان سے لڑنے اور اپنے تمام پرانے علاقوں کو واپس لینے کا پیام " شائع ہوا ۔ اس پیام میں ایک متحدہ قومی حکومت کے قیام اور ایک متحدہ قومی لشکر


جمہوریہ منگولیا (بیرونی)
سن کیانگ
تبت
جاپان
کوریا
بحر اصفر
ولادی وسٹاک
نانکنگ
ہانگ کانگ
فارموسا
بحر الکاہل
۵۰۰
۱۰۰۰
میل
مقبوضات جاپانی
منچوکو
۵ شمالی صوبے (چین کے)
جاپانی کس طرف بڑھنا چاہتے ہیں

کی ترتیب کی تجویزیں ذمہ داری کے ساتھ پیش کی گئی تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے ختم ہوتے ہوتے یہ تحریک بہت عام ہو گئی تھی اور تقریباً ہر چینی نوجوان اور طالب علم اس سے متاثر تھا۔ چیانگ کائی شک نے ان طالب علموں کے مظاہروں کو بھی بڑی سختی سے دبایا مگر اس سے غیر جانبدار لوگ اور بھی تحریک اتحاد کے حامی ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء ہی میں اشتراکی لشکر نے ایک اور عجیب حرکت یہ کی کہ کیانگسی اور فوکین کے علاقہ سے اٹھ کر شمال کا رخ کیا، اور سارے جنوبی چین میں اور صوبہ شوان اور کانسو سے گزر کر شمالی مغربی چین میں اپنے قدم جمائے اور اس سفر میں سارے ملک کو اتحاد قومی کا پیام پہنچاتے گئے۔

شمال مغرب کو اس کمیونسٹ علاقہ سے متصل ہی کومن تانگ کی وہ فوج پڑی تھی جسے نانکنگ کی حکومت نے منچوریا سے بے لڑے واپس بلا لیا تھا۔ یہ جاپان سے بہت نفور تھی اور اپنے ملک کی خاطر اپنا خون بہانے سے محروم رہی تھی اس لئے نانکنگ کی جاپان دوستی سے سخت نالاں۔ چنانچہ اس نے اشتراکیوں کے پیام اتحاد کا اثر آسانی سے قبول کیا۔ اُدھر انیسویں فوج جسے اشتراکیوں سے ساز باز کے جرم میں نانکنگ والوں نے منتشر کیا تھا اس کے کچھ حصے کوانگ سی کے صوبہ میں آ پہنچے۔ یہاں کے صوبائی قائد جنرل لی اور پائی پہلے سے جاپانیوں کے خلاف تھے ہی اس فوج نے انھیں اور تقویت پہنچائی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں کوانگ تنگ اور کوانگ سی دو صوبوں نے حکومت نانکنگ کے خلاف اس وجہ سے بغاوت کی کہ وہ جاپان کے خلاف قوم کے تحفظ کے لئے نہیں اٹھتی۔ کوانگ تنگ کی بغاوت تو دب گئی مگر کوانگ سی میں جاری رہی، نانکنگ کی قوت اسے جبر سے نہ دبا سکی، اور قومی رائے عامہ کا دباؤ اس قدر تھا کہ ان کے ساتھ صلح و آشتی سے معاملہ کرنے پر مجبور ہوئی۔

پھر گذشتہ سال دسمبر میں وہ واقعہ پیش آیا جو بغاوت سیان کے نام سے مشہور ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ چیانگ کائی شک کو ان کی اپنی فوج نے ۲ ہفتہ تک حراست میں رکھا تھا۔ یہ بغاوت دراصل اس بات کا ثبوت تھی کہ کومن تانگ کے اندرونی حلقوں میں بھی اتحاد قومی کی تحریک

نے پورا پورا اثر کر لیا ہے۔ اس کی غرض یہ تھی کہ جو بات اور کسی طرح چیانگ کائی شک کے ذہن نشین نہیں ہوئی آسے یوں اس تک پہنچایا جائے۔ کہتے ہیں کہ باغی فوج کے سردار مارشل سوے لیانگ نے چیانگ کے سامنے بہ ادب تمام یہ مطالبات رکھے تھے کہ نانکنگ کی حکومت از سر نو مرتب کی جائے اور سب قومی جماعتیں اس میں شریک ہوں، خانہ جنگی ختم کی جائے، شنگھائی میں جو محبان وطن گرفتار ہوئے تھے وہ رہا کئے جائیں، حق رائے اور حق اجتماع قوم کو پھر سے دیا جائے، قوم پرست عوام کو آزادی عمل ملے، سن یات سین کی وصیت پر پورا پورا عمل ہو، اور نجات قومی کے لئے ایک عام قومی کانفرنس بلائی جائے۔ کوشش یہ تھی کہ چیانگ ان مطالبوں کو اپنی طرف سے نانکنگ کی حکومت کے سامنے پیش کرے اور انھیں منوا لے۔ چنانچہ اس نے یہ سب مطالبات کومن تانگ کے سامنے پیش بھی کر دئے مگر اس وجہ سے کہ ان کی ابتدا ایک گستاخی سے ہوئی تھی یہ مطالبات قابل قبول نہ سمجھے گئے۔ مگر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تقریباً اسی قسم کے مطالبات کوانگ سی صوبہ کی طرف سے بھی پیش ہوئے تھے اور کومن تانگ نے انھیں قبول کر لیا ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ کومن تانگ کے کارکنوں پر اتحاد قومی اور دفاع وطنی کے مطالبہ کی قوت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب زیادہ عرصہ تک اس متحدہ قومی مطالبہ کا مقابلہ ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے اس مرتبہ چینی فوجوں نے آگے بڑھنے میں اس قدر مستعدی کا اظہار کیا ہے۔ اور اگر شاطران سیاست کی خفیہ ریشہ دوانیاں جاپان سے کچھ مقابلہ کو ٹال نہ سکیں تو چینی قوم اب اپنی پوری قوت کے ساتھ اس دراز دستی کا مقابلہ کریگی۔ پھر نتیجہ جو بھی ہو۔

جاپان کے منصوبے | ہم نے پچھلے پرچہ میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جاپان اب کچھ دن ذرا خاموش رہنا چاہتا ہے۔ تاکہ اہل سیاست آئندہ فوجی اقدام کے لئے راستہ صاف کردیں۔ جاپان کے اس فیصلہ میں ایک عنصر تو ہمارے نزدیک یہی تھا کہ اس مرتبہ غالباً چین مقابلہ پر آجائے گا۔ یہ خیال صحیح نکلا۔ البتہ نئی وزارت کو برسر اقتدار آئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ یہ قصہ پیش آگیا۔

نہ معلوم چھیڑ کس طرف سے ہوئی ہے اور ممکن ہے بالارادہ کسی کی طرف سے نہ ہوئی ہو۔ مگر بہر حال ہو گئی ہے اور اگر جاپان کے لئے موقع ہو گا کہ وہ اس شمالی چین کے علاقہ میں اپنا اثر بڑھائے تو وہ اس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھائے گا۔ اس لئے کہ نئی وزارت میں بھی باوجود ان تمام باتوں کے جن کا ذکر ہم نے پچھلے مہینہ کیا تھا فوجی عنصر خاصا با اثر ہے۔ اور نئے وزیر اعظم شہزادہ کونوئے کی میانہ روی اور صلح پسندی غالباً فوجی جماعتوں کے اثر کو کچھ بہت کم نہ کر سکے گی۔ پھر اس وزارت میں وزیر خارجہ وہی ہرو تا صاحب ہیں جنھوں نے ابھی جنوری ۱۹۳۶ء میں چین اور جاپان کی سیاست کے تین اصول یوں بیان فرمائے تھے کہ (۱) اشتراکیت کے خلاف چین اور جاپان میں پورا تعاون ہو اور اگر ضرورت ہو تو اشتراکیوں کو دبانے کے لئے جاپانی فوجوں سے بھی چین میں مدد لی جائے!

(۲) چین جاپان کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے ملک سے تعلقات نہ رکھے۔

(۳) چین اور منچوکو میں معاشی اور سیاسی تعاون شروع ہو جائے۔ اور ہو سکے تو شمالی چین میں منچو سکہ رائج ہو جائے۔

اس وقت چھیڑ ہو گئی ہے۔ دریائے آمور کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت روس لڑنا نہیں چاہتا۔ برطانیہ بھی یورپی سیاست کے جھمیلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ امریکہ اکیلا میدان میں کیا کودیگا۔ جاپانی سوچتے ہیں کہ چلو لگے ہاتھوں اپنے پرانے منصوبے کو پورا کر لو۔

ان کے نزدیک جو کام منچوریا میں شروع کیا گیا تھا اس کی تکمیل اسی وقت ہو گی کہ شمالی چین پر تسلط ہو جائے۔ ان شمالی صوبوں میں کوئی ۸۰ ملین آدمی بستے ہیں یعنی جاپان کی آبادی سے کوئی ۲۰ ملین زیادہ۔ اپنی موجودہ گری پڑی حالت میں بھی یہ ایک بڑی منڈی ہے۔ ہر سال کوئی ۱۰۰ ملین ڈالر کا مال باہر سے آتا ہے۔ اگر یہ منڈی ہاتھ آجائے تو اور ملکوں میں جاپانی مال پر جو روک ٹوک محاصل کے ذریعہ ہے اس کی تلافی ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ جاپانی صنعت کے لئے کچا مال فراہم کر سکتا ہے۔ یہاں لوہا بھی ہے، تیل بھی، ٹین بھی نکلتا ہے تانبا بھی، صرف ہوپائی کے صوبہ میں ہر سال ۶ ملین ٹن اچھی قسم کا کوئلہ نکلتا ہے۔ پھر اس علاقہ کی زمین اور یہاں کی آب وہوا

ایسی ہے کہ کپاس کی کاشت خوب ہو سکتی ہے ۔ آج جاپان ہندوستان اور امریکہ سے کوئی ..ملین ین سالانہ کی روئی خریدتا ہے۔ شمالی چین پر تسلط ہو جائے تو کپڑے کی صنعت دوسروں کی دست نگر نہ رہے ۔ مویشی پالنے کے لئے بھی اس علاقہ میں بڑے مواقع ہیں ۔ جاپان کو کھمن، چمڑے وغیرہ کی جو ضرورت ہے وہ بھی اس علاقہ سے پوری ہو سکتی ہے ۔

معاشی اہمیت کے علاوہ فوجی ضرورتوں کے لئے بھی یہ علاقہ درکار ہے ۔ شمالی چین اور جنوب کے درمیان ریل کی جو لائنیں ہیں ان کے اہم مقام اسی علاقہ میں ہیں ۔ پھر پائینگ سے سوئی یوان کو جو لائن جاتی ہے وہ شمالی مغربی چین اور منگولیا کی کنجی ہے ۔ اور منگولیا اور اس کے نواح کے اشتراکی علاقہ کو بے بس کرنا مقصود ہے ۔ اس لئے کہ یہ علاقہ روس کے زیر اثر ہے، جاپانی سیاست کا نہایت اہم مقصد یہ ہے کہ چین کو منگولیا اور روس سے اس طرح الگ کر دے کہ کہیں سرحد ملے ہی نہیں اور منچوریا سے سن کیانگ تک روس اور چین کے درمیان ایک درمیانی ریاست قایم ہو جائے جو جاپانی اثر میں ہو ۔

ان مقاصد کے پیش نظر جاپان مدت سے اس علاقہ میں طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کر رہا ہے ۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اگر تکمیل ہو سکے گی تو کیوں نہ کرے گا ۔ لیکن اگر سخت چینی مدافعت کا اندیشہ ہوا تو ممکن ہے کہ کچھ باتیں منوا کر باقی پھر کسی وقت کے لئے ملتوی کر دے ۔ طاقت ور کی سب سے بڑی جیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی لڑائی کا وقت بھی تو خود طے کر سکتا ہے !

آئرستان کے انتخابات آئرستان نے اپنی آزادی کے لئے جو جد و جہد کی ہے اس سے ہندوستانی بڑی گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں ۔ اس جد و جہد میں آئری قوم کے سردار ڈی ویلرا کی شخصیت میں بھی ہندوستانیوں کے لئے بڑی کشش رہی ہے اور انھوں نے بھی وقتاً فوقتاً ہندی تحریک آزادی سے اپنا تعلق خاطر ظاہر کیا ہے ۔ اس عام تعلق کے علاوہ ہندوستان کے اہل سیاست میں جو بحث برابر کامل آزادی اور نوآبادیاتی درجہ کے متعلق رہی ہے اس سلسلہ میں بھی آئری سیاست

ہم لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث رہی ہے۔

چنانچہ گذشتہ جولائی میں جو عام انتخابات آئرستان میں ہوئے ان کے نتائج کا انتظار ہندوستان میں بھی رہا۔ اس لئے کہ ان انتخابات میں ایک تو یہ دیکھنا تھا کہ ڈی ولیرا پھر برسر اقتدار آتے ہیں یا نہیں، لیکن اس سے زیادہ یہ کہ نیا دستور اساسی جس میں آئرستان کو ایک جمہوریہ قرار دیا گیا ہے اور جس میں سلطنت برطانیہ اور شاہ برطانیہ کا نام بھی نہیں آیا منظور ہوتا ہے یا نہیں۔

ڈی ولیرا اور ان کی پچھلی وزارت کے اکثر رکن پھر منتخب ہو گئے۔ قوم نے ان کے مجوزہ دستور اساسی پر بھی مہر قبول ثبت کر دی۔ لیکن یہ توقع پوری نہ ہو سکی کہ ڈی ولیرا کی سیاسی جماعت فیانا فیل کو اتنی اکثریت حاصل ہو جائے گی کہ وہ کسی دوسری جماعت کو ساتھ لئے بغیر حکومت کا کاروبار چلا سکیں گے۔ انتخاب کے نتیجہ نے کچھ عجیب توازن سا پیدا کر دیا ہے۔ ۱۳۸ نشستوں میں سے ۶۹ ڈی ولیرا کی جماعت کو ملیں، باقی ۶۹ دوسری جماعتوں کو۔ چونکہ صدر غالباً ڈی ولیرا کی جماعت کا آدمی ہوگا اس لئے پارلیمنٹ میں ان کی جماعت دوسری جماعتوں کی متحدہ قوت کے مقابلہ میں ایک کی اقلیت میں ہوگی، اور اس لئے وزارت بنانے کے لئے انھیں کسی دوسری جماعت کو ساتھ لینا ہوگا۔ یہ جماعت وہی پرانی مزدوروں کی جماعت ہوگی جو اب تک ان کے ساتھ تھی اور جو اس مرتبہ پہلے سے زیادہ قوی ہے۔ پہلے اس کے کل ۸ رکن تھے اب کے ۱۲ ہیں۔

اس انتخاب میں تین جماعتیں خاص طور پر قابل لحاظ تھیں۔ (۱) ڈی ولیرا کی جماعت فیانا فیل (۲) مسٹر کاسگریو کی جماعت یونائیٹڈ آئرش پارٹی اور (۳) مزدوروں کی جماعت۔ فیانا فیل کا پروگرام تو یہ تھا کہ سیاسی اعتبار سے ملک کو جمہوریت تسلیم کیا جائے، نیا دستور منظور ہو، برطانوی سلطنت سے ایک خود مختار خارجی حکومت کی حیثیت سے جو تعلقات ہو سکیں قایم رکھے جائیں؛ حتی الوسع دوستانہ، مجبوری ہو تو مخالفانہ میں بھی مضائقہ نہیں۔ اندرون ملک میں پرانی معاشی سیاست کا جاری رکھنا، ملک کو حتی الوسع خود کفالتی بنانا، چھوٹی چھوٹی صنعتیں قایم کرنا، آبادی کے سمٹ سمٹ کر شہروں میں جمع ہونے کو روکا جائے، صنعت کو دیہات میں پہنچایا جائے، اور اس کی

سبیں نکالی جائے کہ کارکردگی تو کم نہ ہو لیکن صنعت کا کام چھوٹے کارخانوں میں انجام پائے ؛ ہر شخص جو کام کرنے کو تیار ہے اور کام کر سکتا ہے اس کے لئے کام مہیا کیا جائے ؛ کام جن حالات اور جس ماحول میں انجام پاتا ہے اسے سدھارا جائے ؛ بچوں اور عورتوں کی محنت سے کسی کو بیجا فائدہ نہ اٹھانے دیا جائے ، معاشی لحاظ سے پس ماندہ طبقوں کے اغراض کا خاص خیال رکھا جائے ؛ مریض ، دکھی ، بیوہ ، یتیم اور بوڑھوں کی پرورش کا سامان ہو ؛ خاندان کی زندگی کی حفاظت کی جائے۔

مسٹر کاسگریو کی یونائیٹڈ آئرش پارٹی نے بھی اس مرتبہ یہ سوچا کہ وعدوں میں کسی طرح ہم بھی ڈی ولیرا سے پیچھے نہ رہیں۔ چنانچہ داخلی معاشی پروگرام ان کا بھی کم و بیش وہی تھا جو فیانافیل کا ، بس ذرا لفظوں کا ایر پھیر تھا۔ یہ کہتے تھے کہ کسانوں کو اپنی حالت سدھارنے کے لئے ۳ فی صدی شرح سود پر سرمایہ فراہم کریں گے ؛ دیسی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ایک مفصل اور معین تجویز بنائیں گے ، بعض صنعتوں کی تامین کے لئے محصول لگائیں گے ، بعض کو روپیہ سے مدد دیں گے ، بعض کے لئے سستی شرح پر قرض کا انتظام کریں گے ؛ خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزوں پر سے ٹیکس اٹھا دیں گے ؛ صنعتی مزدوروں کے لئے زندگی کے بیمہ اور بڑھاپے میں پنشن کا انتظام کریں گے اور بال بچوں کی پرورش کے لئے مخصوص الاؤنس مقرر کریں گے ؛ تعلیم پر صرف بڑھائیں گے اور ۱۶ سال کی عمر تک تعلیم ہر شہری پر لازم کر دیں گے ، کھیل اور تفریح کے مواقع زیادہ کریں گے ؛ یا وش بخیر ، کمیونزم کا مقابلہ کریں گے ، معاشی طبقوں کے ساتھ انصاف کریں گے ، اور ملک کی موجودہ تقسیم کو مٹا کر ایک متحدہ آئرستان کے قیام کی کوشش کریں گے۔ غرض تقریباً ہر وہ چیز کریں گے جو فیانافیل کرنا چاہتی ہے۔ پھر فرق کیا ہوگا۔ یہ کہ برطانیہ کے ساتھ ہوں گے ، سلطنت برطانیہ میں ایک رکن کی حیثیت سے شریک ہوں گے ، اس شرکت کے تمام فوائد حاصل کریں گے اور اس کی تمام ذمہ داریاں اٹھائیں گے۔

تیسری جماعت مزدوروں کی جماعت ہے۔ ان کا اثر ابھی صرف شہروں تک محدود ہے۔ حزب العمال کی جو جماعتیں انھوں نے بنائی ہیں وہ ناقص انگریزی ٹریڈ یونین کی اور بھی ناقص نقل ہیں۔ انھیں سیاسی مسائل سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ان کا پروگرام یہ ہے کہ معاشی زندگی میں حکومت کے

اثر کو بڑھائیں، دولت کی بہتر تقسیم کی تدابیر کریں، نجی شراکتوں کی جگہ کاروبار کو حکومت یا بلدیوں کے ہاتھ میں دیں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ڈی ولیرا کو اپنی وزارت کے قیام و استحکام کے لئے اس مزدور جماعت کو ساتھ لینا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس جماعت کو سیاسی مسائل سے زیادہ لگاؤ نہیں اور ڈی ولیرا کی جماعت کے نزدیک جمہوریت کے اعلان اور برطانیہ سے ایک خارجی حکومت کے سے تعلقات کا قایم کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ زیادہ عرصہ تک نباہ نہ ہو اور شاید نئے دستور پر دونوں میں اختلاف ہو جائے۔ اور کیا عجب ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد پھر عام انتخابات کرنے پڑیں۔

آئرستان کا نیا دستور | عام انتخابات کے ساتھ ساتھ آئرستان میں نئے دستور اساسی پر بھی قوم کی رائے حاصل کی گئی تھی اور قوم نے بڑی اکثریت سے اسے منظور کیا۔ اس نئے دستور کے اہم دفعات کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

ملک کا نام Eire ہوگا۔ یہ نام کل جزیرہ پر حاوی ہوگا۔ البتہ ملک کی جبریہ تقسیم کے مٹنے تک یہ دستور صرف اس حصہ میں نافذ ہوگا جو اب تک فری اسٹیٹ کہلاتا تھا۔

ریاست کا حاکم اعلیٰ صدر کہلائیگا۔ اسے قوم براہ راست ، سال کے لئے منتخب کیا کریگی۔ ۳۵ سال سے اوپر کا ہر شہری اس منصب کے لئے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اسے پارلیمنٹ کے ۲۰ رکن نامزد کریں یا چار بلدیوں کی طرف سے اس کا نام پیش ہو۔ اس کے فرائض یہ ہوں گے :- ڈیل (دارالمندوبین) کے اجلاس طلب کرنا اور اسے برخاست کرنا؛ قوانین پر اپنے دستخط ثبت کرکے انھیں شائع کرنا ؛ سزاؤں کا کم کرنا یا معاف کرنا ؛ عساکر قومی کی اعلیٰ کمان اپنے ہاتھ میں رکھنا ، اور حکومت وقت کے مشورہ سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو اہم قومی امور کے متعلق پیام بھیجنا۔ صدر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے کسی کا رکن نہ ہوگا اور اپنے فرائض سے متعلق کسی ایوان کو جوابدہ نہ ہوگا۔ البتہ اگر سینٹ (ایوان اعلیٰ) اپنی ۲/۳ اکثریت

سے اس پر غداری کا الزام لگائے اور ڈیل (ایوان ادنیٰ) کی ⅔ اکثریت بھی اس الزام کی تصدیق کرے تو اسے منصب صدارت سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈیل (ایوان ادنیٰ) کے ۱۴۸ مندوبوں کا انتخاب چناؤ کرنے والے براہ راست کیا کریں گے متناسب نمائندگی کے اصول پر۔ ہر عاقل بالغ چناؤ میں حصہ لے سکتا ہے۔ سینٹ (ایوان اعلیٰ) میں ۶۰ رکن ہوں گے۔ ۱۱ وزیر اعظم کے نامزد کئے ہوئے، باقی ۴۹ میں سے ۶ قومی یونیورسٹی اور ڈبلن یونیورسٹی کی طرف سے تین تین کرکے۔ باقی ۴۳ کو پیشہ دار فہرستوں میں سے وہ لوگ منتخب کریں گے جنھیں ڈیل کے پچھلے انتخاب میں ۵۰۰ سے زیادہ اول نمبر کے ووٹ ملے ہوں یا جو بلا مخالفت ڈیل کے رکن منتخب ہوئے ہوں۔ سینٹ مجاز ہوگی کہ میزانیہ اور خرچ سے متعلق قانونوں کو چھوڑ کر باقی جس مسودہ قانون کو چاہے ۳ مہینہ تک روک رکھے، یا ان میں ترمیمیں پیش کرے بشرطیکہ پھر یہ ترمیمیں بعد کو ڈیل میں بھی منظور ہو جائیں۔

وزیر اعظم کا تقرر صدر جمہوریہ ڈیل کی سفارش پر اور وزراء حکومت کا تقرر وزیر اعظم کی سفارش پر کیا کرے گا۔ وزراء کے لئے ضروری ہے کہ ڈیل کے رکن ہوں یا سینٹ کے۔ لیکن سینٹ کے اراکین میں سے دو سے زیادہ وزیر نہ لئے جا سکیں گے۔ "بزرگوں" کی ایک کونسل بھی ہوگی، جس میں وزیر اعظم، نائب وزیر اعظم، چیف جسٹس، ڈیل اور سینٹ دونوں کے صدر ہوا کریں گے اور وہ لوگ جو پہلے ان عہدوں پر مامور رہ چکے ہیں یا وہ لوگ جنھیں صدر باختیار خاص رکن مقرر کرے۔ یہ مجلس صدر جمہوریہ کو اس کے فرائض کی انجام دہی میں مشورہ دیا کرے گی۔

عدالت عالیہ کے فیصلے ناطق اور قطعی ہوں گے۔ کسی مسودہ قانون کے متعلق یہ مسئلہ در پیش ہوگا کہ یہ دستور اساسی کے مطابق ہے یا نہیں تو صدر "بزرگوں کی مجلس" سے مشورہ کرکے اس کا فیصلہ عدالت عالیہ سے کرایا کرے گا۔

جدید دستور میں مندرجہ ذیل بنیادی حقوق کی ضمانت کی گئی ہے: اظہار رائے کا حق؛ مذہبی آزادی؛ ملکیت شخصی؛ اجتماع کا حق (بلا اسلحہ کے)؛ اور ہیئت اجتماعی کے بنیادی ادارہ،

خاندان' کا تحفظ۔ چنانچہ نکاح کا فسخ کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کسی اور جگہ طلاق حاصل کر لی گئی ہو تو یہاں تسلیم نہ کیا جائے گا!۔

سارے دستور میں بادشاہ یا سلطنت برطانیہ کا نام بھی نہیں ہے۔ (ذ۔ ح)

وفاقی حکومت اور اُس کی دشواریاں | دنیا کے متمدن ممالک میں جہاں جہاں وفاقی طرز کی حکومتیں قائم ہیں وہاں مجالس آئین ساز اور محکمہ ہائے انصاف میں اختلافات رونما ہو رہے ہیں۔ حکومت اور عدالت کے اس تصادم کی اطلاعات ان دنوں امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا سے آچکی ہیں۔ ہندوستان میں وفاقی حکومت کا دور شروع ہونے کو ہے اور عنقریب وفاقی عدالت کا قیام بھی عمل میں آنیوالا ہے۔ عجب نہیں کہ اہل ہند کو بھی اسی قسم کے مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑے۔ اس لئے لازماً ہمیں وفاقی حکومتوں کی کارگذاریوں اور ان کی راہ کی دشواریوں سے دلچسپی ہونی چاہیئے تاکہ ان حالات کی روشنی میں ہم اپنے ملک کے مستقبل کو کسی قدر بہتر بنانے کے لئے ابھی سے غور و فکر کرنا شروع کر دیں۔

اس سلسلہ میں جامعہ کے جون کے پرچے میں ہم امریکہ کی کانگریس اور عدالت عالیہ کے باہمی نزاع کا مختصر سا ذکر کر چکے ہیں۔ نیز یہ بھی بتا چکے ہیں کہ کیوں کر صدر جمہوریہ امریکہ عدالت عالیہ میں ایسے ججوں کی تعداد بڑھانا چاہتے ہیں جو اُن کے ہم خیال ہوں تاکہ عدالت میں اُن کے حامیوں کی اکثریت کانگریس کے پاس کردہ اصلاحی قوانین کو آئینی قرار دے سکے۔ اب کناڈا کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں وہاں کی پریوی کونسل نے وفاقی مجلس مقننہ کے پاس کردہ اصلاحی قوانین کو خلاف آئین قرار دینے میں عدالت کے فیصلوں کی تائید کی ہے۔ اس معاملہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اگرچہ ملک کی تمام جماعتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ ملک کی بہبودی کے لئے چند نئے قوانین کا وضع کرنا ضروری ہے مثلاً بیکاروں کے بیمہ کا قانون ——— لیکن پریوی کونسل کے بیان کردہ دستوری مفہوم کے مطابق وفاقی مجلس آئین ساز کے لئے ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس قسم کے مفید قوانین پاس کر سکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف تجویزیں کی گئیں لیکن کوئی بر روئے کار نہ آسکی۔ بالآخر موجودہ حکومت نے ایک رائل کمیشن بٹھایا ہے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ وہ کناڈا کی مالیاتی

حالات کی تحقیقات کرے، محاصل کے ذرائع پر غور کرے اور مرکز اور صوبوں کے درمیان ذمہ داریوں کی مناسب تقسیم کرے۔ اس کمیشن کی سفارشات دستوری اصلاح و ترمیم کے لئے دلیل راہ ثابت ہونگی۔

آسٹریلیا کی کامن ویلتھ کو بھی چند خاص حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ وہاں کی وفاقی پارلیمان کو بازاری نرخوں اور ہوائی پرواز کے بارہ میں مزید اختیارات دینے کی غرض سے براہ راست رائے دہندوں سے استصواب رائے کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت نے وفاقی ارباب حل وعقد کے خلاف فیصلہ دیا۔ آسٹریلیا کے دستور کے مطابق دستوری اصلاح کی تجاویز وفاقی پارلیمان کے سامنے پیش ہوتی ہیں قبل اس کے کہ براہ راست انتخاب کنندوں سے رائے طلب کی جائے۔ اس قبیل کی تجاویز قانون کی شکل جبھی اختیار کر سکتی ہیں جبکہ رائے دہندوں کی اکثریت انھیں پسند کرے۔ نہ صرف یہ بلکہ اکثر ریاستوں کی اکثریت اُن کے حق میں ہو۔ نرخوں میں ترمیم کی تجویز تمام ریاستوں میں مسترد ہوگئی۔ یہی حشر فضائی پرواز کی تجویز کا ہوا۔ اگرچہ مجموعی حیثیت سے اکثریت ان کے حق میں تھی لیکن کثرت رائے اسے صرف دو ریاستوں میں حاصل ہوئی۔ اس لئے دستور کی رُو سے اسے بھی مسترد کرنا پڑا۔ محکمۂ پرواز پر اصل اقتدار ریاستوں کو حاصل ہے کیونکہ باقی ماندہ آئین سازی کے اختیارات اُنھی کے ہاتھ میں ہیں، لیکن وفاقی پارلیمان کے بعض پاس کردہ قوانین کے ماتحت کامن ویلتھ بھی فضائی پرواز پر جزوی قبضہ رکھتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہنگامہ خیزی اور اندرونی خلفشار کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ وفاق اور ریاستوں میں اس قسم کا تصادم جاری رہیگا تا آنکہ کوئی خطرناک حادثہ پیش آئے اور آسٹریلیا کے ارباب فکر ضروری آئینی اصلاحات پر مجبور ہو جائیں۔

دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں کے دستور بہتر خیال کئے جاتے ہیں اگر اس قسم کے افسوسناک حالات پیش آسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں اُن کا اعادہ نہ ہو۔ جہاں کا وفاقی دستور سرے سے ناقص ہے اور اپنے اندر سینکڑوں پیچیدگیاں اور لاینحل گتھیاں پوشیدہ رکھتا ہے۔ مرکزی اور صوبائی ذمہ داریوں کی نامناسب تقسیم کے علاوہ دیسی ریاستوں کا مسئلہ یہاں اور بھی ٹیڑھا ہے۔ کیا یہ مسائل ہندوستانیوں کی توجہ کے مستحق نہیں ہیں ؟

(ع - ق)

تعلیمی دنیا

ڈاکٹر ونگ شی، چی وزیر تعلیم چین کے بیان کے مطابق چین کی ۴۵ کروڑ آبادی میں سے ۸۰ فیصدی ناخواندہ ہیں اور ایک کروڑ بچے جو اسکولی عمر کے ہیں ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کر سکے ۔ وزارت تعلیم، ابتدائی تعلیم پر خاص طور سے زور دے رہی ہے، اور صوبائی حکام کو ہدایات کر دی گئی ہیں کہ حکومت کے پنج سالہ تعلیمی لائحہ عمل پر پوری سرگرمی سے کام شروع کر دیا جائے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی نسبت آج اعلیٰ تعلیم گاہوں کی تعداد سو گنی ہے ۔ اور وسطانی مدرسوں کی تعداد آٹھ گنی ہو گئی ہے ۔ گذشتہ ۲۶ سال میں ابتدائی مدرسوں کی تعداد چوگنی ہو گئی ہے ۔

چین کی یہ تعلیمی ترقی باوجود قدامت پسندی، افیون نوشی، باہمی کشت و خون اور خارجی طاقتوں کے جارحانہ اقدام کے قابل مبارک باد ہے ۔ ہندوستان پچھلے ڈیڑھ سو سال سے ایک منظم اور طاقت ور حکومت کے زیر سایہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے مگر ابھی تک پڑھے لکھوں کی تعداد ۲ء۸ فی صدی سے زیادہ نہ ہو سکی ۔ طرفہ یہ کہ پچھلی صدی کے آغاز میں ایک سرکاری رپورٹ کے بموجب ہندوستان میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص تعلیم یافتگان کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی !

بین الاقوامی مونٹ سوری ایسوسی ایشن کی طرف سے بین الاقوامی مونٹ سوری کانگرس کا چھٹا اجلاس کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں یکم اگست سے دس اگست تک منعقد ہوگا۔ جملہ انتظامات وزارت تعلیم ڈنمارک کرے گی ۔ کانگرس کے مباحث کا عام عنوان "امن کی تعلیم" ہوگا ۔ کانگرس کا افتتاحی جلسہ یکم اگست کو ڈنمارک پارلیمان کے ایوان میں منعقد کیا جائے گا۔ اور خطبات استقبالیہ وزیر تعلیم ڈنمارک اور میڈم مونٹ سوری پڑھیں گے ۔ کانگرس کے عام عنوان "صلح جوئی اور آشتی کی تعلیم" پر مادام مونٹ سوری چھ خطبے دیں گی ۔ اس سلسلے میں دنیا بھر کے مونٹ سوری بچوں کے دستکاری کے

نمونوں کی نمائش بھی کی جائے گی۔ یورپ کے مفکرین، سیاست داں اور ماہرین تعلیم قومی عصبیت کی اس آگ کو جو دیکھتے دیکھتے پورے براعظم کو جہنم زار بنا سکتی ہے بہت خوف و ہراس کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور ہر سمجھ دار اور دور اندیش متنفس انفرادی اور اجتماعی طور پر صلح و آشتی کے لئے کوشاں ہے۔ امن پسند سیاستیکن اور مدبرین تو مختلف جماعتوں، حکومتوں اور بالغ آبادی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر معلمین اس صلح و امن پسندی کی بنیاد زیادہ استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک نئی نسلوں کے دل سے نفرت اور قومی تعصب کے اثرات دور نہ ہوں گے، عالمگیر امن اک مستقل صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں کچھ عرصے سے تعلیمی دنیا میں سینکڑوں کتابیں امن کے موضوع پر نکل چکی ہیں۔ بین الاقوامی یک جہتی اور یگانگت کے مرکز جینوا میں اس مقصد کے لئے ایک خاص ادارہ قائم ہے۔ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے مباحث کا ایک اہم عنوان ہمیشہ امن کی تعلیم ہوتا ہے۔

سوویٹ حکومت نے امسال مدرسوں کے کتب خانوں کے لئے ستر ملیون روبل کا میزانیہ منظور کیا ہے۔ اس میں سے ۴۵ ملیون تو ثانوی مدرسوں میں اور ۲۵ ابتدائی میں صرف ہوگا۔ تقریباً ۱۴ ملیون نئی کتابیں خریدی جائیں گی جو روسی بچوں کے بڑھتے ہوئے شوقِ مطالعہ کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ حکومت کی طرف سے بچوں کا اشاعت گھر قائم ہے جو آئندہ چند ماہ میں ۹۰۰ مختلف عنوانوں کی کتابوں کو بڑی تعداد میں چھاپ رہا ہے۔ ان میں روسی اور غیر ممالک کے مشاہیر کی تصانیف شامل ہیں۔ بچوں کے لئے مناسب کتابوں کی فراہمی ہر متمدن ملک کے لئے نظام تعلیم کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔ بعض ملکوں میں تو ان کی تصنیف اور اشاعت کسی بلند ہمت اور دلیر کتب فروش کی انفرادی کوششوں کی مرہون منت ہوتی ہے اور کہیں حکومت خود اس فرض کی انجام دہی اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ ہندوستان میں بدقسمتی سے یہ نازک کام ٹیکسٹ بک کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے اور جو اثرات کتابوں کو منظور کرانے میں ڈالے جاتے ہیں وہ کوئی راز نہیں۔ ان شرمناک خرابیوں کی وجہ سے بعض صوبوں میں تو یہ کمیٹی توڑ دی گئی ہے۔ روس میں کتابوں کی اشاعت کے علاوہ بچوں کے لئے

کتب خانوں اور عجائب گھروں کے قیام کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی کچھ کم اہم کام نہیں پچھلے دنوں کراچی میں بچوں کے لئے ایک تصویر گھر کھولا گیا ہے۔ اقتضائے وقت یہ ہے کہ بچوں کی کتابوں کی اشاعت کتب خانوں کی تنظیم وغیرہ کا کام مرکزی مشاورتی بورڈ اپنے ہاتھ میں لے۔ اور مرکزی تعلیمی کتب خانہ کا جو حال میں قائم ہونے والا ہے اک شعبہ اطفال کھول دے۔ جامعہ نے بھی اس سلسلے میں کچھ کام شروع کیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے ہمارے ادب کی ایک بڑی کمی کے پورا ہونے کا راستہ کھلے گا۔ اور مفید کام انجام پائے گا۔

پچھلے ماہ افغان نیشنل پارلیمان کا افتتاح کرتے ہوئے شاہ ظاہر شاہ غازی نے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

"تعلیم کے سلسلے میں ہم نے نوے وسطانی اور اعلیٰ اسکول قائم کئے ہیں مجھے یقین ہے کہ وزارت تعلیم اس تعداد میں جب اور جہاں کہیں بھی ممکن ہوگا اضافہ کرنے میں دریغ نہ کرے گی۔ آبادی کے ہر طبقے میں پشتو زبان کی تعلیم و تدریس کے لئے خاص طور پر کوشش کی جا رہی ہے"

حکومتِ ہند نے بیورلو آف ایجوکیشن کو سلسلہ ۱۹۲۲ء میں تخفیفِ اخراجات کے سلسلے میں بند کر دیا تھا۔ یہ بیورلو اب دوبارہ جاری کیا جائے گا۔ اس کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے:۔

(۱) تعلیمی کتب اور رسائل کا ایک مرکزی کتب خانہ قائم کرنا،

(۲) تعلیمی مسائل پر لٹریچر جمع کرنا اور اس کی مختلف صوبوں میں اشاعت کرنا،

(۳) صوبجاتی محکمہ تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً تعلیمی رسائل، پمفلٹ اور رپورٹیں شائع کرنا۔ نیز دلچسپ اور مفید مطلب معلومات بہم پہنچانا،

(۴) ہندوستان کی تعلیمی ترقی پر سالانہ اور پنج سالہ رپورٹ مرتب کرنا،

(۵) صوبائی تعلیمی افسران اور حکام کی درخواست پر تعلیمی مضامین کے متعلق معلومات بہم پہنچانا۔

یہ بیورو تعلیمی کمشنر کے ماتحت ہوگا۔ اور سکرٹیری تعلیمی مشاورتی بورڈ اس کا کیوریٹر ہوگا۔ اس ادارے کی طرف سے پہلے بھی علاوہ سرکاری رپورٹوں کے ملک کے تعلیمی مسائل مثل دو زبانوں کی تعلیم دیہاتی تعلیم وغیرہ پر رسائل چھپتے رہیں گے، مگر یہ رسائل بالعموم محکمہ تعلیم کے حکام کے قلم سے نکلتے تھے۔ اور تعداد میں بھی بہت کم رہے ہیں۔ امید ہے کہ آیندہ یہ ادارہ ہندوستان کے احیار تعلیمی کے قائدین کو اس مفید کام میں دعوت شرکت دے گا۔ کیونکہ تعلیمی نصب العین کی تبدیلی، طریق اور نظام کی اصلاح ہر ملک میں بالعموم غیر سرکاری اداروں اور ان ماہرین تعلیم سے شروع ہوئی ہے جن کا حکومت کے ارباب اختیار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بیورو کا کتب خانہ اسی حالت میں زیادہ مفید اور کار آمد ہو سکتا ہے، جب اس میں مختلف قسم کے شعبے ہوں جو تعلیم کے ہر صیغے کے لئے مواد بہم پہنچا سکیں۔ صرف صیغۂ اطفال میں ہی، کتب کھیل، تصویر گھر، صنعت و دستکاری وغیرہ کے کئی ایک شعبے کھل سکتے ہیں۔

سر تیج بہادر نے لندن میں تقریر کرتے ہوئے مسئلہ بے کاری پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا

"مجھے اپنے کام سے اتنا اطمینان ضرور حاصل ہوا ہے کہ عوام اور حکومت کی توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ بڑودہ اور ٹراونکور میں ہماری سفارشات پر عمل کرنے کی خاص کوشش کی گئی۔ آج کل مسئلہ بے کاری نازک حالت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اور اس سے بے پرواہی کا انجام بے حد خطرناک ہوگا۔ میں نے اپنے صوبے کی مجلس مقننہ میں بھی تقریر کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ اگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو تو میں ضرور اک وحشت انگیز انقلابی بن جاؤں گا

آج ہندوستان میں سیاسی فکر کی رَو گذشتہ پانچ چھ سال کی نسبت مخالف سمت میں چل رہی ہے اور اس کا نقطۂ نظر اقتصادی ہے۔ ہمیں زمیندار اور مزارع کے تنازعہ اور تعلیم یافتہ نوجوان کی بے روزگاری کا حل فی الفور تلاش کرنا چاہیئے۔ اگر یہ گتھی نہ سلجھ سکے گی تو حکومت اور سماج کو سخت خطرے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر اس کا کوئی مناسب حل نہ ہو سکا تو میں ان نوجوانوں کو ہرگز مورد الزام نہ ٹھہراؤں گا۔ جو حکومت اور سماج کے خلاف اظہار نفرت و حقارت کریں گے۔"

اخبار ٹائمس آف چائنا میں ایک مضمون "غلاموں کی تعلیم" کے عنوان سے چھپا ہے جس میں اس نظامِ تعلیم پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے جو جاپان نے مانچوکو میں شروع کیا ہے۔ مصنف اس ضمن میں ایک تعلیمی اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جاپانی حکام نے مدرسوں کے پرنسپلوں کو بلا کر ان تعلیمی اصولوں کی تشریح کی جن پر حکومت تعلیمی اداروں کو چلانا چاہتی ہے۔ مانچوکو میں تعلیم جسمانی محنت وریاضت کے نقطۂ نگاہ سے دی جائے گی۔ اہلِ مانچوکو کو اپنے جسمانی قویٰ کا استعمال سکھایا جائے گا۔ مگر ذہنی قویٰ کی تربیت ہرگز نہ دی جائے گی۔ جاپانیوں کا دعویٰ ہے اہلِ مانچوکو گھٹیا اور ارذل نسل سے ہیں۔ انھیں ذہنی نشوونما کی ضرورت نہیں۔

تقریباً تمام کالج اور سینیر مڈل اسکول بند کر دئے گئے اور اس طرح اعلیٰ تعلیم کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور نیچے کے درجوں میں بھی فنی اور صنعتی تعلیم پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ حکومت ہر ممکن طریق سے اعلیٰ تعلیم کے رستے میں مشکلات حائل کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ جاپانی سیاسیئن کا خیال ہے کہ یہ تعلیم عوام میں بیداری اور احساسِ خودداری پیدا کرتی ہے۔

چینی تاریخ اور ادب کے لئے مدرسوں میں کوئی جگہ نہیں۔ ان کی جگہ جاپانی کہانیوں، ضرب الامثال اور جاپانی مشاہیر کی سوانح عمریوں نے لے لی ہے۔

لڑکوں کو محنتی... اور جفاکش بنانے کے بہانے اُن سے ہر قسم کا رذیل کام لیا جاتا ہے۔ ان سے نہ صرف مدرسے کے کمرے، اساتذہ کے گھر، پرنسپل کا دفتر صاف کرایا جاتا ہے، بلکہ بالعموم شہر کی گلیوں کی صفائی بھی ان کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

طلباء کے داخلے پر حکومت کی طرف سے سخت اور بے جا پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ داخلے کے سلسلے میں کئی ایک اسناد داخل کرنا پڑتی ہیں۔ جن میں سے ایک پر طالب علم کے جائے پیدائش کے پولیس افسر کی بھی تصدیق ہونا چاہیے۔ غرضکہ جاپانی حکومت کی طرف سے اس امر کی پوری احتیاط کی جاتی ہے کہ ناپسندیدہ طلباء تعلیمی اداروں میں داخل نہ ہونے پائیں۔ حکومت ان اساتذہ سے بہت سختی سے پیش آتی ہے جو مدرسوں میں چینی ادب یا روایات کا ذکر کرنے کے مجرم ٹھہرا دئے جائیں جب کبھی کوئی غریب اس جرم میں ماخوذ ہو جاتا ہے تو اس کی جان کی خیر نہیں ہوتی۔ جیل خانے مانچوکو

کے اساتذہ سے پر ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض تو شدید عقوبت کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے اور بعض کو قتل کر دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ خوں چکاں داستان ان کوششوں کی جو استعماریت پسند جاپان غریب منچوکو کو مہذب بنانے کے لئے کر رہا ہے!

بنگال میں ایک ثانوی تعلیمی بورڈ قائم کرنے کی تجویز حکومت کے زیر غور ہے۔ اس قسم کے بورڈ کی کلکتہ یونیورسٹی کمیشن ۱۹۱۷ء نے سفارش کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹی کے ذمے سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ تعلیم اور امتحانوں کی نگرانی کا بوجھ ہٹ جائے، تاکہ یونیورسٹی اوپر کے درجوں کی تعلیمی اصلاح اور علمی تحقیقات وغیرہ کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لے سکے۔ اس سفارش کی بنا پر ایسے بورڈ یوپی، اجمیر وغیرہ میں قائم ہوئے۔ حکومت بنگال نے بالآخر اس طرف توجہ کی ہے۔ بورڈ کے ممبر تعداد میں ۲۹ ہوں گے۔ کچھ منتخب کئے جائیں گے، باقی نامزد ہوں گے۔ بورڈ کا فرض ثانوی تعلیم کی صحیح رہنمائی، نگرانی اور انتظام کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کو اس بورڈ میں خاص نمایندگی دی گئی ہے۔

حکومت یوپی نے مسلمانوں کے تعلیمی زعماء کو اک مشاورتی کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ جس میں ان سرکاری تجاویز پر بحث کی گئی جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی ۱۹۳۰ء کے رزولیشن پر مبنی ہیں۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر ضیاء الدین، پروفیسر غلام السیدین، مسٹر عبدالمجید قریشی، نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب اور چند دیگر اصحاب شریک تھے۔ حکومت کی طرف سے وزیر تعلیم اور ڈائرکٹر تعلیمات نے نمایندگی کی۔ مسلم قائدین کو حکومت کی طرف سے یقین دلایا گیا ہے کہ وہ ان کی تعلیمی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہے اس سلسلے میں حکومت کی تجویز عام اطلاع پانی کے لئے عنقریب مشتہر کر دی جائے گی۔

ارجنٹائن (جنوبی امریکہ) ۔ ارجنٹائن میں نارمل سکولوں کی چوتھی جماعت کے طلباء پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ناخواندہ بچوں اور بالغوں کو تعلیم دیں۔ مجلس ملی تعلیمی نے ہر صوبائی محکمہ انسپکٹری میں ایک مقامی تعلیمی عجائب گھر کھولنے کی تجویز پیش کی، جہاں ضروری اشیاء تبولی نمونے کے، بڑی عجائب خانے سے فراہم کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ مقامی پیداوار پھول پتی وغیرہ کے نمونے بھی نمائش کے لئے رکھے جائیں گے۔ پچھلے چند سالوں سے بے علمی اور ناخواندگی کے خلاف ایک جہاد پیہم کیا جا رہا ہے۔ پچھلے سال مدرسوں کے بچوں کے لئے ایک مستقل آرٹ میوزیم پہلی مرتبہ کھولا گیا۔ جس میں مشہور مصوروں اور سنگ تراشوں نے اپنے فن کے نادر نمونے تحفۃً پیش کئے۔ ادبی اور تمدنی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے ایک نیشنل کمیشن فور کلچر موجود ہے۔ جس کا فرض تجرباتی کام کے لئے وظائف اور انعامات دینا اور ان اوقاف کا انصرام کرنا ہے جو کلچرل مقاصد کے لئے بنائے گئے ہیں۔

بمبئی سے ۲۰ ہندوستانی لڑکیاں جو مختلف کالجوں اور تعلیمی اداروں میں پڑھتی ہیں تعلیمی دورے پر یورپ گئی ہیں۔ اس دورے کی مہتمم مسز دتا، پرنسپل فورمن کرسچن کالج لاہور کی بیوی ہیں۔ یہ اپنی نوع کا چوتھا سفر ہے۔ اور ہر مرتبہ پروگرام مختلف ہوتا رہا ہے۔ اس مرتبہ یہ پارٹی فرانس، بلجیم، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی سیر کرے گی۔ اس دورے کا تعلق بین الاقوامی سٹوڈنٹ سروس سے ہے۔ یہ سروس اساتذہ اور طلباء کو غیر ممالک میں سیر و سیاحت کے لئے ہر قسم کی اطلاعات اور سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ بعض ملکوں میں تو اساتذہ اور طالب علموں کے باہمی تبادلے کے باقاعدہ ادارے ہیں۔ مثلاً بعض یونیورسٹیاں آپس میں پروفیسر تبدیل کر لیتی ہیں۔ جرمنی میں خصوصاً ملک کے ایک حصے سے طلباء کسی ایسے اسکول میں منتقل کر دئے جاتے ہیں جو کسی اور حصہ ملک میں واقع ہے۔ اس طرح چند روز کے قیام سے وہ ملک کے ہر حصے کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

[redacted]

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

نمبر ۳	ستمبر ۱۹۳۷ء	جلد ۲۸

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپے (صہ) — فی پرچہ آٹھ آنے (۸)

پرنٹر، پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، مطبع ... قرول باغ ۸۰۰

شمالی ہند کے دیہاتی شعرا میں جدید انقلابی رجحانات

(بہ سلسلہ گذشتہ)

سعد اللہ میولت کا بہت پرانا اور اعلیٰ درجے کا شاعر ایک دوہے میں کہتا ہے جو آدمی اپنی ذات کو گروہ سے وابستہ نہیں رکھتا اور اس کے سو دوست اور پچاس دشمن نہ ہوں اس کی پیدائش ہی بے کار ہوئی۔

جا کے نٹو ساہو نہیں بیری نہیں پچاس
ماتا ایسے پتر سے تو کیوں بوجھل مری نواس

کھکلے بھی ایک پرانا میواتی شاعر ہے وہ کہتا ہے کہ غربت سے زیادہ ذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

دوہا

ٹوٹو[۹۱] ایسی چیز ہے جیسے کتا کا ہنڈو[۹۲]
کہیں سو ٹل جاوے ٹوک کہیں سے ہو جاوے ٹرکو[۹۳]

دوہا

ٹوٹے بیری تو برو ، تو پے چلے نہ گھات
سگھڑن کی اگھڑن لگے کوڑھن[۹۴] کی سی بات

ایک دوہے میں کہتا ہے کہ اگر عقل ہو تو دولت بھی ہونی چاہیئے۔ دولت، عقل دونوں کا نہ ہونا بڑا غضب ہے۔

دوہا

چترائی دے تو دھن دیجئے نا تر اپنی چترائی بھی لے
چترائی اور نادھنا سائیں دونوں دکھ مت دے

ایک دوہے میں کہتا ہے کہ دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا تو مردوں

---

۹۱ مفلس۔ ۹۲ دھکے کھاتا پھرنا ۹۳ نکالا جانا ۹۴ بے وقوف

اور ناخلفوں کا کام ہے اور خود اپنے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا بہادروں، شیروں اور صحیح النسب لوگوں کا کام ہے۔

دوہا

لیک لیک گاڑی چلے لیک ہی چلے کپوت
یہ تینوں اوبٹ[1] چلیں سورا[2]، سنگھ سپوت

جدید دیہاتی شاعروں میں شب لال ساکن کوٹ علاقہ میوات ہے جو اپنی ایک چوپئی میں اہلکاروں کے حالات اس طرح بیان کرتا ہے۔ یہ اقتباس پوری چوپئی کے بجائے اس کا ایک حصہ ہے

دوہا

سن لے دھر کے دھیان میں کروں بیان حقیقت ساری
سب نجّے[3] یا پولیس میں کر رہے تھانیداری
مقدم، چوکیدار ٹکے کے یار جلم پٹواری
رشوت کھا سلٹی کی الٹی کر ڈاری

چوپئی

نا یہ رحم کریں کائی پے بھونٹی[4] کر دھریں بھائی پے
اپنی ناچو کیں آئی پے جھوٹی سوگن[5] کھا جائیں مائی پے

شعر

نیت بگڑی سبن کی جتنے اہلکار ہیں
بے بات کریں کید[6] اور جرمانے کو تیار ہیں
دے کر رشوت چھٹا لاؤ یہی ان کا رہے
شرم کاہی کو نہیں چاہے کہاں رشتہ دار ہے

---

[1] بے راہ [2] سورما، بہادر [3] بے حیا [4] کند [5] قسم [6] قید

پٹکا

بے پیسہ کی لاج چاہے مخلاج ناگھر میں ناج
ہوئے پیسہ اُن کو تیار نہ سمجھیں ست است میں

چھند ہریانہ

ایک بات اور نئی سناؤں سبھی سنو سرداری
اُٹھ گئی رے دیس اپنے سے ساہوکاری
دھریں بیاج پر بیاج ناکریں لہاج رکم ہوئے بھاری
وہ بیٹے نا پستوں پشت اسامی ہاری

پٹکا

دیکھو اُنکو لپار، دھرم کی ہار، پاپ سردا
سبن کے اوپر ہوا سوار نا کلا[۱] رہی ہے ست میں

کوٹ (علاقہ میوات) کے ایک بالکل نوخیز شاعر سراج خاں کے دو بھجن ہیں یہاں نقل کرنے کے قابل معلوم ہوتے ہیں۔

بھجن نمبر ۱

بج رہے پاپ کے ڈھول دُکھ پا رہے بھارت باشی

جھوٹے جال پونیں پھیلادے — بن کانون سفر ٹھیرا دے
رستہ گیر کو جال لگا دے — ایک سونو کے بولے بول جب جھگڑی بھرے کھاسی[۲]

کھ پا رہے بھارت باشی

بیٹھے رہیں جو اپنے گھر میں — گمتی ہیں مال اور جڑ میں
وہ بھی کر دے دس نمبر میں — اُن پر بنا کھتا[۳] دیا صول مجھو سن من آوے ہانسی

۱؎ تاثیر، قوت تاثیر ۲؎ خاصی ۳؎ خطا

دکھ پارہے بھارت باشی

تین روپے جو لیں رپٹ کے — یہ مجھو دیکھے ہیں کھاس کپٹ کے

آنکھ لال کرتے ہیں ہٹ کے — مارن کو لیں رول[1] تھانے والے ستیاناسی

دکھ پارہے بھارت باشی

سیدھی نہیں چلت بات ہیں — کسان کا گلا کاٹ ہیں

دیواں سری کے بنے لاٹ ہیں — جن کا دو پیسے کا مول سکے نہ بنے پھریں چپراسی

دکھ پارہے بھارت باشی

بج رہے پاپ کے ڈھول دکھ پارہے بھارت باشی

بھجن نمبر ۲

دکھ پارہے بہت کسان پٹواری لگے ستانے

جب پٹواری جمع اگھانے — تین روپے کے آٹھ بتانے

بنا کام کی رشوت کھاتے — نیک نہ کرتے کام گو وڑے باندھ لٹو پر جانے

پٹواری لگے ستانے

تہر کے منشی کریں صفائی — تنگی، جو گنی کریں بھرائی

گرداور نے رشوت کھائی — چھوٹے سے اک کھیت پر، لگے مال مفت میں کھانے

پٹواری لگے ستانے

زمیندار پر ہے کنگالی — بری مصیبت کھدلانے ڈالی مات پتا بچے گھروالی

جن کے رات دن پڑے کمانے — نہیں ملے وقت پر کھانے

پٹواری لگے ستانے

---

[1] رول (لائن کھینچنے کا)

ٹھگی، جال حاکم کے چھایا — گٹّو کال نے کھیال دکھایا
جس سے دکھ پائی ہر رعایا — لیں مفت گھاس اور دانے
پٹواری لگے ستانے
دکھ پارہے بہت کسان پٹواری لگے ستانے

ننت لال ساکن انکھیر (نواح ۔ فریدآباد) کا شاعر ہے اس کا تازہ بھجن قابل ذکر ہے

بھجن

مرے ہم کیوں نا دکھیا دین کسان ؛
جو طرف سے دکھ کے بادل ہمارے اوپر امنڈ رہے
کوئی ہوا نہیں جو انھیں ہٹا دے امنڈ امنڈ کر گھمنڈ رہے
گرج گرج کر شور مچادیں ۔ سن سن کر ہم ڈرن لگے
دکھ روپی اولوں کے بھئے سے بنا موت مرن لگے
کہیں کہاں سے آئے گا یہ بچکر رات دن کرن لگے
جب کوئی نہیں سہارا دیکھے دھیان ہری کا دھرن لگے
شاید رکھشا کرے ہماری دین بندھو بھگوان
مرے ہم کیوں نا دکھیا دین کسان ؛

کھیتی باڑی کرنا بھائیو ہمیشہ ایک ہمارا ہے
اور دوسرا پشو پالن اُن سے ہی فقط گذارا ہے
اس سے ہی بھارت کا چلتا سارا ساہوکارا ہے
ان ساہوکاروں کے بس مٹھی میں جان ہماری ہے
مان ہی کے لئے کہتے ہیں جو کچھ کھیتی کیاری ہے

علی الحساب سبھی لے جاویں جو ہو پیداواری ہے
پھر بھی ان کا سود پٹے نا رقم بنی آہی ساری ہے
ہمارے نہیں ناج کا دانہ ان کے بھرے مکان
مرے کیوں نہ دکھیا دین کسان ؎

گھر پر بچے بھوکے رووں ساہوکار پہ جلتے ہیں
آج نہیں ہے پھر لے لینا ہم کو سو بات بناتے ہیں
بھوکے مر کر گھاس پھونس کھا کتنے ہی روز بتاتے ہیں
جوڑے ہاتھ گڑگڑائے پھر مہر ساہ کو آئی ہے
پچھلا میرا سود پٹا دو بس تو میرے بھائی ہے۔
بیل، بھینس اور گائے ہیں دو پھر یہ بات اڑائی ہے
وہ بھی ہم نے لگا دئے بس گھر کی کری صفائی ہے
باجے جوت پڑا ہے دنیا باقی سارا لگان
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دین کسان

نمبردار چڑھے چھاتی پے گالی دے نت پٹواری
اور تیسرے دن دیتا ہے جیل وارڈ و گی نیاری
. . . لگان بھرو نہیں بہت ہو تمھاری کھاری
چپراسی کو بلا بلا کر بس ہم کو پٹواتے ہیں
برتن بھانڈے بیچ انھیں دے اپنی جاں بچاتے ہیں
پھر بھی نہیں لگان پٹا پھر یہ وارنٹ کراتے ہیں
ہیں جیل میں ٹھونس پھیر گھر در نیلام کراتے ہیں
پھر بھی روزی داتا دنیا کے ہم مانے جاتے ہیں

سلہ ذیلدار

استنے پر بھی نہیں نکلتے پاپی بے یا پران -
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دین کسان

روزی دانا بھوکے مرتے ، کرتے موج بھکاری ہیں
ہمارے چھپر نہیں رہنے کو اُن کے محل اٹاری ہیں
ہمارے پیسے سے اُن کے موٹر کار سواری ہے
چالاکوں کے مجھے یہاں سیدھوں کا جینا بھاری ہے
قلاقند کھائیں وہ امرتی ، دیکھ دیکھ ہم للچائیں
بھاگ کا دوش بتاکر ، من مار مارکر رہ جائیں
سر پر جوتی پڑیں سینکڑوں ، کیا مجال کچھ کہہ جائیں
ہم کو بے ایمان گنوار کہیں سن کر سب کی سہہ جائیں
اننت لال کہے مکاروں کی ، چل رہی خوب دکان
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دین کسان

وہ کلام جن کے کہنے والوں کا سراغ نہیں ملتا مندرجہ ذیل ہے۔ جس میں سب سے پہلے ایک ٹیسو کا گیت نقل کیا جاتا ہے جو بچپن سے آج تک سنتے ہوئے عمر گذری ہے۔ ذرا اس کا تمسخرانہ انداز بیان بھی ملاحظہ ہو :-

ٹیسو

اک بنئے کی کا حال کہوں ، جیسے لونڈ[۱] پہاڑی کا
اسّی گز کی انگیا پہنے کچھ نا بدن بچاری کا
دوسو گز کا لہنگا باندھے ناجک بدن بچاری کا

۱؎ مرے ۲؎ ناف

چار کھیت گا جسے کے کھاگئی۔ گجرا کھا گئی کیاری کا
کچھ نہ بدن بچاری کا۔ نا جک بدن بچاری کا
سود میں گاؤں بیٹھی کھا گئی، پیٹ پھٹا ناداری کا
کال سے دنیا بھو کی مرگئی، دھن نا گھٹا ہتیاری کا
اک بنئے کی کا حال کہوں جیسے ٹونڈ پہاڑی کا
چار چرس پانی کے پی گئی سانس نہ ٹوٹے واری کا
کوٹھے اوپر موتن بیٹھی، پل ٹوٹا پنچیاری کا
تین گھر جاٹن کے بہہ گئے، چوتھا گھر بھٹیاری کا
کچھ نہ بدن بچاری کا، ناجک بدن بچاری کا

ایک شاعر نے بیان کیا ہے کہ کس طرح زمیندار زمین دیتے وقت کسان سے فریب کرتے ہیں اور وصولی کے وقت سختی، جس سے کسان برباد ہو جاتے ہیں۔

برسو سا ڈھو مینہہ مکدم میٹھا بولے

بنہ تو ستا کیا سکھ کیا انعام — آیا موسم کاتک کا تو بکے مانگے دام
سب کے مانگے دام رام تینے کیسی کینی — پاگ پچھوڑی بیچ گا نٹھ کی بدیا دینی

ان جملہ اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیہاتی دنیا میں عرصے سے یہ تلاش ضرور جاری ہے۔ کہ سرمایہ دار کی لوٹ اور اپنی فاقہ کشی کا حل کیا ہے۔ مذہب اُن کے نزدیک ان مشکلات کا قابل عمل حل پیش کرنے سے قاصر ہو گیا۔ ساہوکار اور بڑے بڑے زمیندار کوئی حل ڈھونڈھنا نہیں چاہتے اور ان کے خیال میں سرکاری اہلکار بھی ان ہی کے زمرے میں شامل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب اُن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنا اور روپیہ والا بن جانا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری نظر سے اب تک کسی دیہاتی شاعر کا ایسا کلام نہیں گذرا ہے جس میں کوئی حل پیش کیا گیا ہو۔ لیکن وقت آگیا ہے کہ۔ دیہات سے ایسے شاعر نکلیں جو اس مشکل الجھن کا کوئی حل پیش کریں۔

ہندوستان کا کسان

ذیل کا مضمون الیف، ایم ڈی میلو کے ایک مضمون سے اخذ کیا گیا ہے

جو امریکہ کے رسالے کرنٹ ہسٹری بابت جون [illegible] میں شائع ہوا ہے

سرکار کی طرف سے جو کتابیں ہندوستان کے اسکولوں کے نصاب میں داخل کی جاتی ہیں ان میں برطانوی عہدِ حکومت کی برکات کا دل کھول کر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور ان میں خصوصیت کے ساتھ برطانوی عہد کے امن و امان کو خوب سراہا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کل جنگوں کی قتل و غارت گری سے ہندوستان کو نجات مل گئی ہے۔ لیکن بھوک سے سسک سسک کر جان توڑنے کی لعنت و مصیبت اب بھی باقی ہے

ہندوستان کسانوں کا ملک ہے۔ اس لئے ہندوستان کی مرفہ الحالی کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ یہاں کا کسان مرفہ الحال ہو۔ لیکن جب تحقیقات کی جاتی ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسان کی معاشی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ خصوصاً جب سے زرعی اشیا کی قیمتیں گرنا شروع ہوئی ہیں۔ اس وقت سے تو کسان کی حالت بہت ابتر ہو گئی ہے۔ زمینداروں اور ساہوکاروں کے خلاف جذبہ بڑھتا جا رہا ہے جسے قوم پرست جماعتیں حکومت کی مخالفت میں استعمال کر رہی ہیں۔

معاشیات کے ایک ماہر نے بیان کیا ہے کہ گذشتہ سو سال سے دنیا کی غذا جس قیمت پر فراہم کی جا رہی ہے وہ لاگت سے (اگر لاگت میں اس کے تمام ضروری عناصر کو شامل کیا جائے) کم ہے مغربی ملکوں کی سرمایہ دارانہ زراعت پر ممکن ہے یہ قول صادق آئے یا نہ آئے لیکن ہندوستان کی زراعت کے بارے میں اس کی صداقت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستان کے کسان کو زراعت کے کاروبار میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔ برسات مشتبہ اور غیر یقینی ہوتی ہے۔ مویشی کثرت کے ساتھ مرتے رہتے ہیں۔ قیمتوں میں تلوّن کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زراعت میں نفع کی صورتیں کم

اور نقصان کی بہت زیادہ ہیں۔ ہندوستان کے لوگ نقصان کے باوجود اس پیشے سے محض اس لئے لگے ہوئے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

پیداوار کی کمی | غذا کی فصلوں کو پیدا کرنے سے جو خالص بچت کسان کو معمولی سالوں میں ہوا کرتی تھی وہ عموماً بہت کم بچی ہوتی تھی۔ لیکن جب سے قیمتیں گر کر اپنی موجودہ حالت کو پہنچی ہیں اس وقت سے تو بچت کی جگہ کسان کو صاف اور کھلا ہوا نقصان ہو رہا ہے۔ کسان کی جوت میں جو آج رقبہ ہے اس پر صدیوں سے کاشت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے زمین کی قدرتی زرخیزی سے جتنا انتہائی کام لیا جا سکتا تھا وہ لیا جا چکا ہے۔ اب اس کی زرخیزی میں اضافہ کھاد کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے لیکن کسان زمین میں کھاد یا تو اس لئے نہیں ڈالتا کہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے یا اس لئے کہ گوبر جو سب سے سستا کھاد ہے اس کا فائدہ ایندھن کی طرح استعمال کرنے میں زیادہ ہے۔ ہندوستان کی برسات کا تلون مشہور ہے۔ اگر ایک سال خشک سالی ہوتی ہے تو دوسرے سال سیلاب آجاتے ہیں۔ آبپاشی کے انتظام سے جزئی طور پر اس کی کچھ تلافی ہوئی ہے۔ حکومت نے تقریباً ایک ارب پچاس کروڑ روپیہ، تین کروڑ ایکڑ غیر مزروعہ رقبے کو کاشت میں لانے کے لئے صرف کیا ہے۔ لیکن آبپاشی شدہ رقبہ کا تناسب اب بھی بہت کم ہے پھر ایک طرف تو پانی کی رسد ناقابلِ اعتماد ہے۔ دوسری طرف اولے، پالے، جنگلی جانوروں، ٹڈیوں، چوہوں اور دوسرے موذی جانوروں سے پیداوار کو نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کاشت کے طریقے بھی دقیانوسی ہیں۔ جو اوزار استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً لکڑی کا ہل اور ہنسیا وہ بہت ہی ابتدائی اور قدیم ہیں۔ غلے کی گہائی یا ہاتھ سے کی جاتی ہے یا لکڑی سے پیٹ کر یا بیلوں کے کھروں کے نیچے روند کر۔ جدید آلات کے خریدنے کے لئے کسان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔ مویشیوں کی نسل کشی بلا امتیاز کی جاتی ہے۔ بیمار مویشیوں کو الگ نہیں رکھا جاتا جس سے ان میں امراض اور وبائیں پھیلتی ہیں۔ پھر ایک فصل کاٹنے کے بعد کھیتوں کو عرصے تک پرتی یا خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بےکار مویشیوں کو جیو ہتیا کے خوف سے مارا نہیں جاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ میں تو مویشی کا وزن اوسطاً چودہ سو پونڈ ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں چار سو سے سات سو پچاس پونڈ تک

ہوتا ہے۔

اوپر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ کسان کی مشکلوں کا سبب (اگرچہ ان میں سے بعض اس نے اپنے لئے خود پیدا کی ہیں) پیداوار کی کمی ہے۔ ہندوستان میں فی ایکڑ صرف ۱۳ بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے حالانکہ انگلستان میں گیہوں کی پیداوار ۳۱ بشل اور ڈنمارک میں ۴۹ بشل فی ایکڑ ہے۔ ہندوستان میں فی ایکڑ ۹۰۰ پونڈ چاول پیدا ہوتا ہے لیکن امریکہ میں ایک ہزار نوے اور جاپان میں دو ہزار ستر پونڈ۔ ہندوستان میں فی ایکڑ ۵۹ پونڈ روئی پیدا ہوتی ہے لیکن امریکہ میں ۱۲۱ پونڈ اور مصر میں ۴۵۳ پونڈ۔ ہندوستان کے ایک ماہر معاشیات نے تخمینہ کیا ہے کہ برطانوی ہندوستان میں پیداوار کا اوسط فی ایکڑ جس میں آبپاشی شدہ فصلیں بھی شامل ہیں جاپان کے مقابلے میں صرف ۱/۳ ہے۔

پیداوار کی اس کمی کے باوجود کھانے والوں کی تعداد ۳۵ کروڑ ہے اور ان میں سے ۷۰ فیصدی کو زراعت کے پیشے سے ہی اپنا گذارا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جس رقبے پر غذا کی فصلوں کی کاشت کی جاتی ہے اس کا تناسب جب برطانوی ہندوستان کی آبادی پر پھیلایا جاتا ہے تو اس کا حصہ رسد فی کس ۳/۴ ایکڑ پڑتا ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں آبادی کی تعداد میں ۴۰ کروڑ تک اضافہ ہوجانے کی امید ہے؛ اس لئے صورت حال نازک ہوتی جارہی ہے چند سال گذرے ایک ماہر زراعت نے دکن کے ایک نمائندہ گاؤں کی حالت کا مطالعہ کرکے دریافت کیا تھا کہ زمین کے مالکوں میں صرف ۵ خاندان ایسے تھے جنھیں اپنی زمین سے کافی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ ۴۰ ایسے تھے جو زراعت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے اپنی آمدنی میں اضافہ کرکے محض گذارے کے لائق کر رہے تھے اور ۷۵ خاندان ایسے تھے جو سخت افلاس میں زندگی بسر کررہے تھے۔ اُن مہاراجوں اور لکھ پتیوں کے باوجود جو دنیا کی اسٹیج پر موروں کی طرح دم پھیلا کر ناچتے اور اپنے پروں کی چمک دمک دکھلاتے ہیں، ہندوستان غریبوں کا ملک ہے۔ لوگوں کی غذا سے اُن کی معاشی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ کرنل میک کریسن کی ہندوستان میں غذا کی تحقیقات کا کام کررہے ہیں انھوں نے جب ملک کی آبادی کے خاص خاص گروہوں مثلاً سکھوں، مرہٹوں، پٹھانوں، گورکھوں، بنگالیوں

اور مدراسیوں کی غذا کے بارے میں تحقیقات کی تو اس سے بعض دلچسپ حقائق ظاہر ہوئے جب مختلف گروہوں کی غذاؤں پر تجربہ چوہوں کو کھلا کر کیا گیا تو اس آزمائش سے سکھوں اور بنگالیوں کی غذا کا فرق نمایاں طور پر ظاہر ہو گیا جن چوہوں نے سکھوں کی غذا کھائی وہ تندرست، چاق و چوبند اور اسی لیے سر بن گئے۔ لیکن جنھوں نے بنگالیوں کی غذا کھائی اُن کی تندرستی خراب اور اُن کا مزاج سخت اشتعال پذیر ہو گیا۔ اس لئے بنگال میں جس قدر سیاسی شورش ہے۔ وہ سب ناکافی غذا کی وجہ سے ہے۔ لارڈ لنلتھگو موجودہ وائسرائے نے حال میں تغذیے کے مسائل سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھیں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صرف ۲۰ فیصدی آبادی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے کافی غذا ملتی ہے۔

انسانی عنصر | انسانی عنصر ظاہر ہے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں، اسی کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کسان جن حالات میں کام کرتا ہے وہ سخت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا ہیں۔ اسے نہ صرف پیداوار کی کمی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ زمیندار، ساہوکار اور سرکاری ملازم سب اس کی جان کے لاگو بنے رہتے ہیں۔ زمیندار ایسا لٹیرا ہے کہ فصل چاہے اچھی ہو یا خراب وہ اپنا لگان ضرور وصول کرتا ہے۔ ساہوکار اتنا لالچی ہے کہ جب وہ ضرورت سمجھتا ہے کہ کسان کو عمر بھر کے لئے اپنا مقروض بنائے رکھے تو اسے اپنے بہی کھاتوں میں جعل سازی کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا پھر سرکاری ملازموں کی بیرحمی ہے جو محاصل وصول کرنے کے سلسلے میں کسان کی سب چیزیں قرق کر لیتے ہیں اور خانماں برباد کر کے اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ یہ دیہاتی زندگی کے ایسے واقعات ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے، کسان، جاہل، ناواقف اور ناعاقبت اندیش ہوتا ہے۔ اس کی زندگی پوری طرح اپنے ان دوست نما دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اُسے سرکاری چپراسیوں، منشیوں اور محرروں کو جن کی تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں۔ رشوتیں دینا پڑتی ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ملازموں پر بڑے افسر ہوتے ہیں جن کو اس لوٹ مار سے حصہ ملتا ہے اور اس طرح غریب کسان کو جس کا شکار کرنا بہت آسان ہے پوری طرح نوچ کھسوٹ لیا جاتا ہے۔ ساہوکار کی

معمولی شرح سود ۲۵ فیصدی سے ۵۰ فیصدی تک ہوتی ہے اس کے علاوہ کسان اپنی فصل کو ساہوکار کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسے مزید نقصان پہنچتا ہے۔ کسان جب زمین کی حیثیت بڑھاتے ہیں یا زراعت کو ترقی دیتے ہیں یا جب ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے تو ان سب باتوں کا نفع زمیندار کو ملتا ہے۔ کیوں کہ اسے لگان بڑھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ساہوکاروں کا ظلم اتنا بڑھا ہوا ہے کہ خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے ہاتھوں سے زمینیں تیزی کے ساتھ نکلی جا رہی ہیں۔ دس سال کے اندر اندر صرف پنجاب میں محض لگان وصول کرنے والے زمینداروں کی تعداد (جو اپنی زمین کی کاشت خود نہیں کرتے بلکہ لگان پر اٹھاتے ہیں) ۶ لاکھ ۲۶ ہزار سے ۱۰ لاکھ ۴ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ زمین کے معاملے کی اصلاح، دور حاضر کا ایک ضروری مسئلہ ہے۔ لیکن حکومت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کچھ سال گذرے سود کے خلاف ایک قانون بنایا گیا تھا، لیکن اس پر عمل درآمد کرانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ مالدار لوگوں کو اقتدار حاصل ہے اور حکومت ان سے بگاڑنا مناسب نہیں سمجھتی۔

نتیجہ یہ ہے کہ کسان تقدیر پرست بن گیا ہے۔ صرف حال کی باتیں سوچتا ہے اور مستقبل کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ بات اس کی مسرفانہ عادتوں سے پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں دلچسپیوں کی اس قدر کمی ہے کہ جب کبھی کوئی شادی یا موت واقع ہوتی ہے تو ان تقریبوں کو غنیمت سمجھ کر وہ نہایت بے دردی سے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اپنی ذاتی پونجی کوئی نہیں ہوتی اس لئے قرض کے اژدہے سے معاملہ کرتا ہے اور عموماً اکثر ایمان دار اور محنتی کسانوں کی تباہی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ قرض کی وجہ سے ہزاروں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور آخر میں ہر طرف سے ہار کر صنعتی شہروں میں کام کی تلاش میں کسان نکل کھڑا ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں سے اس کی کارکردگی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے صحت خراب ہو جاتی ہے اور امراض کے دفع کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان میں بہت سی وبائیں پھیلتی رہتی ہیں۔ مثلاً پلیگ، ہیضہ اور چیچک۔ لیکن ان وبائی امراض سے زیادہ تباہ کرنے والے وہ امراض ہیں جو مستقل طور پر موجود رہتے ہیں مثلاً ملیریا، کالا آزار، پیچش، تپ دق

پیٹ کے کیچوے اور ہک ورم (HOOK WORM). حکومت کی طرف سے علاج کا انتظام بلانے نام ہے جو لوگ امراض میں مبتلا ہوں اور جن کے علاج کا کوئی بندوبست نہ ہو ایسے لوگوں سے کھیتی اور دوسرے کاروبار میں اعلیٰ معیار کارکردگی کی توقع کرنا فضول ہے۔

جہالت کا مسئلہ دیہاتوں کی ترقی کی اگر کوئی اُمید کی جا سکتی ہے تو وہ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہے لیکن یہ بیان کرتے وقت افسوس ہوتا ہے کہ صرف ۰ فی صدی آبادی پڑھنا اور لکھنا جانتی ہے۔ لارڈ مکالے کو تعلیم کے بارے میں اپنا مشہور مراسلہ لکھے ہوئے اور کمپنی کو ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا وعدہ کئے ہوئے سو سال گذر گئے ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ پر نظر ڈالئے تو وہاں کم و بیش ۵۰ سال کے عرصے میں ۹۰ فیصدی حبشیوں میں تعلیم پھیلا دی گئی ہے اور جاپان نے ۵۰ سال کی مدت میں اپنی پوری آبادی کو تعلیم یافتہ بنا دیا ہے لیکن ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ سو سال میں حکومت زیادہ سے زیادہ ۰ فیصدی لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں کامیاب ہوئی ہے

لیکن جب حکومت کی نصف سے زیادہ آمدنی فوج پر خرچ کر دی جائے اور جو باقی بچے اس میں سے بڑا حصہ مختلف سروسوں کے عہدہ داروں کو نذر کر دیا جائے تو اس سے زیادہ تعلیم کی توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے۔ ہر صوبے میں جبری تعلیم کا قانون پاس ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب کاغذی کارروائی ہے۔ تعلیم روپے سے پھیلتی ہے اور سرکار کے خزانے میں اس کام کے لئے روپیہ ہی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ جہالت کی وجہ سے کشمکش حیات میں کم زور ثابت ہوتے ہیں۔ اور ترقی کی تمام راہیں ان کے لئے مسدود رہتی ہیں

جب تک تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے کسانوں کو نئے طریقوں کے فائدے سے آگاہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک نہ تو کاشت کے سائنٹیفک طریقے پھیلائے جا سکتے ہیں نہ ساہوکار سے نجات دلانے کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ نہ صفائی اور حفظانِ صحت کو ترقی دی جا سکتی ہے اور نہ امراض پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ غرضیکہ کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حکومت...... سستے اور زود اثر نسخوں کی فکر میں ہے۔ چنانچہ پنجاب میں زراعتی کالج کے گریجوایٹ سرکار کے خرچ سے زمینوں پر بسائے جا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو پیداوار بڑھانے کا سبق دے سکیں۔

احاطہ بمبئی میں ایک تجویز ہے کہ ڈاکٹروں کو وظیفہ دے کر دیہات میں پریکٹس کرنے کے لئے مائل کیا جائے حکومت دیہات میں بہت سے ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے تاکہ سوویٹ روس کی طرح ریڈیو کے ذریعے تعلیم بالغان کو ترقی دے سکے۔ مگر ریڈیو کا سٹ خریدنا کسان کے بل بوتے سے باہر ہے اس لئے حکومت کو سرکاری روپے سے کسانوں کے لئے ریسیونگ سٹ فراہم کرنا ہوں گے۔

دیہات کی بےکاری

دیہات کا ایک دوسرا بڑا مسئلہ بےکاری ہے کسان کم سے کم تین مہینے ضرور بےکار رہتا ہے۔ علاوہ ازیں محنت کو پس انداز کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اور زمین کو ہزاروں ایسے بیروزگار لوگوں کی پرورش کرنا پڑتی ہے جن کی محنت سے فائدہ سال کے صرف چند مصروف دنوں میں ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس زائد آبادی کو دیہاتی صنعتوں۔ مثلاً پارچہ بافی، دری بافی، کپڑے کے کام وغیرہ میں مصروف رکھا جاسکتا تھا۔ لیکن جب سے برطانیہ اور بعد میں جاپان نے اپنا سستا مال ہندوستان کی منڈیوں کو بھیجنا شروع کیا ہے۔ تمام مقامی صنعتیں تباہ ہو گئی ہیں۔ ہندوستان میں بڑے پیمانے کی چند صنعتیں ہیں۔ مثلاً سوتی پارچہ بافی کے کارخانے، لوہے اور فولاد کے کارخانے، شکر کے کارخانے لیکن ان کا وجود محض تائیدی محاصل کی وجہ سے قائم ہے اور اُن سے دیہات کے لاکھوں بے روزگاروں کے لئے کام نہیں نکل سکتا اور چونکہ سرکاری پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کو ایک زراعتی ملک رکھا جائے چاہے زراعت میں لوگوں کے لئے نفع ہو یا نہ ہو، اس لئے صنعت کی ترقی ابھی تک ابتدائی منزل میں ہے اگر ہندوستان میں بھوکے لوگوں کے جلوس" اور روٹی یا خون" کے مظاہرے نہیں ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی غریب جاہل رعایا ابھی تک یہ نہیں جانتی کہ بےروزگاری سماج کے ظلم و ناانصافی سے پیدا ہوتی ہے۔

روپیہ کہاں جاتا ہے؟

بہرکیف صورت حال امید افزا معلوم نہیں ہوتی۔ حکومت کی بیشتر آمدنی جو کاشت کاروں اور دوسرے غریب طبقوں سے وصول کی جاتی ہے وہ ان بڑے عہدہ داروں کی تنخواہوں پر صرف کر دی جاتی ہے جو ملک میں امن و امان اور اس سے تھوڑا کچھ زائد قائم رکھنے کے لئے مامور ہیں۔ مثال کے طور پر صوبہ آسام میں جس کی آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ زراعت پیشہ ہے حکومت کے کل مصارف

میں سے صرف ایک فیصدی زراعت کے محکمے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے دستور کے نفاذ کے بعد سے کروڑوں روپیہ مجالس قانون ساز کے اراکین اور ان عہدہ داروں کی تنخواہوں پر صرف ہوگا۔ جو نئے سیاسی کاموں کو نپٹانے کے لئے ملازم رکھے جائیں گے۔ لیکن لوگوں کی معاشی حالت میں وہ ترقی نظر نہیں آتی جس کے محاصل سے زائد خرچ کو پورا کیا جاسکے گا۔ ہندوستان کا توازن تجارت پہلے تقریباً ہمیشہ موافق رہا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ ناموافق ہوگیا ہے۔ اگر گزشتہ پانچ سالوں میں ہندوستان سے سونا برآمد کیا جاتا تو ہندوستان میں سخت مالی دشواریاں پیدا ہوجاتیں۔ ۱۹۳۱ء میں برطانیہ نے معیار طلائی ترک کیا تھا۔ اس وقت سے اکتوبر ۱۹۳۶ء تک ہندوستان سے ۲ ارب ۸۶ کروڑ ۸۶ لاکھ ۲۰ ہزار ۹۱۰ روپے کا سونا برآمد کیا گیا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ہندوستان کی عورتیں اپنا زیور بیچ بیچ کر اپنے شوہروں کا قرض ادا کررہی ہیں۔

ہندوستان کا کسان سینکڑوں سالوں کی برائیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سے اپنی موجودہ مشکلات میں مبتلا ہے اور برسر اقتدار طبقے جو بوجھ اس پر لادتے رہے ہیں۔ انھیں اب تک وہ کسی نہ کسی طرح برداشت کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن بوجھ اٹھانے کی ایک حد ہوتی ہے اور غالباً اب وہ زمانہ دور نہیں ہے جب کسان اپنا یہ سارا بوجھ اتار کر پھینک دے گا۔

ہندوستان میں مزدور تحریک

"ابتدائی قانونی کوششیں"

(۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۱ء تک)

دیسی صنعتوں کا زوال ۱۸۵۷ء کے مشہور غدر نے جہاں برطانوی حکومت کی متزلزل دیواروں کو پایۂ استحکام تک پہنچایا وہاں ہندوستان کی قدیم دستکاریوں کے ساتھ بھی جو احسان کیا وہ تاابد فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ غدر سے سو سال قبل کا زمانہ ہندوستان کی دستکاریوں اور صنعتوں کے لحاظ سے بہترین دور کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں دیسی سامان تجارت نہ صرف مغربی یورپ بلکہ بلقان، عراق اور چین تک روانہ کیا جاتا تھا[۹۱] سوتی کپڑوں میں ڈھاکے کا ململ اب تک یادگار ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں اس کا ذکر فخر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اونی کپڑوں کا کاروبار بھی زمانہ کے لحاظ سے حد عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں میں قرب وجوار کے دیگر ممالک کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی تھی۔ اس صنعت کا وجود درحقیقت زمانۂ لامعلوم سے بتایا جاتا ہے لیکن مسلمان بادشاہوں کا دور خصوصاً اکبر کا عہد حکومت اس کی ترقی کے لئے حیرت انگیز ثابت ہوا[۹۲]۔ اس صنعت کی یادگار اونی شالیں، قالین اور کمبل اب بھی اپنی جگہ مایۂ ناز تصور کئے جاتے ہیں[۹۳]۔

---

[۹۱] بین الاقوامی تجارت کا دستور ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔ اور اس کا وجود رگ وید کے زمانے سے بتایا جاتا ہے۔

[۹۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۸ "ہندوستان اکبر کی موت کے وقت" از مورلینڈ

[۹۳] قالینوں کے لئے آگرہ، جونپور اور مرزاپور۔ شالوں اور گرم کپڑوں کے لئے لاہور، لودھیانہ اور کشمیر (صفحات ۱۹۸ تا ۲۰۸ "ہندوستانی صنعت وحرفت کا فروغ" از لوکس وردیولال کر۔

اسی طرح ریشمی کپڑوں کا کاروبار بھی ہندوستان کی مخصوص صنعتوں میں تھا اور سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کے ساتھ تجارت نے اس کی اہمیت کو چار چاند لگا دیے تھے' اول اول یہ صنعت گجرات اور بنگال تک محدود رہی مگر ٹیپو سلطان کے زمانے میں بڑھتے بڑھتے میسور تک جا پہنچی۔[۹] اس کے علاوہ صنعت لطیف میں معماری۔ مصوری اور نقاشی وغیرہ کو جو درجہ دورِ مغلیہ میں حاصل ہو چکا تھا۔ اس کی زندہ مثالیں اس قدر ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔

ملوں اور فیکٹریوں کی ابتدا لیکن غدر نے جو انقلاب عظیم برپا کیا وہ ان تمام صنعتوں کے لئے موت کا پیغام تھا۔ کاروبار مٹ گئے۔ کاروباری فرقے نیست و نابود ہو گئے۔ اور صنعتی خاندانوں کا عروج پستی کے عمیق غاروں میں دفن ہو گیا غرض کہ دیسی صنعتوں کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہا۔ مانچسٹر اور لنکا شائر کا دور دورہ ہوا۔ سوتی اونی اور ریشمی ہر قسم کے کپڑے برطانیہ سے آکر فروخت ہونے لگے۔ اور بھولے بھالے ہندوستانی جلد ہی بھول گئے کہ ان کا ملک خود بھی کبھی انہی صنعتوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ اس طرح ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک ہندوستانی کپڑوں کا بازار پوری طرح برطانوی تجار کے ہاتھ میں رہا۔

اس کامیابی نے دیسی پیشہ وروں کو ولائتی مشینیں اور پرزے ہندوستان میں لانے اور سوتی کپڑوں کے کارخانے قائم کرنے کی ہمت دلائی۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک اصولوں پر کاربند ہونے والی پہلی فیکٹری بمبئی میں قائم ہوئی۔ اس طریقہ پیداوار نے ہندوستان میں تجارت کی ایک نئی راہ کھولی۔ اور ملکی ملوں کے تیار کردہ کپڑوں کا خیر مقدم دیہات دیہات اور گھر گھر ہوا۔ انکی مقبولیت اس قدر عام ہوئی کہ دن بدن نت نئے کارخانوں کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ اور ۱۸۷۴ء میں بمبئی کے شہری علاقہ میں ملوں کی تعداد ۲۸ اور پریسیڈنسی میں ۸ تھی۔ ان ملوں نے ایک طرف تو موٹے موٹے سوتی کپڑوں کی درآمد کو بالکل بند کر دیا اور دوسری طرف اپنا حلقہ تجارت روس، امریکہ اور

۹؎ "ریشم کی صنعت و تجارت" از آر۔ سی۔ رائے

چین تک وسیع کر لیا۔

ہندوستانی فیکٹریوں کے خلاف برطانیہ میں یورش

دیسی ملوں کی یہ ترقی برطانوی کاروبار کے لئے جس قدر خطرناک تھی اظہر من الشمس ہے کیونکہ دراصل ہندوستان میں مغربی سلطنت کی بنیاد شہنشاہی اور حکومت پر نہ تھی بلکہ تجارت پر تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے پہلے پہل عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی خود بھی بادشاہوں اور سپاہیوں کے کسی فرقے سے تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ بلفظ برطانوی تجارتی ایک کمپنی تھی جس کو قضاء قدر نے مال تجارت کے عوض میں نہ صرف دولت بلکہ تخت و تاج بھی عطا کر دیئے تھے۔ برطانوی حکومت کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ہندوستان کو یورپ اور خصوصاً برطانیہ کے تیار کردہ مال تجارت کے لئے ایک زبردست منڈی بنائیں۔ یہاں کے لوگوں کی ضروریات میں اضافہ کریں مگر اس طرح کہ ان کے پورا کرنے کے لئے برطانیہ کی مدد درکار ہو۔ یہاں کی خام پیداواروں کو ترقی دیں مگر اس لئے کہ وہ یہاں نہ استعمال ہو سکیں بلکہ انگلستان کی ملیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ایسی صورت میں یہاں کی صنعتی اور تجارتی ترقی اطمینان کی نظر سے کیوں کر دیکھی جا سکتی تھی؟ ہندوستان کا وسیع بازار لوں ہاتھ سے نکلتے کون دیکھ سکتا تھا؟۔ خصوصاً اس وقت جو تجارتی خسارہ لنکا شائر کو اٹھانا پڑا اس نے برطانوی ممالک میں ایک خوفناک ہنگامے کی بنا ڈالی۔ پارلیمنٹ اور حکومت ہند کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ ہندوستانی مزدوروں کے اوقات کار کو محدود کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو قانونی تحفظ میں لانے کی درخواست کی گئی' ہفتے وار تعطیلوں کے تعین کو ضروری قرار دیا گیا[۵۹]۔ مختصر یہ کہ ایسا فیکٹری قانون دستی کرانے کی کوشش ہونے لگی جو دیسی کپڑوں کی قیمتوں میں خاطر خواہ اضافے کا سبب ہو اور دور

---

[۵۹] بمبئی کی ملوں کے حالات پر میجر مور کی رپورٹ میں تحریر ہے کہ "بمبئی کی ملیں عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد سے کام لیتی ہیں جس کی وجہ سے مزدوری کا نرخ بہت گر گیا ہے۔ اس کے علاوہ کام کے اوقات بہت طویل ہیں اور مزدوروں کی صحت و آرام کا کوئی انتظام نہیں ہے نہ ہفتے وار تعطیلوں کا کوئی دستور ہے۔

دراز لنکا شائر سے آنے والے مال کو تجارتی مقابلے سے محفوظ رکھے۔ ان مطالبات کی تائید میں اکتوبر ۱۸۷۴ء میں الگزنڈر گریو [۹] نے اپنی ششماہی رپورٹ میں تحریر کیا کہ:-

"اس (سوتی) کاروبار کے ساتھ ترقی کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس لئے جبکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ اس ملک (برطانیہ) کو فیکٹری قوانین نے گراں قدر فوائد پہنچائے ہیں تو کیا یہ امید کرنا بیجا ہوگا کہ ہندوستانی مزدوروں کو ان مصائب سے جو برطانوی مزدوروں کو زمانہ گذشتہ میں برداشت کرنا پڑے تھے محفوظ رکھا جائے۔ اور ان کو موقع دیا جائے کہ اوقات کار کی کمی، مہلت کی زیادتی، کھانے پینے کے بہتر انتظام اور چھوٹے بچوں کے تحفظ کے قوانین سے فائدہ اُٹھائیں"

لنکا شائر کے مطالبات | ۱۸۷۵ء میں مسٹر ہوس نے "ہندوستانی ملوں کی ترقی" کے عنوان سے ایک مقالہ لندن سوسائٹی آف آرٹس روم میں پڑھا۔ اس میں دیسی ملوں کی روزافزوں ترقی کے ان تمام اثرات پر بحث کی گئی تھی جو لنکا شائر پر پڑنے والے تھے اور دکھلایا گیا تھا کہ "اگر ہندستان کی ملیں اسی رفتار سے ترقی کرتی رہیں تو جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ نہ صرف دیسی منڈیاں بلکہ برطانوی بازار بھی ہندوستان ہی کے تیار شدہ کپڑوں سے پٹے ہوئے نظر آئیں گے"۔ اس مقالے نے لنکا شائر کے مزدوروں میں شدید ہیجان پیدا کیا۔ رشک کی خوابیدہ چنگاریاں بھڑکنے والے شعلوں کی طرح نمودار ہونے لگیں۔ اور لنکا شائر کے کونے کونے سے برطانوی مزدوروں والے قوانین کو ہندوستان میں نافذ کرانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

دوسری جانب محصولات کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور یہ دکھلایا گیا کہ ۵ فیصدی (قیمت پر) محصول درآمد کو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے وصول کئے جاتے تھے بڑھا کر دس فیصدی کر دینا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ لنکا شائر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

---

[۹] یہ ایک برطانوی فیکٹری انسپکٹر تھے۔

..دیسی کاروبار کو کھلم کھلا اعانت پہنچائی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں محصولات درآمد کی آہنی دیواریں نہ پاش پاش نہ کردینا برطانوی حب الوطنی کے خلاف تھا۔ اس لئے مجلس قانون ساز و دیگر اراکین سلطنت برطانیہ سے اپیل کی گئی کہ دیسی منڈیوں کو محصولات سے آزاد کرکے برطانیہ اور ہندوستان کو یکساں طور پر مقابلہ کا موقع دیا جائے[۹۱]

اس ہنگامے نے ۱۸۷۵ء میں وزیر ہند لارڈ سالسبری اور وائسرائے ہند لارڈ نارتھبروک کی توجہ نکاشائر کے حقوق کی طرف مبذول کی اور انھیں ہندوستان میں مزدور قوانین نافذ کرانے کی تیاریاں شروع کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اسی سال ہندوستان کی مجلس محاصل نے اختلاف عام کو ٹھکراتے ہوئے اور گذشتہ مجلس محاصل کی سفارشات کو رد کرتے ہوئے محصول درآمد کی مقدار میں تخفیف کی تجویز کی جو فوراً عمل میں لائی گئی[۹۲]

تحقیقاتی کمیٹی | ابھی محاصل کا مسئلہ پوری طرح طے بھی نہ ہو سکا تھا اور برطانوی کاروبار میں دلچسپیاں رکھنے والے دیسی منڈیوں کی مکمل آزادی کا مطالبہ کر ہی رہے تھے کہ وائسرائے ہند کے ایما سے حکومت بمبئی نے مزدوروں کے حالات کی جانچ کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ اور حسب ذیل معاملات کے متعلق ان کی رائے طلب کی:-

(۱) مشینوں کے خطرات اور ان سے تحفظ کی تدابیر
(۲) فیکٹری میں کام کرنے والے بچوں کی عمر کا تعین
(۳) اوقات کار کے حدود

---

۹۱ اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ ہندوستانی کارخانے ابھی ابتدائی دور میں تھے۔ اور ان کی ترقی کے لئے بیرونی مقابلے کو روکنے کی سخت ضرورت تھی۔

۹۲ تجویز ۵ر اگست ۱۸۷۴ء کی ایک نئی محصولی کمیٹی کے ذریعہ کرائی گئی تھی جس نے گذشتہ کمیٹی کی تجویز کی جو محصول درآمد کی موافقت میں تھی تردید کی۔

(۴) تعطیلات

(۵) صفائی و حفظان صحت

(۶) پیشہ وروں کے بچوں کی تعلیم

(۷) فیکٹری قوانین کی ضرورت

کاروباری حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے جو تجاویز اس کمیٹی نے پیش کیں وہ لنکاشائر کی امیدوں کے خلاف تھیں۔ اگرچہ انھیں یہ تسلیم تھا کہ بمبئی کے کارخانوں میں اوقات کار طویل ہیں وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سوتی کاروبار کے اس ابتدائی دور میں جس سے ہندوستان گذر رہا تھا مزدور قوانین کا نفاذ غیر ضروری تھا۔ اور ملوں کی مجموعی حالت ایسی ابتر نہ تھی کہ انکی درستگی کے لئے قانونی حربے کی ضرورت ہو۔ عورتوں اور بچوں کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ جس "قدرتی حالات" کے تحت وہ کام کرنے کے عادی ہیں وہ ان کے لئے مہیا ہیں۔ اور ان پر کسی قسم کی سختی یا زیادتی نہیں کی جاتی۔ برخلاف اس کے اگر قانونی پابندیاں عائد کرکے ان کی اجرتوں کو کم کر دیا گیا یا ان کی ایک بڑی تعداد کو برخاست کر دیا گیا تو یقیناً انھیں ایسا شدید نقصان پہنچے گا کہ جس کو سکون کے ساتھ برداشت کرنا ناممکن ہوگا۔[1]

لنکاشائر اور ہندوستان | ہندوستانی مزدوروں میں بیداری کا فقدان اور ان کے حالات کو سدھارنے کا بیرونی اصرار۔ لنکاشائر کی چیخ پکار۔ مانچسٹر کا شور وغل کتنے ہی عجیب وغریب واقعات کیوں نہ ہوں ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایسا کیوں تھا۔ اس کے متعلق ماہرین مزدور تحریک میں اختلاف ہے۔ عام پبلک اور کثیر التعداد اہل قلم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ برطانوی یورش درحقیقت ہندوستانی مفاد کے لئے نہ تھی بلکہ یہاں کے تیار کردہ سوتی کپڑوں کے مقابلہ کو روکنے کی

---

[1] ہندوستانی مزدوروں کی بے سروسامانی اور زراعتی کاروبار کی بے بضاعتی کو جس کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی تھی مدنظر رکھتے ہوئے بمبئی تحقیقاتی کمیٹی کا نظریہ صداقت سے خالی نہ تھا۔

...دہ بہرحال بھی۔ مندرجہ ذیل بحث میں ہم دیکھیں گے کہ برطانوی لیڈروں اور لنکا شائر کے خیرخواہوں نے ...بھی اس مقصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ اور اپنے اپنے حلقوں کے اراکین ...ان عامہ پر اپنے خیالات کا کھلے الفاظ میں اظہار کیا تھا پھر بھی کچھ تعداد ایسے مصنفین کی موجود ہے جو برطانوی تحریک کو نیک نیتی، اخلاص اور سخاوت پر محمول کرتی ہے۔

ایک نظریہ | اس سلسلہ میں ڈاکٹر احمد مختار نے جس نظریے کو پیش کیا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب[۵۱] "ہندوستان میں فیکٹری سسٹم" کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ "ہندوستان کی فیکٹریوں میں خرابیاں اور بےعنوانیاں غایت درجے تک پہنچ چکی تھیں اس لئے غدار...س (برطانوی فرقے) فوراً اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے کمربستہ ہوگئے اور انھوں نے ہندوستانی مزدوروں کو قانونی تحفظ میں لانے کی کوششیں شروع کردیں" آگے چل کر انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لنکا شائر کی ہندوستانی دلچسپی میں خود غرضی کا شائبہ ہونا اس وجہ سے بھی ناممکن تھا کہ وہاں کا کاروبار ویسی کاروبار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی پا چکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ 'مزدوری حالات' کی اہمیت کو وہ پوری طرح محسوس کرنے لگے تھے"۔ ایسی حالت میں ان کا یہ خیال ہے کہ مسٹر ایڈگر یو۔ میجر مور۔ مسٹر ہیلزڈ اور اخبار لندن ٹائمس کے نامہ نگار ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ محض جذبہ سخاوت کی بنا پر ہمدردی کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ لنکا شائر کی عرضداشتیں بھی بدنیتی پر محمول نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ ہندوستانی مزدوروں کے بہی خواہ لیڈر سہراب جی شاپور جی بنگالی خود بھی انہی کا دست اعانت طلب کر رہے تھے۔

ہندوستان میں مزدور قوانین کے مسائل پر الگزنڈر گریو اور مسٹر ہوس کے نظریے ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اس موقع پر چند اور اقتباسات پیش کر دئے جائیں جو برطانوی اہل الرائے اور اہل قلم کی تقاریر اور بیانات سے لئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ناظرین خود فیصلہ

---

[۵۱] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵ تا ۴۱

کر سکیں گے کہ برطانیہ کی تحریک میں صداقت اور سخاوت کا جذبہ کہاں تک موجود تھا۔

جولائی ۱۸۷۵ء میں مسٹر انڈرسن نے پارلیمنٹ کے ایوان عام میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں مزدور قوانین کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان سے صاف ظاہر ہے کہ طرزی پورش جذبہ حسد و رشک سے لبریز تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ہم کو یہ امر فراموش نہ کر دینا چاہیئے کہ ہندوستان میں خام پیداوار کا کثیر ذخیرہ موجود ہے اور مزدوری کا نرخ کم ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم وہاں کے مزدوروں کو ۱۲ یا ۱۷ گھنٹے روزانہ کام کرنے سے باز نہ رکھیں گے تو ہم ان کو اپنے ہی ملک کے کاروباریوں کے مقابلہ میں بے جا فائدہ اٹھانے کا موقع دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی پیداوار کی قیمت ہماری پیداوار کی قیمت سے نسبتاً کم ہوگی اور ممکن ہے کہ ان کے کپڑے ہمارے ہی بازاروں میں آ کر مانچسٹر کے مقابلہ میں ارزاں فروخت ہونے لگیں۔"

اسی خیال کا اظہار آئندہ چل کر لارڈ شیفٹس بری (Shefts Bu ry) نے بھی دارالامرا میں کیا ہے جس کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

لیکن سب سے زیادہ واضح اور صاف وہ تقریر ہے جو ۲۰ فروری ۱۸۷۷ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے نقل کرتے ہوئے چند جملے واقعات حال پر پوری روشنی ڈالیں گے۔ وہ یہ ہیں:۔

"اگر یہ (ہندوستانی) پیشہ ور اسی طرح ترقی کرتے رہے تو اندیشہ ہے کہ

لے بلمے (Bleme y) کمیشن کی رپورٹ کے لحاظ سے جو ۲۶ مارچ ۱۸۷۵ء کو مقرر ہوا تھا ملوں کے اوقات کار گرمیوں میں ۱۲½ گھنٹے روز اور جاڑوں میں ۱۰½ گھنٹے روز تھے اس کی رو سے مسٹر انڈرسن کا مندرجہ بالا الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تمام تجارت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لئے اس وقت
ہمارا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اس نوخیز پودے کو جڑ پکڑنے سے
قبل ہی اکھاڑ کر پھینک دیا جائے"۔

اس کے علاوہ میجر مور، مسٹر جان کرافٹ اور دیگر برطانوی مشاہیر کے بیانات موجود ہیں جو کھلم کھلا برطانوی مفاد کی طرف مائل ہیں اور اس کا اعلان فخر کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جائے کہ مزدور قوانین کی برطانوی تحریک خلوص اور نیک نیتی پر مبنی تھی اور اس میں سراسر ہندوستانی مزدوروں ہی کا فائدہ مدنظر تھا۔

دوسرا ثبوت برطانیہ کی نیک نیتی کا یہ دیا جاتا ہے کہ کاروباری لحاظ سے جو ترقی لنکاشائر کو حاصل ہو چکی تھی وہ ہندوستان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی اس لئے دیسی ملوں کی ترقی کا برطانیہ کو خائف کر دینا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں ملوں کی ابتدا ہوتے ہی موٹے سوتی کپڑوں کی درآمد بالکل بند ہو گئی تھی۔ اور برطانوی کپڑوں کے فروخت میں بھی تقریباً ۲۰ لاکھ پونڈ سالانہ کی کمی ہو گئی تھی۔ نقشہ مندرجہ ذیل ملاحظہ ہو۔

نقشہ درآمد

سال	برطانوی سوتی کپڑوں کی درآمد (دس لاکھ پونڈ میں)
۷۱ — ۱۸۷۰	۱۹ ر ۰۵
۷۲ — ۱۸۷۱	۱۷ ر ۴۹
۷۳ — ۱۸۷۲	۱۷ ر ۲۳
۷۴ — ۱۸۷۳	۱۷ ر ۷۸

اور اگر اس تجارت کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی سوتی تجارت سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ

لنکا شائر کے سوتی مال کی درآمد میں جو دیسی منڈیوں میں آکر فروخت ہوتے تھے تقریباً ۵ فیصدی کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانوی ملیں اب بھی ہندوستان کی ملوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن پھر بھی دیسی بازاروں میں وہاں کی تیار کردہ چیزوں کی مانگ کیوں کم ہوتی جارہی ہے؟ کیا یہ کمی برطانیہ کے مفاد کے لئے خطرناک نہیں ہے؟ کیا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لنکا شائر اور مانچسٹر کے تجار ہر ممکن کوشش کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے؟ - پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ ترقی یافتہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ان کا برتاؤ ہمارے ساتھ ہمیشہ خلوص اور سخاوت ہی کا ہوگا اگرچہ ہماری ذات سے انھیں کتنا ہی بڑا تجارتی خسارہ کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

(۲) مسٹر سہراب جی شاپور جی بنگالی کے اس خط کا معاملہ جس میں انھوں نے جان کرافٹ (مانچسٹر) کو لکھا تھا کہ[۵] .... "کہ اب میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ برطانوی اثرات سے کام لے کر دیکھوں۔ کیونکہ یہ اثرات ہمارے حکام کے لئے ایسے ناگریز ہیں کہ ان کی زد سے بچنا بہت مشکل ہے" اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ مسٹر بنگالی ان تمام برطانوی حکام سے جو ہندوستانی حکومت کے نظم و نسق کے مالک تھے غیر مطمئن تھے - اور وہ اپنی مسلسل کوششوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ برطانوی مفاد کو ہاتھ میں لے کر اگر برطانیہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے گی تو شاید کام چل سکے۔

لیکن سہراب جی کا یہ خط اور وہ کوششیں جو انھوں نے مزدور سدھار کے لئے برطانیہ میں کیں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ برطانوی تحریک ہندوستان کے بہبود کے لئے تھی اور اس میں ذاتی اغراض شامل نہ تھے۔ درحقیقت لنکا شائر اور مانچسٹر سے مدد طلب کرتے ہوئے ان کا یہ گمان ہرگز نہ تھا کہ وہ ایک مخلص دوست کی طرف دست اعانت دراز کر رہے تھے بلکہ وہ صرف اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو اس وقت انھیں حاصل تھا۔ علاوہ بریں اگر شاپور جی کو

---

[۵] منقولہ از ڈاکٹر احمد مختار "ہندوستان میں فیکٹری لیبر"

برطانوی ہی خواہوں پر اعتماد ہوتا تو اس امداد کے بدلے میں جو ان کو مان چسٹر سے ملنے کی اُمید تھی وہ خود بھی ہندوستان میں محاصل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے۔

اس زمانے کی مزدوری کیفیت اس سلسلہ میں یہ بھی فراموش نہ کر دینا چاہیئے کہ ۱۸۷۶ء میں جب ہندوستان کی فیکٹریوں کے لئے قانون سازی کے مطالبات لنکاشائر اور مان چسٹر میں در پیش تھے تو دیسی ملوں کی تعداد علاقہ بمبئی میں ۳۶[1] سے زیادہ نہ تھی اور ان کی عمر بھی صرف ۱۰ سال کی تھی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دیہاتی اور خانگی کاروبار کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ مزدوروں اور پیشہ وروں کی ایک بڑی تعداد فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا تھی۔ زراعتی کاروبار کے خسارے کی تھوڑی بہت تلافی انہی ملوں کے ذریعے سے ہو جاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ملوں میں ملازمتیں تلاش کرنے والے مزدوروں کی تعداد کثیر تھی اور اسامیاں نسبتاً قلیل۔ ایسی صورت میں خصوصاً جبکہ ملوں کی تعداد بڑھانے یا سوتی کپڑوں کے کاروبار کی توسیع کی تدابیر پیش نظر نہیں تھیں (برطانوی) فیکٹری قوانین کے نفاذ کا مطلب بیکاری کو بڑھانا یا اجرت کے نرخ میں کمی کر دینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

کیا برطانوی مزدوروں والے قوانین ہندوستان کے لئے موزوں تھے ؟ ان حالات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی مزدوروں والے قوانین اور محاصل درآمد سے آزادی ہندوستان کے لئے کہاں تک مفید تھی ؟ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے مزدور غیر مکلف اور آزاد دیہاتی زندگی کے عادی تھے ان کے اخراجات نسبتاً قلیل اور ضروریات کی تعداد مختصر تھی۔ انھوں نے فیکٹری کی ملازمتوں کو صرف اوقات گذاری اور زراعت کی کمی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ دیہات اور دیہاتی کاروبار سے جو قدرتی لگاؤ انھیں تھا اس کی گرمی ان کے دلوں میں اب بھی باقی تھی اور وہ اپنی فرصت کے اوقات اب بھی دیہاتوں ہی میں بسر کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر ان میں کاروباری بیداری اور حقوق کی پاسداری موجود نہ تھی تو حیرت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ وہ موقع تھا

---

[1] اس وقت سوتی کپڑوں کی ملوں کی تعداد ۳۶۵ ہے (صفحہ ۶۳۶ انڈین ایربک ۲۷-۱۹۲۶ء)۔

جبکہ حکومت ہند کو برطانوی مفاد سے الگ ہو کر ایسی ہمدردانہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت تھی جو ایسی تجارت و کاروبار کو محفوظ رکھتے ہوئے غریب مزدوروں کی ملازمتیں قائم رکھنے، ان کی اجرت میں اضافہ کرنے اور صحت و دیگر آسائشیں فراہم کرنے کے ذرائع پر روشنی ڈالتی۔ نہ کہ برطانوی ساہوکاروں سے مرعوب ہو کر انہی قوانین کے نافذ کرانے کی تجویز کرتی جو ایک پختہ کار طریقۂ پیداوار کے لئے موزوں تھے۔

علاوہ بریں اس وقت ہندوستان ایک خاص معاشی دور سے گذر رہا تھا۔ فیکٹری پیداوار کی ابھی ابتدا تھی۔ دیہاتی اثرات ابھی زائل نہ ہوئے تھے۔ کاروباری نفع نقصان کا ابھی تجربہ نہ ہوا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ بیرونی مقابلے کو جو سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا روک دیا جاتا اور ہندوستان کی شیر خوار تجارت کو لنکا شائر اور مانچسٹر کی دست برد سے محفوظ رکھا جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا کیونکہ برطانوی سخاوت اور خدا ترسی کا جذبہ صرف اس حد تک عمل پیرا تھا جہاں تک کہ برطانوی مفاد پر آنچ آنے کا خدشہ تھا۔ اس کی زد سے بچنے کے لئے فیکٹری قوانین کا نفاذ ضروری تھا۔ اس میں اس سے بحث نہیں کہ وہ ہندوستانی فضا کے لئے مناسب تھے یا غیر مناسب۔ اسی زمانہ میں جب محصول درآمد کو بالکل اٹھا لینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ہندوستانی مزدوروں کے برطانوی خیر خواہوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں ملتا۔ اور سب کے سب ہم آہنگ ہو کر محاصل کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

محاصل درآمد اور مزدور قوانین | بعض مصنفین[۵۱] کا خیال ہے کہ "سوتی کپڑوں کے محاصل اور مزدور سدھار کے مطالبات دو مختلف مسئلے ہیں جن کو ملا دینا ایسی غلطی تھی جس سے زمانہ ماضی کے ماہرین معاشیات بھی نہ بچ سکے۔ لیکن اس کا سبب صرف وہ بدگمانی تھی جو ان کے دلوں میں برطانیہ کے خلاف سرایت کر چکی تھی" درحقیقت محاصل کو مزدوری سے جدا کرنا ناممکن ہے خصوصاً جبکہ ہندوستانی کپڑوں کی تجارت اور پیداوار پر دونوں کا اثر یکساں پڑنے والا ہو۔ کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ ہندوستانی فیکٹریاں

---

۵۱ ڈاکٹر احمد مختار "ہندوستان میں فیکٹری لیبر"

بے ابتدائی دور میں ایک گونہ تحفظ کی مستحق تھیں ؟ ۔ اور تحفظ کی سوائے اس کے کیا صورت ہو سکتی تھی نہ بیرونی مقابلے کی روک تھام کی جاتی ؟ مگر یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ سوتی کاروبار کے عہد طفلی سے لے کر اس زمانہ تک کبھی تامینی محصولات عائد نہیں کئے گئے[۵۱] پھر مانچسٹر سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ ہندوستان کی منڈیوں میں تجارتی آزادی نصیب نہیں ۔ اور محاصل کی دیوار اصول تجارت کے بالکل منافی ہے ۔ اس لئے جہاں ایک طرف یہ کوشش کی جارہی تھی کہ مزدوری قوانین جاری کرائے جائیں وہاں دوسری طرف یہ شور ہو رہا تھا کہ محصولات بھی اٹھادئے جائیں ۔ دونو تحریکوں کا مطلب ایک ہی تھا یعنی مقابلہ کی طاقت کو کچل دینا ۔

کیا برطانیہ اور ہندوستان کا مقابلہ غیر معاشی تھا ؟ | اکثر برطانوی مصنفین اور مشاہیر کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ محصولات درآمد کی موجودگی میں برطانیہ کو صحیح معاشی مقابلہ کا موقع حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں مانچسٹر کی مجلس تجارت نے جو عرضداشت وزیر ہند کے سامنے پیش کی تھی یہ دکھلایا تھا کہ :-

ا[۵۲] وضع محصولات کا جو طریقہ ہندوستان میں رائج ہے اس سے سوتی کپڑوں کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے ۔

ب یہ محاصل سوت ، اور موٹے اور کم قیمت کپڑوں کی تجارت کے بالکل منافی ہیں ۔

ج ان کا مقصد امریکہ اور مصر سے روئی خرید کر ہندوستان ہی میں بہتر کپڑوں کا تیار کرنا ہے جس سے صریحاً برطانیہ کو نقصان پہنچنے کی امید ہے ۔

---

۵۱ انہی مسئلہ کو آنریبل ڈبلو ۔ اسٹروکس نے اپنے اختلافی نوٹ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۸۷۹ء میں (جس کا تعلق ابتدائی زمانہ سوتی کاروبار سے ہے) تصریح کے ساتھ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ "سوتی سامان کی موجودہ محاصل کے متعلق یہ شکایت سوائے مانچسٹر کے اور کسی کو نہیں ہے کہ یہ تامینی ہیں " اس کے علاوہ لارڈ نارتھ بروک نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ محاصل تامینی نہ تھے (صفحہ ۲۰۴ ۔ ان ۔ جے ۔ شاہ)

۵۲ تاریخ محاصل از این ۔ جے ۔ شاہ صفحہ ۱۹۸

اور (۵) ان کا سب سے زیادہ مفر اثر بیرونی سامان تجارت کی قیمتوں میں اضافہ کرکے دیسی کاروبار کو فروغ دینا ہے۔

ان الزامات کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستانی محصولات درآمد تجارت کے لحاظ سے غیر معاشی ہیں۔ لیکن اس خصوصی ماحول کے ماتحت جس میں دیسی کارخانے مصروف کار تھے مندرجہ بالا الزامات بعید از قیاس ہیں۔ابھی یہ کاروبار ترقی کے اس زینے پر پہنچے ہی نہ پائے تھے جہاں برابری کے مقابلے کا سوال پیدا ہوتا۔ ابھی تو دراصل ہندوستانی تجارت میں مقابلے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ اس کی مثال اس شیر خوار بچے کی تھی جو گھٹنیوں چلنے میں تیزی سے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہا ہو مگر اس کو سہارا دیکر کھڑا کرنے والا کوئی نہ ہو۔ رہا ۵ فیصدی کا محصول جو حقیقی بنائے مخاصمت تھا کسی حالت میں تابینی نہیں ہو سکتا۔ (حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سوتی کاروبار کا تحفظ عمل میں نہ لانا صریح ناانصافی تھی) کیونکہ تجارتی آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محاصل کو سرے سے اُڑا ہی دیا جائے۔ آخر کار ملکی نظم و نسق کے لئے بھی کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسی طرح پر مختلف مال تجارت کو آزادی مل جائے تو حکومت کا خزانہ تباہی سے ہمکنار نظر آنے لگے۔ اس کے علاوہ ۵ فی صدی محصول کی حقیر رقم کسی ملک کی تجارت کو شدید نقصان پہنچانے سے قاصر تھی۔ ان نکات کا خیال کرتے ہوئے لارڈ سالسبری نے اپنے مراسلہ جولائی ۱۸۷۵ء میں وائسرائے ہند کو لکھا کہ:-

"اگر یہ صحیح ہو کہ محصولات درآمد کا مقصد برطانوی مقابلہ سے مفر حاصل کرنا اور ملک میں عام طور پر استعمال ہونے والی اشیائے ضروری کو گراں کرنا ہے تو اس معاملہ میں کچھ بھی کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ ایسے محاصل معاشی نقطۂ نظر سے قطعی طور پر قابل اعتراض ہیں۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ان کے مقاصد[۱]

---

[۱] منقول از صفحہ ۲۰۶ "ہندوستانی محاصل کی تاریخ" از ان۔ جے شاہ۔

درحقیقت یہی ہیں ۔ پھر بھی ان کے خطرناک سیاسی اثرات سے میں غافل نہیں ہو سکتا۔"

لارڈ سالسبری کے ان جملوں کو نقل کرنے کے بعد ہندوستانی محصولات درآمد کے معاشی ہونے پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن جہاں تک سیاسی بین الاقوامی کشیدگی اور رنجش کا تعلق ہے ان محاصل کے اٹھا دینے سے ان کے اور بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ دنیا کی رحا، تی قوم ہندوستان پر نگاہ التفات رکھتی ہے اور یہاں کی وسیع منڈیوں پر حاوی ہونا چاہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر تجارتی آزادی عام کر دی جاتی تو خود برطانیہ کے لئے شدید خطرہ تھا اور اگر برطانیہ کے لئے مخصوص کی جاتی تو دیگر ممالک اور برطانیہ میں پرخاش کا اندیشہ تھا۔

برطانوی پالیسی | لیکن ان تمام خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے بالآخر حکومت ہند کو یہی رائے دی گئی کہ محاصل کی دیوار کو منہدم کر دینا ضروری ہے۔ اور اس معاملہ میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کے اختلافات کو فرو کرنے اور ملکی مالیات اور اقتصادیات کی بے دریغ قربانی کرنے کا عزم بالجزم لیکر سر جان اسٹریچی ہندوستان تشریف لائے۔ انھوں نے اپنی ؁ کی مالیاتی تقریر میں جس پالیسی کا اعلان کیا اس کے مطالعے کے بعد یہ صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت ہند کے لئے برطانوی مفاد بالاتر اور افضل تھا۔ اس تقریر کا اقتباس ذیل میں نقل ہے :-

"اکثر (حکومت ہند) کا یہ فرض بتلایا جاتا ہے کہ ہندوستانی مفاد کو کسی حالت میں نظر انداز نہ ہونے دے ۔ اگرچہ اس میں مانچسٹر کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچ رہا ہو۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس نظریے کی سختی سے مخالفت کرتا ہوں کیونکہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں صرف کرنے کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ میں برطانوی وطنیت کی فہرست سے خارج کر دیا جاؤں۔

مانچسٹر کا مفاد جسے احمق لوگ غیر ضروری اور مضحکہ خیز تصور کرتے ہیں نہ صرف ایک عظیم الشان اور ذہین قوم بلکہ لاکھوں انگریزوں کا مفاد ہے جن کا تعلق براہ راست سوتی کپڑوں کی تجارت اور ان کے کاروبار سے ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی

ندامت نہیں ہے کہ اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے بھی جو مجھ پر ہندوستان کی ہیں میں اپنے ملک کی ذمہ داریوں کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے لئے وہ بہت زیادہ اہم اور گراں بہا ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انگلستان میں میرے ہم وطنوں کو جو شکایات ہیں وہ حقیقتاً مناسب اور صحیح ہیں۔ اور انھیں صرف خیالی اذیت تصور کرنا سخت غلطی ہے .... اس لئے جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے یقین ہے کہ اگر (تجارتی آزادی کی) اس زبردست ترمیم کو عمل میں نہ لانا ہوتا تو میں اپنے موجودہ عہدے کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا۔"

ان کوششوں کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ۱۸۸۱ء میں پہلا فیکٹری قانون نافذ ہوا اور ۱۸۸۲ء میں دیسی منڈیوں کو سوتی سامان کے لئے تجارتی آزادی عطا کی گئی ان قوانین کے متعلق اس وقت یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ یہ دونوں سوتی کارخانوں کی ترقی کے منافی تھے۔ اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ہندوستان میں مزدور سدھار کی اشد ضرورت تھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کام کے لئے جو قوانین وضع کئے گئے وہ یہاں کے حالات سے بالکل مناسبت نہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فیکٹری قانون کے ماتحت مزدوروں اور کارخانوں کا مطالعہ اور معائنہ کئے بغیر محصولات درآمدبھی اٹھالئے گئے۔ اس سے نہ صرف دیسی کاروبار بلکہ کل مزدور طبقے کو جو شدید نقصان پہنچا اس کا تفصیلی بیان انشاء اللہ کسی آئندہ موقع پر پیش کیا جائے گا۔

عہدِ حاضر کا فلسفہ

(۲)

لیکن برگسان نے تصوف کو ان لوگوں کی طبیعت کے موافق بنانے کی کوشش کی ہے جو حرکت اور حیات پر ایمان رکھتے ہیں، ترقی کی واقعیت سے مطمئن ہیں، اور اپنے تحت فلکی وجود کے متعلق کسی قسم کے فریب یا التباس میں مبتلا نہیں۔ تصوف کا قائل طبعاً عملی انسان ہوتا ہے مگر ایسا عملی انسان جو جمود پر مجبور ہے۔ مادی حیاتیت کا ماننے والا طبعاً جامد ہوتا ہے۔ مگر ایسا جو اپنے میں عمل کی بے پناہ خواہش رکھتا ہے۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے دنیا میں اسی قسم کے لوگ آباد تھے ان کے مزاجوں میں شکّیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس کی وجہ سے وہ جوش اور ہیجان کے پیچھے اندھے اور غیر عقلی ایمان کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔ یہ غیر عقلی ایمان آخر میں انھیں ایک ایسے یقین کی صورت میں دستیاب ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ دوسرے انسانوں کو آپس میں کٹ مرنے پر آمادہ کرنا ان کا فریضہ ہے۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں انھیں چونکہ اس جذبے کی تسکین کا کوئی موقع حاصل نہ تھا اس لئے برگسان نے ایک بدل پیش کیا اور الحق کہ نعم البدل پیش کیا۔

برگسان بعض اوقات اپنا نظریہ ایک ایسی زبان میں پیش کرتا ہے جس سے ناظر کو سخت دھوکہ ہوتا ہے کیوں کہ جن چیزوں کو وہ فریب اور التباس سمجھتا ہے ان کا تذکرہ کبھی کبھی ایسے لفظوں میں کر گزرتا ہے جن سے پایا جاتا ہے کہ وہ حقیقی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہوں تو زمان کے متعلق اس کے نظریے کا خلاصہ یہ ہوگا۔ زمان جدا جدا لمحات یا حادثات کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی متواتر اپج اور بالیدگی ہے جس میں مستقبل کی پیش گوئی کی گنجائش نہیں کیوں کہ وہ سرتاسر نئی اور بدیں وجہ ایک بعید از قیاس چیز ہے جو چیز حقیقت میں واقع ہوتی ہے وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ مثلاً درخت بڑھتا ہے اور اس کے متوالی حلقے جوں کے توں سلامت رہتے ہیں (یہ مثال برگسان کی نہیں ہے) اس طرح دنیا روز بہ روز کامل سے کامل تر اور شاداب سے شاداب تر ہوتی جا رہی ہے۔

جو چیز واقع ہوتی ہے وہ وجدان کے حافظے میں (جو دماغ کے جبلی حافظے کا عکس ہے) عملی حالت باقی رہتی ہے اس بقا کا دوسرا نام "مرور" ہے اور نئی تخلیق کا نتیجہ "جوشِ حیات[1]" کہلاتا ہے۔ وجدان کے خاص حافظے کی صحت و ثبات کا تعلق تہذیب نفس سے ہے اور اگرچہ برگسان یہ نہیں بتاتا کہ نفس کی اس تہذیب کے لئے کون سے اعمال ضروری ہیں لیکن تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ وہ یوگیوں کی ریاضتوں سے زیادہ فرق نہیں رکھتے۔

اگر کوئی شخص برگسان کے فلسفے پر منطق جیسی بیہودہ اور بازاری چیز کے انطباق کی جرأت کرے تو اس "فلسفۂ تغیر" میں اسے بعض پیچیدگیاں اور الجھنیں نظر آئیں گی۔ برگسان ماہر ریاضیات کی مذمت اور تضحیک سے کبھی تھکتا یا چوکتا نہیں کیوں کہ اس غریب کا قصور یہ ہے کہ وہ وقت کو ایک ایسا سلسلہ سمجھتا ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ لیکن برگسان کے دعوے کے مطابق اگر دنیا میں واقعی کوئی خالص جدت ہے اور اس میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ حقیقت میں ہمیشہ باقی رہتا ہے تو کسی ابتدائی زمانہ کے موجودات کا موقت مجموعہ بعد میں آنے والے زمانہ کے مجموعہ کا لازماً ایک جزو ہوگا پس کل اور جزو کے اس علاقہ کی رو سے مختلف اوقات میں دنیا کی حالتوں کے مجموعوں سے ایک ایسا سلسلہ مرتب ہوگا جس میں وہ تمام خصوصیات پائی جائیں گی جن کی ایک ماہر ریاضیات کو ضرورت ہوتی ہے اور جنہیں برگسان دریا برد کر دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ماسوا اس کے دنیا کی پچھلی حالتوں پر جن نئے عناصر کا وقتاً فوقتاً اضافہ ہوا ہے وہ اگر پرانے عناصر سے جدا نہیں ہیں تو خالص جدت کہاں باقی رہی اور تخلیقی ارتقا رنے کیا خاک خلاقی کی۔ بہر حال برگسان فلوطینس کے نظام فلسفہ سے انچ بھر تجاوز نہیں کرتا۔ اس دشواری کو وہ ہر چند یہ کہہ کر رفع کرتا ہے کہ ہر وقوعہ ایک بالیدگی یا اپج ہے جس میں ہر چیز بدل جاتی ہے اور پھر جوں کی توں باقی رہتی ہے لیکن یہ تصور ایک چیستان سے زیادہ نہیں جسے ایک شخص جو خوش اعتقاد نہ ہو کبھی بوجھنے کی

---

[1] Elan vital کا ترجمہ ہے اور کسی اور صاحب کا کیا ہوا۔ مترجم

نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ برگسان کا خطاب یکسر صوفیانہ ایمان سے ہے عقل سے نہیں ہے اور جہاں ایمان منطق کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہاں ہم جیسے بے بال و پر برگسان کی پرواز کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اسی اثنا میں فلسفیانہ دنیا کی سطح زمین پر ایک پودا اور ایسا ابھرا جسے مختلف اور متعدد سمتوں سے سینچا اور پروان چڑھایا گیا۔ اسے عموماً "موجودیت"[۱] کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی خصوصیات صرف دو ہیں (۱) ایک اس کا اسلوب جو تحلیلی ہے اور (۲) دوسری اس کی مابعد الطبیعیت جو کثرت وجود کی قائل ہے۔ لیکن یہ فلسفہ سر تا سر موجودی نہیں کیوں بعض اعتبارات سے اس میں اور برکلے کی تصوریت میں خاصی مماثلت ہے البتہ کانٹ اور ہیگل کی تصوریت سے اسے دور کی بھی نسبت نہیں۔ اس لئے کہ یہ نظامات جس منطق پر مبنی ہیں اس کو یہ فلسفہ سختی سے رد کرتا ہے اس فلسفہ میں ہمیں اس نظریہ کو اختیار کرنے اور ترقی دینے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جو یہ بیان کرتا ہے کہ دنیا کا بنیادی مسالہ یا مورد نہ ذہنی ہے اور نہ مادّی بلکہ ان دونوں کے برخلاف ایک ایسی چیز ہے جو ذہن اور مادّہ دونوں سے زیادہ بسیط اور زیادہ اساسی ہے اور جن سے مادّے اور نفس دونوں کی ترکیب اور تشکیل عمل میں آئی ہے۔

انیسویں صدی کے قرن آخر میں جو مشاہیر بہ قید حیات تھے ان میں جیمس ہی وہ پہلا اور آخری شخص تھا جس نے المانوی تصوریت کا طبقہ الٹ دینے کی پر زور کوشش کی تبلر اور ڈیوی کو ان دنوں میں نہ کوئی جانتا تھا اور نہ مانتا تھا خود جیمس کی حالت یہ تھی کہ دنیا اسے صرف ایک نفسیات داں سمجھتی تھی جس کی فلسفے میں کوئی خاص اہمیت یا وقعت نہیں ہوا کرتی۔ لیکن ۱۹۰۰ء کے آغاز سے بالکل کایا پلٹ ہوگئی المانوی تصوریت کی مخالفت کا طوفان چاروں طرف اس شدت سے اٹھ کھڑا ہوا جس کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ ساری مخالفت صرف

۱؎ Realism کا ترجمہ ہے۔ مترجم

نتائجیت ہی کی طرف سے تھی ۔ بلکہ اس میں خالص نفسی نقطہ ہائے نظر کو بھی بہت زیادہ دخل تھا سرزمینِ المانیہ میں فرنگ کی تصانیف (جو ہر چند ۱۸۷۹ میں شائع ہوئیں مگر ابھی تھوڑے دن تک کسی نے سنجیدگی سے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا) کے علاوہ ہسرل کی کتاب "منطق پر چند خیالات" نے (جو ۱۹۰۰ء میں چھپی اور ایک یادگار تصنیف ثابت ہوئی) بہت جلد اپنے وسیع اثرات پیدا کر لئے اس کے سوا میناگ کی دو تصنیفوں یعنی "مسلمات" (مطبوعہ ۱۹۰۲) اور "نظریۂ اشیاء اور نفسیات" (مطبوعہ ۱۹۰۴ء) نے بھی اس معاملہ میں بہت اثر ڈالا ۔ انگلستان میں جی. ای مُور اور میں نے انھی کے مماثل نظریات کی وکالت شروع کی ۔ "تصدیق کی ماہیت" کے عنوان سے مور کا ایک نہایت معرکتہ الآرا مضمون ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا ۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیف "مبادی اخلاقیات" ۱۹۰۳ء میں چھپی ۔ میری پہلی کتاب "فلسفۂ لائب نز" ۱۹۰۰ء میں مطبع سے باہر آئی اور دوسری "مبادی ریاضیات" ۱۹۰۳ء میں تصنیف اور طبع ہوئی فرانس میں اسی قسم کے فلسفہ کو کوترات نے بڑی آب و تاب سے پیش کیا ۔ امریکہ میں ولیم جیمس کی "بنیادی تجربیت" کو (جس میں اس کی نتائجیت کا کوئی شائبہ نہ تھا ۔) نئی منطق میں سمو دیا گیا ۔ جس سے ایک بالکل نیا فلسفہ نمودار ہوا ۔ یہ فلسفہ نو موجودیت کہلاتا ہے اور باوجود کہ ماخ کی تصنیف "تحلیل احساسات" (مطبوعہ ۱۸۸۹ء) میں اس کے بعض اجزا موجود تھے اور وہ مذکورہ بالا یورپی تصانیف کے مقابلہ میں زماناً مؤخر تھا لیکن وہ ان سب سے بدرجہا زیادہ انقلاب انگیز ہے ۔

اس نئے فلسفہ نے اب تک کوئی قطعی صورت اختیار نہیں کی بلکہ بعض اعتبارات سے ہنوز خام اور ناکمل ہے ۔ مزید برین اس کے مختلف وکیلوں اور داعیوں میں زبردست اختلافات بھی ہیں پھر اس کے اجزار کسی قدر عسیر الفہم اور ادق بھی ہیں ۔ غرض ان تمام وجوہ کی بنا پر ہم یہاں اس کے صرف چند نمایاں پہلو پیش کر سکتے ہیں اس سے زیادہ کی نہ ہم سے امید رکھنی چاہئے اور نہ ایک مختصر مقالے میں تفصیل کی گنجائش ہوتی ہے ۔

اس نئے فلسفہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی خاص فلسفیانہ اسلوب نہیں، اور جب کوئی خاص اسلوب ہی نہیں تو پھر اس کے ذریعہ کسی خاص قسم کے علم کے حصول کا سوال ہی سرے سے بے معنی ہے۔ یہ فلسفہ سائنس اور فلسفہ دونوں کو ایک جانتا ہے اس کے نزدیک اُن میں آپس میں فرق صرف اتنا ہے کہ مخصوص علوم جزئی مسائل سے بحث کرتے ہیں اور فلسفہ ان سے زیادہ اہم اور کلی مسئلوں پر نظر ڈالتا ہے پھر ایک اور فرق ان میں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ فلسفہ ایسے فرضیات مرتب کرتا ہے جن کا تجربی استشہاد ہنوز انسانی دسترس سے بالکل باہر ہے اس فلسفہ کی نظریہ علم سراسر سائنس ہے یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ علم کی جانچ اور تصدیق سائنس کے اصولوں اور طریقوں پر ہونی چاہئیے۔ اس فلسفہ کا مقصد یہ کبھی نہیں کہ کائنات پہ مجموعی حیثیت سے بحث و تحقیق کی جائے یا کسی جامع و مانع نظام کی تشکیل عمل میں لائی جائے بلکہ اسے اپنی منطق کے بل بوتے پر اس بات کا پکا یقین ہے کہ دنیا کی سخت سخت اور بے ترتیب فطرت سے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ اُسے دنیا کے "عضوی" ہونے سے انکار ہے مگر صرف وہیں تک جہاں تک کہ اس لفظ سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اگر جزو کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو کل کا استنباط بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ان تمام باتوں کے وہ المانوی تصوریت کی غلطی کا ارتکاب اور اعادہ خاص طور پہ نہیں کرتا۔ یعنی یہ کوشش کبھی نہیں کرتا کہ علم کی ماہیت سے دنیا کی ماہیت کا استنباط عمل میں لایا جائے۔ وہ علم کو محض ایک طبیعی واقعہ سمجھتا ہے جس کی نہ کوئی صوفیانہ وقعت ہے اور نہ کوئی کونیاتی اہمیت۔

اس نئے فلسفہ کے خاص سرچشمے تین ہیں (۱) علم کا نظریہ (۲) منطق اور (۳) ریاضیات کے اصول۔ کانٹ اور اس کے بعد کے لوگ عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ علم ایک باہمی تعامل ہے جس میں معلومہ شے ہمارے علم کی بدولت کچھ بدل جاتی ہے اور بنا بریں بعض ایسے خواص ہمیشہ اپنے میں رکھتی ہے جن کو ہمارے علم سے نسبت حاصل ہے۔ اس کے سوا وہ (بہ استثنار کانٹ) یہ بھی مانتے تھے کہ جو چیز علم میں نہیں آتی اس کا وجود محال منطقی ہے۔ لہذا علم کے

ذریعہ جن خواص کا ہم ادراک کرتے ہیں وہ واقع میں ایسے ہیں جن کا ہر چیز میں پایا جانا ضروری ہے اس طرح مدار بحث امر یہ تھا کہ اگر ہم صرف علم کی شرائط ہی کا غائر نظر سے مطالعہ کریں تو حقیقی دنیا کے متعلق بہت کچھ انکشافات عمل میں لا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس نئے فلسفہ نے ایک دعویٰ تو یہ کیا کہ علم کو معلومہ اشیاء کی کوئی پروا نہیں اور دوسرا یہ کہ علم میں نہ آنے والی چیزوں کے معدوم ہونے کی کوئی معقول تو کیا نامعقول وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ ان دعووں کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کا نظریہ جواب تک کائنات کے طلسم اسرار کی لوح بنا ہوا تھا اپنی ساری اہمیت یک لخت کھو بیٹھا اور ہم کو سائنس کی محنت طلب تحقیقات کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

علیٰ ہٰذا القیاس منطق میں مالیت نے "عضوی" نظریہ کی جگہ حاصل کی۔ اب تک عام خیال یہ تھا کہ جب کوئی چیز کسی طرح متاثر ہوتی ہے تو دوسری چیزوں کی داخلی فطرت بھی اس کا اثر قبول کرتی ہے۔ کیونکہ جملہ چیزیں ایک رشتہ میں منسلک اور مربوط ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں کسی چیز کا مکمل علم حاصل ہو تو پوری کائنات کا مکمل علم بھی بخوبی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن نئی منطق نے بلند آہنگی سے یہ دعویٰ کیا کہ کسی چیز کی ذاتی ماہیت سے منطقی طور پر یہ استنباط کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس چیز کو دوسری چیزوں کے ساتھ فلاں فلاں علاقے حاصل ہیں۔ اس اجمال کو ہم ایک مثال سے واضح کئے دیتے ہیں۔ لائب نز ایک جگہ کہتا ہے (اور اس باب میں وہ جدید تصوریئین سے لفظ بہ لفظ متفق ہے) کہ اگر کوئی شخص یورپ میں ہو اور اس کی بیوی ہندوستان میں وفات پا جائے تو انتقال کے وقت اس میں ایک معنوی تغیّر پیدا ہو گا لیکن فہم عامّہ کا فتویٰ اس بارے میں یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی معنوی تغیّر پیدا نہ ہو گا جب تک کہ وہ اپنی خانہ بربادی کی خبر نہ سن لے گا۔ نئے فلسفہ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے اور اس کے نتائج اتنے دور رس ہیں کہ بادی النظر میں ہم ان کا احصار نہیں کر سکتے۔

ریاضیات کے اصولوں کو فلسفہ سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے وجہ یہ ہے کہ ریاضیات میں اعلیٰ درجہ کا یقینی بدیہی علم پایا جاتا ہے اور فلسفہ کا بڑا حصہ بدیہی علم کا دلدادہ ہے۔ ایلیائی زینو اور

اس کے بعد کے بلند تصوری فلسفی اس بات کے دل و جان سے خواہش مند رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ریاضیات کی ساکھ میں بٹہ لگائیں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے ایسے تناقضات بہت سے گھڑ لئے جن کا واحد مدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ ماہرانِ ریاضیات کی رسائی مابعد الطبیعی حقیقت تک ہرگز نہیں ہو سکتی۔ صرف فلاسفہ ہی بہتر قسم کے مابعد الطبیعی حقائق بہم پہنچا سکتے ہیں۔ کانٹ کے فلسفے میں اس قسم کے دعوے بڑی تعداد میں موجود ہیں اور ہیگل تو اس بارے میں اس سے میلوں آگے ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے دوران میں ماہرانِ ریاضیات نے کانٹ کے فلسفہ کے اس حصہ کو بڑی بے دردی سے کچلا چنانچہ لوباچیوسکی[۵۱] نے غیر اقلیدسی ہندسہ ایجاد کر کے کانٹ کی قبل تجربی حسیات کی ریاضیاتی دلیل کے پرزے اڑا دئے۔ ویرسٹراس[۵۲] نے بہ دلائل ثابت کر دیا کہ تسلسل میں اقل نا متناہی (یا اجزائے لاتجزّی) کو کوئی دخل نہیں۔ گیارگ کنٹار[۵۳] نے تسلسل اور نامتناہیت کے ایسے نظریے وضع کئے جنھوں نے فلاسفہ کے مقبول عام استعاروں کا خاتمہ کر دیا اور فریگ[۵۴] نے یہ منوا کر چھوڑا کہ حساب منطق سے حاصل ہوا ہے حالانکہ کانٹ کو اس سے انکار تھا۔ غرض کہ یہ تمام نتیجے معمولی ریاضیاتی طریقوں سے حاصل ہوئے ہیں اور بنا بریں شک و شبہ سے ویسے ہی بالاتر ہیں جیسے کہ ریاضی کے پہاڑے۔ فلسفیوں نے اس صورتِ حال پر توجہ تو کی مگر ان مصنفوں کی تحریرات کا مطالعہ گوارا نہیں کیا جن کا اوپر ذکر آیا ہے البتہ نئے فلسفہ نے ضرور ان نتائج سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس میں کامیاب رہا۔

---

[۵۱] پورا نام نکولائی آئوانووچ لوباچیوسکی ۱۷۹۳ - ۱۸۵۶ روسی ماہر ریاضیات

[۵۲] جرمن ماہر ریاضیات اس نے ۱۸۹۷ میں وفات پائی جامعہ برلن میں ریاضیات کا پروفیسر تھا۔

[۵۳] ۱۸۴۵ - ۱۹۱۸ جرمن ماہر ریاضیات۔

[۵۴] گاٹ لوب فریگ سرزمین المانیہ کا مشہور ریاضی داں۔ مترجم

جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ آج طویل جہالت کے ان طرفداروں کے مقابلہ میں ہر طرح سرخرو اور کامراں ہے۔

نیا فلسفہ محض تنقیدی ہی نہیں بلکہ تعمیری بھی ہے لیکن اس کی تعمیر ہو بہو سائنس کی تعمیر ہے۔ کوئی فرق نہیں۔ سائنس ہی کی طرح وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور ہر طرح اطمینان اور جانچ کر لینے کے بعد بڑھتا ہے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہے اور پھونک پھونک کر اُٹھاتا ہے۔ اس کی تعمیر کا ایک خاص فنی اسلوب ہے جسے ریاضیاتی منطق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ منطق ریاضیات کی ایک نئی شاخ ہے اور اس کی دوسری تمام اور نئی شاخوں کے مقابلہ میں فلسفہ سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس منطق کی ایجاد سے پہلے نہ یہ پتہ چلایا جا سکتا تھا کہ سائنس کے کسی نظریے کا فلسفے پر کیا اثر پڑتا ہے اور نہ یہ تعین کیا جا سکتا تھا کہ عوامل میں سے کن کو تسلیم کرنا چاہیے اور کن کو نہیں۔ لیکن اس ریاضیاتی منطق نے ان سب کو ممکن کر دکھایا۔ ریاضیات اور طبیعیات کے فلسفہ نے اس اسلوب کی مدد سے بڑی زبردست ترقیاں حاصل کی ہیں۔ چنانچہ اس کی برکت سے طبیعیات کو جو پھل ملے ہیں ان کے ایک جزو کو ڈاکٹر[۱] وائٹ ہیڈ نے اپنی تین جدید تصنیفوں میں شرح و بسط سے قلم بند کیا ہے۔ توی توقع ہے کہ اس اسلوب کی بدولت دوسرے میدانوں میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگی اور یہ توقع کچھ بے بنیاد نہیں۔ یہاں پر ہم اس اسلوب کو اس لئے ہدیۂ ناظرین نہیں کر سکتے کہ وہ بے حد فنی ہے اور یہی اس کا نقص ہے اگر یہ کوئی نقص ہے۔

جدید فلسفہ کثرت وجود کا بڑا حصہ قضایا کی منطقی تحلیل پر مشتمل ہے لیکن اس اسلوب کو جب پہلے پہل استعمال میں لایا گیا تو صرف و نحو کا بڑا اہتمام کیا گیا چنانچہ مینانگ کہتا ہے کہ جب ہم واقعۃً یہ کہہ سکتے ہیں کہ "گول مربع موجود نہیں ہے" تو ایسے معروض کا ہونا ضروری ہے جو

---

[۱] علم طبیعی کے مبادیات مطبوعہ ۱۹۱۹ - تصور فطرت مطبوعہ ۱۹۲۰ اور اصول اضافیت مطبوعہ ۱۹۲۲۔ یہ تینوں کتابیں جامعۂ کیمبرج کے مطبع میں چھپیں۔ مصنف

گول مربع ہو خواہ وہ غیر موجود ہی کیوں نہ ہو۔ راقم الحروف بھی پہلے پہل اس قسم کے استدلال سے محفوظ نہیں رہا۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس سے گریز کیونکر ممکن ہے۔ کیوں کہ اس سنہ میں اس نے " بیانات " کا نظریہ دریافت کر لیا جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جب ہم " گول مربع موجود نہیں ہے " کہتے ہیں تو گول مربع کا ذکر نہیں کرتے کیوں کہ گول مربع جیسے مہمل موضوع پر وقت صرف کرنا ایک خاصی بیہودگی ہے لیکن ایسے قضایا سے منطقی نظریوں کے بہترین معیار ہاتھ لگتے ہیں۔ بہت سے منطقی نظریے صرف اس لئے رد کر دئے جاتے ہیں کہ وہ بیہودگیوں کی طرف مؤدی ہوتے ہیں۔ لہٰذا منطقی کو ہمیشہ بیہودگیوں سے واقف اور ہوشیار رہنا چاہیئے جو شخص معمل (تجربہ خانہ کے) اختیارات کے افادہ سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ انھیں ہیچ اور ناچیز شمار کرتا ہے حالانکہ وہ عظیم الشان نتائج کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ یہی حال بیہودگیوں کا ہے جو منطقی کے اختیارات اور اس کی زرّین کامیابیوں کے مقدمے ہیں۔

نئے فلسفے میں چونکہ قضایا کی منطقی تحلیل کا کافی حصہ ہے اس لئے شروع شروع میں فلاطون اور قرون وسطیٰ کی موجودیت کا رنگ اس پر بے حد غالب رہا۔ اس زمانہ میں وہ مجردات اور مادّیات دونوں کو یکساں سمجھتا تھا یعنی اس کی نظر میں دونوں کی حیثیت وجود بالکل ایک تھی۔ مگر جیسے جیسے اس کی منطق پختہ ہوتی اور کمال کو پہنچتی گئی ویسے ویسے اس نظریہ سے وہ دست کش ہوتا گیا اب جو اثر اس پر پھر بھی باقی رہ گیا ہے وہ کچھ ایسا نہیں ہے جس سے فہم عامہ کو کوئی صدمہ پہنچ سکے۔

نئے فلسفہ پر شروع میں نظری ریاضیات کا اثر بے حد غالب تھا لیکن موجودہ زمانہ میں اس کی جگہ طبیعیات نے لے لی ہے۔ یہ انقلاب آئن شٹائن کا پیدا کردہ ہے۔ جس نے زمان، مکان، اور مادّہ کے پرانے تصوروں کی دنیا بالکل ہی بدل ڈالی۔ ہر چند یہاں نظریۂ اضافیت کی تشریح کا کوئی محل نہیں تاہم اس کے فلسفیانہ نتائج کو مختصر لفظوں میں بیان کر دینا بالکل ناگزیر ہے۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اضافیت کے نظریہ میں دو نہایت اہم نکات پوشیدہ ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ ایسے واحد اور ہمہ گیر زمان کا کہیں وجود نہیں جس میں کائنات کے جملہ حوادث اپنی اپنی جگہ پر ممکن ہوں اور (۲) دوسرا یہ کہ طبیعی مظاہر کے مشاہدہ میں اگرچہ وضعی یا موضوعی جزو بہت بڑا ہے —— اتنا بڑا کہ اب سے پہلے اس کا پورے طور پر کبھی احساس نہیں کیا گیا —— لیکن اس کو ایک ریاضیاتی اسلوب کے ذریعہ بہ آسانی رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلوب پیمائشی رقموں[۵۱] کا احصار کہلاتا ہے اور میں اس پر ایک لفظ نہیں کہوں گا کیوں کہ اس کی فنی علموست ناقابل برداشت ہے۔

زمان کے متعلق شروع ہی میں یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہم یہاں کسی فلسفیانہ تخمین میں سر نہیں کھپا رہے بلکہ ایک ایسے نظریہ سے بحث کر رہے ہیں جو اختباری نتائج کی پیداوار ہے اور ریاضیاتی ضابطوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان دونوں زمانوں میں بالکل وہی فرق ہے جو مان ٹس کیو[۵۲] کے نظریوں اور امریکی دستور میں ہے۔ مختصر یہ کہ زمانی نظام ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ جو حوادث مادّے کے ایک قطعے پر رونما ہوتے ہیں وہ اس ناظر کے نقطۂ نظر سے ایک خاص زمانی نظام رکھتے ہیں جو مادّے کے مذکورہ قطعہ کے ساتھ ساتھ گردش کر رہا ہے۔ اور جو حوادث مادّے کے دوسرے قطعوں پر —— ان قطعوں پر جن کے مقامات مختلف ہیں —— رونما ہوتے ہیں۔ ان کا لازماً کوئی خاص یا متعیّن زمانی نظام نہیں ہو سکتا۔ اپنے مافی الضمیر کو ہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کئے دیتے ہیں۔ اگر کوئی روشنی زمین سے سورج کی طرف روانہ کی جائے اور وہاں سے پھر وہ زمین کی طرف لوٹے تو اس کی روانگی اور واپسی میں سولہ منٹ صرف ہوں گے یعنی وہ جس وقت زمین سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے ٹھیک سولہ منٹ بعد زمین پر واپس ہوگی اب ان سولہ منٹوں میں جو حوادث زمین پر رونما ہوں گے وہ سورج پر اس کے وروو سے

---

[۵۱] Tensor Calculas کا ترجمہ ہے۔ مترجم

[۵۲] Montesquieu شارل زان ٹس کیو ۱۶۸۹ - ۱۷۵۵ فرانسیسی فلسفی اور مصنف۔ مترجم

نہ قبل ہوں گے اور نہ مابعد۔ فرض کیجئے کہ ناظروں کی ایک بڑی تعداد زمین اور سورج کے لحاظ سے جملہ ممکن سمتوں میں گردش کر رہی ہے اور ان سولہ منٹوں میں زمین پر رونما ہونے والے حوادث کو اور سورج پر اس روشنی کے پہنچنے کو بہ نظرِ غور دیکھ رہی ہے پھر یہ بھی مان لیجئے کہ ان میں سے ہر ایک کی رفتار روشنی کی رفتار کے مساوی ہے اور ہر ایک کے پاس ایک صحیح وقت موجود ہے تو اب یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض تو یہ خیال کریں گے کہ ان سولہ منٹوں میں جو حادثہ زمین پر رونما ہوا وہ سورج پر روشنی کے پہنچنے کے پہلے کا تھا بعض یہ سمجھیں گے کہ وہ اس کے ورود کے ہم وقت تھا اور بعض یہ جانیں گے کہ وہ اس کے بعد کا تھا۔ اگر صحت پر ہیں تو سب ہیں اور غلطی پر ہیں تو سب ہیں۔ لیکن طبیعیات کے غیر شخصی زاویۂ نظر سے ان سولہ منٹوں میں جو حوادث زمین پر رونما ہوتے ہیں وہ سورج پر روشنی کے پہنچنے سے نہ پہلے کے ہیں نہ بعد کے اور نہ برابر کے۔ پس مادے کے ایک قطعہ پر جو حادثہ ل رونما ہوا ہے اس کے تعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مادے کے دوسرے قطعہ پر رونما ہونے والے حادثہ ب سے بالتحقیق مقدم ہے کیوں کہ بہ صورت اثبات یہ لازمی ہوگا کہ نور ل سے ایسے وقت نکلے جبکہ پہلا حادثہ رونما ہوا (ل کے وقت کے مطابق) اور ب پر ایسے وقت پہنچے جبکہ دوسرا حادثہ ابھی رونما نہیں ہوا (ب کے وقت کے مطابق) ورنہ دونوں حوادث کا زمانی نظام تو ناظر کے ساتھ ساتھ بدلتا جاتا ہے اور کسی طبیعی واقعہ کا استحضار نہیں کرتا۔

اگر نور کی رفتار کے مقابلے کی رفتاریں عام ہوتیں تو نہ ہم اطبا کے پھندے سے آج چھٹکارا پاتے اور نہ طبیعی دنیا پر سائنس کے اسالیب کے ذریعے بحث کرنے کی نوبت آتی۔ لیکن اگر طبیعیات کا انکشاف ہو چکا ہے تو اس کا آئن شٹائنی طبیعیات ہونا ضروری ہے۔ اس واسطے کہ نیوٹنی طبیعیات صریحاً بیکار اور ناقابل انطباق ہے۔ تاب کار جواہر ایسے ذرات خارج کرتے ہیں جو قریب قریب نور کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اگر اضافیت کی نئی طبیعیات کو کام میں نہ لائیں تو ان کے طور طریق اور کردار کو سمجھنا ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہے۔

قدیم طبیعیات کا ناقص ہونا کسی مزید ثبوت کا محتاج نہیں۔ اور اس نقص کا "بالکل معمولی" ہونا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کوئی معقول عذر نہیں۔ ہمیں غور اس واقعہ پر کرنا چاہیئے کہ جو حوادث مختلف مقامات پر رونما ہوتے ہیں ان میں آپس میں ایک حد تک کوئی متعین زمانی نظام نہیں ہوتا۔ اور اسی واقعہ پر سے "مکان" اور "زمان" کی دو مختلف اصطلاحوں کی جگہ "مکا زمانہ"[1] کی واحد اصطلاح کو دی گئی۔ پس جس زمان یا وقت کو ہم اب تک کائناتی سمجھا کئے وہ حقیقت میں "مقامی وقت" ہے یعنی ایک ایسا وقت جو زمین کی گردش کا پابند اور کلیّت کے منصب سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ اس جہاز کا وقت جو بحر اوقیانوس کو عبور کرتے ہوئے اپنے گھنٹوں کو نہیں بدلتا۔

جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ زمان کو ہمارے معمولی معمولی ادراکات میں کتنا زبردست دخل حاصل ہے اور اس کی اصلی حالت کیا ہے تو فوراً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر میں ایک نہایت گہری اور اہم تبدیلی کا پیدا ہونا ضروری بھی ہے اور یقینی بھی۔ مثال کے طور پر "ترقی" کے ادراک کو لیجئے۔ اگر زمانی نظام کسی اصول اور قاعدہ کا پابند نہیں ہے تو وقت کی پیمائش کے متعلق جو قرار داد طے پائیگی اس کے مطابق ترقی اور تنزل دونوں کا احتمال یکساں ہوگا۔ اسی طرح مکانی بُعد کا ادراک بھی بہت متاثر ہوتا ہے فرض کیجئے کہ دو ناظر دو مقاموں کے درمیانی فاصلہ کو انتہائی صحت کے ساتھ ناپنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن اگر ان کی اضافی حرکت تیز ہے تو ان کے تخمینے بالکل مختلف ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ فاصلہ کے تصور میں بے حد ابہام پیدا ہوگیا ہے کیونکہ فاصلہ ہوگا مادی چیزوں کے بیچ میں۔ خالی مکان کے نقطوں کے بیچ میں نہیں جو محض مفروضات ہیں۔ اس کے سوا یہ فاصلہ ایک خاص وقت کا پابند ہوگا کیوں کہ دو اجسام کا درمیانی بُعد ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور خاص وقت کی

---

[1] Space Time کا ترجمہ ہے مکان + زمان مترجم

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک موضوعی ادراک ہے اور اس راہ پر موقوف ہے جس سے ناظر گزر رہا ہے مزید برین آج ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں جسم فلاں وقت موجود تھا! البتہ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں اور کہنا چاہیئے کہ فلاں حادثہ فلاں وقت حاضر اور واقع تھا۔ دو حوادث کے بیچ میں ہمیشہ ایک خاص علاقہ ہوا کرتا ہے جو ان کا درمیانی "وقفہ" کہلاتا ہے۔ اور یہ ہر قسم کے ناظر سے بے نیاز اور مستغنی ہوتا ہے اس "وقفہ" کی تحلیل مختلف ناظر مختلف مکانی اور زمانی مرکبتوں میں کرتے ہیں لیکن یہ تحلیل خارجیت سے گراں بار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ وقفہ تو بے شک ایک خارجی طبیعی واقعہ ہے لیکن مکانی اور زمانی عناصر میں اس کی تقسیم خارجی طبیعی واقعہ نہیں ہے۔

مادہ کے متعلق ہمارا پرانا اور سہل تصور یہ تھا کہ وہ "ٹھوس" ہے لیکن یہ "ٹھوس پن" اب رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ مادہ کا کوئی ٹکڑا آج "حوادث کے ایک سلسلہ" سے زیادہ نہیں جو بعض قوانین اور نوامیس کا پابند ہے۔ اور ان کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مادہ کے مذکورہ بالا تصور نے ایسے وقتوں میں جنم لیا جب کہ فلاسفہ کو "جوہر" کے تصور کے صحیح اور مستند ہونے میں کوئی شک اور شبہ نہیں تھا۔ مادے کو انھوں نے ایک ایسا "جوہر" سمجھ رکھا تھا جو ہمیشہ مکان اور زمان میں پایا جاتا ہے اور ذہن ایک ایسا "جوہر" تھا جو صرف زمان کا پابند ہے۔ اور مکان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ مابعد الطبیعیات میں "جوہر" کے ادراک کا "ٹھوس پن" رفتہ رفتہ "غائب" ہوتا گیا۔ لیکن طبیعیات میں وہ جوں کا توں باقی رہا۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے کوئی نقصان متصور نہ تھا۔ لیکن اضافیت کے نظریہ نے ایجاد ہو کر پرانی کائنات بالکل بدل دی۔ جوہر کا روایتی ادراک دو عناصر سے مرکب تھا جن میں سے (۱) پہلا عنصر تو یہ تھا کہ جوہر میں ایک منطقی خاصہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی قضیہ میں وہ جب کبھی واقع ہوگا ہمیشہ موضوع (مبتدا) کی حیثیت سے ہوگا محمول (خبر) کی حیثیت سے نہیں۔ اور (۲) دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسی چیز تھا جو زمانا دائم اور قائم رہتی ہے۔ یا زمان سے بالاتر ہوتی ہے ان دو خاصوں میں کوئی لازمی ربط نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا ادراک نہیں کیا گیا۔ کیونکہ طبیعیات

کہتی تھی کہ مادّے کے ذرّے لافانی ہیں اور الٰہیات کہتی تھی کہ روح لافانی ہے۔ لہٰذا دونوں کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ ان میں جواہر کے دونوں خواص پائے جاتے ہیں۔ لیکن اب طبیعیات ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم سریع الفنا حوادث کو حقیقی معنوں میں "جواہر" جانیں یعنی انہیں ایسے موضوع سمجھیں جو محمول نہیں ہو سکتے۔ مادّے کے جس ٹکڑے کو ہم ایک اور دوامی کائن سمجھتے ہیں۔ وہ حقیقت میں بہت سے کائنوں کی ایک لڑی ہے۔ گویا وہ سینما کا ایک منظر ہے جو بظاہر دکھلائی تو ایک دیتا ہے مگر حقیقت میں بہت سی چھوٹی چھوٹی تصویروں کا مجموعہ ہوتا ہے جب مادّہ کا یہ حال ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہی بات ذہن کے متعلق نہ کہیں تو واقعہ یہ ہے کہ دائم الحال نفس لافانی سالمہ کی طرح بالکل فرضی اور افسانوی ہے۔ دونوں کے دونوں حوادث کی لڑیاں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بعض دلچسپ علائق رکھتی ہیں۔

ماخ اور جیمس نے کہا تھا کہ ذہنی اور طبیعی دنیاؤں کا "مسالہ یا مواد" ایک ہے اور جدید طبیعیات اس بارے میں ان کی تائید کرتی ہے۔ "ٹھوس مادّہ" اب تک افکار اور دائم الحال نفس دونوں سے قطعاً مختلف تھا لیکن اب حالت اور ہو گئی ہے اب تو مادّہ اور نفس دونوں نے حوادث کے مجموعوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا چنداں دشوار یا مشکل نہیں کہ ان دونوں کی تشکیل ایک ہی مواد سے عمل میں آئی ہے۔ اس کے سوا اب تک ذہن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نقطۂ نظر کا مالک یا موضوع ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ خصوصیت اب تو طبیعیات میں بھی پائی گئی ہے اور جہاں کہیں پائی گئی ہے ذہن سے بالکل بے لوث پائی گئی ہے۔ مثلاً فوٹو کے کیمروں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کو اگر مختلف مقامات پر نصب کر کے کسی ایک حادثہ کی تصویر لی جائے تو وہ اسی ایک "حادثہ" کو تو پیش ضرور کریں گے لیکن ان کے عکسوں میں اختلاف ہو گا۔ علیٰ ہذا جدید طبیعیات نے وقت پیماؤں اور پیمائشی جریبوں کو بھی موضوعی بنا دیا ہے۔ اب وہ براہ راست جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ کوئی طبیعی واقعہ نہیں بلکہ طبیعی واقعہ کے ساتھ ان کی اضافت ہے اس طرح طبیعیات اور نفسیات کی درمیانی خلیج بڑی حد تک

بٹ گئی ہے اور ذہن اور مادّہ کی پرانی ثنویت کی دھجیاں فضائے بسیط میں کبھی کی اڑ چکی ہیں۔

اگر ہم یہاں پر اتنا بتلا دیں کہ جدید طبیعیات میں "قوت" جیسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو غالبًا بے محل نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس لفظ سے اس کے پرانے یا مستعمل معنے مراد لئے جائیں پیشتر عام طور پر ہم یہ خیال کرتے تھے کہ سورج زمین پر ایک قوت صرف کرتا ہے۔ مگر اب خیال ہوگیا ہے کہ سورج کے قرب وجوار میں جو مکانی زمانی نظام ہے اس کا ڈول کچھ ایسا ہے کہ زمین کو دوسرے مداروں کے مقابلہ میں موجودہ مدار پر گردش کرنے میں بہت کم مزاحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس طرح جدید طبیعیات کا بڑا اصول "اقل عمل کا اصول" ہے یعنی کوئی جسم ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتے ہوئے ہمیشہ وہی راہ اختیار کرے گا جس میں عمل کی سب سے کم ضرورت ہو۔ (عمل اگرچہ ایک ٹھیٹھ فنی اصطلاح ہے لیکن یہاں پر اس کے مفہوم کی وضاحت چنداں ضروری نہیں ہے) اخبارات اور بعض اہل قلم حضرات اپنی تحریروں میں لفظ "حرکت" کا استعمال بڑے زور وشور سے کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے استعمال سے ان کی عبارتوں میں قوت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن خود "حرکت کے علم[۹۱]" کا حال یہ ہے کہ اس میں حرکت کی قسم کی کوئی چیز پائی ہی نہیں جاتی اس کے برعکس وہ تو کاہلی کی بڑی دلدادہ ہے اور اسی بناء پر یہ چاہتی ہے کہ ہر چیز کا استنباط سستی کے ہمہ گیر قانون سے عمل میں لایا جائے۔ علاوہ اس کے کسی جسم کو دوسرے جسم کی حرکتوں پر کوئی "اقتدار" بھی حاصل نہیں ہے۔ جدید سائنس کی دنیا کو ان لوگوں کی دنیا سے کوئی نسبت نہیں جو "بڑے بڑے قانونوں" اور "طبیعی قوتوں" کی بڑ ہانکتے ہیں۔ البتہ لاؤزو کی دنیا سے اسے گہری مشابہت حاصل ہے۔

پرانے فلسفوں کے مقابلہ میں کثرتیت اور موجودیت کا جدید فلسفہ بعض اعتباروں سے بہت کم نتیجہ خیز ثابت ہوا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں فلسفہ الٰہیات کا خانہ زاد غلام تھا۔ اور کتب

---

۹۱ Dynamics کا ترجمہ اور حرکیات کا مترادف لفظ مترجم

فروشوں کی فہرستوں میں آج تک وہ دونوں ایک ہی عنوان کے تحت جگہ پاتے ہیں فلسفہ کا فریضہ عام طور پر یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ مذہب کے حقایق عظمیٰ کو بہ دلائل و براہین ثابت کرے لیکن نئی موجودیت کو نہ یہ دعویٰ ہے کہ وہ انھیں ثابت کرسکتی ہے اور نہ اس پر اصرار کہ انھیں جھٹلا سکتی ہے۔ اس کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ علوم کے اساسی تصورات کو چھانٹ لے اور مختلف علوم کو باہم ملا کر کائنات کے اس جزو کے متعلق ایک ہمہ گیر اور واحد نظریہ ترتیب دے جس کا علم سائنس کو ہوچکا ہے اور جس کی تحقیق اور کھوج میں اس نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے ۔ اسے یہ علم نہیں کہ معلومہ جزو کائنات کے ماوراء کیا ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ایسا طلسم ہے جس سے وہ لاعلمی کو علم میں بدل دے۔ وہ عقلی لذات کے قدردانوں کو عقلی لذات بخشتی ہے لیکن بیشتر فلسفوں کی طرح ان میں زعم باطل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اگر وہ خشک اور فنی ہے تو یہ قصور اس کا نہیں کائنات کا ہے جو شاعروں اور صوفیوں کے احساسات کا مطلق پاس نہیں کرتی اور ریاضیات کی بڑی دلدادہ واقع ہوئی ہے۔ یہ امر غالباً افسوس ناک ہے لیکن ایک ماہر ریاضیات اس پر کوئی افسوس محسوس نہیں کرسکتا۔

مسلمان اور کانگرس

جامعہ کے پچھلے نمبر (اگست) کا مضمون "مسلمان کانگرس اور مسلم لیگ" غور و توجہ
سے پڑھا گیا۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ "ایک مسلمان" نے بھیجا ہے
آیندہ پرچوں میں اس موضوع پر اور مضمون بھی شائع کیے جائیں گے، انشاء اللہ (اڈیٹر)

جامعہ کے پچھلے پرچہ میں "ایک قوم پرست مسلمان" نے کانگرس کے مسلمان حامیوں کا نقطۂ نظر
نہایت خوبی اور وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کے ماننے سے انکار نہیں کہ مسلمانوں کا سیاسی انتشار
حد سے گزر چکا ہے۔ سرسید کی حکمت عملی کبھی کی پرانی ہو گئی۔ لیگ نوابوں اور "سروں" کی سرپرستی میں گھٹ کر
دم توڑ رہی ہے۔ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کے خلوص کے ہم لاکھ معترف ہوں لیکن اس میں شک نہیں
کہ نوجوان نسلوں کی پریشانیوں اور متوسط اور عام طبقوں کے خیالات کو یہ بزرگ نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُن کے
مطالبات کے ترجمان ہو سکتے ہیں۔ طرابلس و بلقان، جزیرۂ عرب اور خلافت کے ہنگاموں کی یاد بھی اب
باقی نہیں رہی۔ نئے زمانے کی سیاسی اور معاشی ضرورتوں نے مسلمانوں کو من حیث القوم ایک ایسی سمندر میں ڈال
دیا ہے جس سے باہر نکلنے کی تدبیر ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بزرگوں کے بتائے ہوئے رستے بند ہو چکے تھے۔ ضرورت
تھی کہ نئے حالات کے پیش نظر زندگی کی کوئی نئی شاہراہ سوچی جاتی لیکن جنگ عظیم سے پہلے کے اور بعد کے
ہنگاموں نے قوم کو اتنا تھکا دیا ہے کہ وہ اس اضمحلال میں دماغ کی قوتوں سے کام لینے کے قابل نہیں رہی۔ جمہور نہ
کبھی سرکار پرست تھے اور نہ اُنھوں نے نوابوں اور "سروں" کو کبھی اپنا رہنما بنایا، اُن کی اپنی دنیا ۱۹۱۴ء
سے نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے تاریک ہو چکی تھی۔ سرسید نے صرف مسلمانوں کے اعلیٰ متوسط طبقوں کی ٹمٹماتی
ہوئی شمع کو بجھنے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ علی گڑھ تحریک کو عام جمہور اسلام کی خوشنودی کبھی حاصل نہیں
ہوئی۔ دراصل خلافت کے ہنگاموں نے زندگی میں پہلی بار مسلمان عوام کو اپنا ہم نوا بنایا۔ اس تحریک کے
اثرات کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کو خود اس میں شریک ہونے کا موقعہ ملا، جامعہ کے مضمون نگار نے

کا طنزیہ انداز میں اس تحریک پر رائے زنی کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں جزیرۂ عرب اور خلافت کے نام پر مسلمان اُٹھے تو کیا، گاندھی جی کے "رام راج" نے ہندوؤں کو اپنی طرف نہ کھینچا تھا۔ سچ یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی مقاصد اس وقت نہ ہندوؤں کے سامنے تھے اور نہ مسلمانوں کے دونوں قوموں کو تیز نعرے میدان میں لائے۔ عقل کی عنان گیری جذبات کو روک نہ سکی، اگر بقول "قوم پرست مسلمان" ہندو سوراج کا طالب تھا تو نیا مسلمان حالات میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے بے چین نہ تھا آزادی کی تڑپ اس کے دل میں موجود تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ آزادی کی جنگ میں وہ برابر کا شریک تھا۔ لیکن جنگ کی تباہی کے بعد جب جذبات کی جگہ عقل نے لی تو جامع مسجد دہلی میں آزادی ہند کی دعوت دینے والے ہندو رہنما کو اس نے شدھی کی جنگ میں مصروف پایا بعذباتی مسلمان سیاست کی یہ بھول بھلیاں نہ سمجھ سکا اور دل برداشتہ ہوکر جس نیند سے وہ برسوں کے بعد جاگا تھا پھر اس میں غرق ہوگیا۔ ہندو کی "آزادی" "رام راج" کے ہم معنی تھی اس لئے وہ سیاسیات کے اُتار چڑھاؤ سے متاثر نہ ہوا۔ اور برابر آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن مسلمان "اللہ اکبر" اور اسلام زندہ باد کہہ کر ہندوستانی قومیت میں رچ نہ سکتا تھا اسی لئے وہ لوٹ دی اور رجعت لپند کہلایا۔

افسوس تو یہ ہے کہ جس طرح مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی جمہور اسلام کے جذبات سمجھنے سے قاصر ہیں اسی طرح ہمارے کانگریسی مسلمان رہنما بھی عوام سے رابطہ بڑھانے کے اعلان کو کافی سمجھ لیتے ہیں۔ نہ اول الذکر ہماری مشکلات کو جانتے ہیں اور نہ آخر الذکر کو ہمارے احساسات کا خیال ہے۔ ایک نے اگر جزیرۂ عرب اور بقول مضمون نگار "آسمان کی چیزوں کے لئے" ہمیں اکسایا تو یہ جماعت موہوم آزادی کے دل پذیر تخیل کی دیوی کے نام پر، ہماری قربانی مانگتی ہے۔ "قوم پرست مسلمان" کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ

"ان دکانگریسیوں کا کہنا ہے کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ اس بنیاد پر کسی قسم کی جداگانہ جماعت بندی نہیں کی جا سکتی اور اگر کی جاتی ہے تو وہ محض چند خود غرض اور جاہ پسند لوگوں کے فائدے کے لئے کی جاتی ہے جو مذہب کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں۔ اس فریب کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہئے اور عوام کے

سامنے معاملات کو صحیح روشنی میں پیش کرنا چاہئے۔ عوام بھوکے اور ننگے ہیں۔ ان میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے لئے یہی مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں۔

ہم خود چاہتے ہیں کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہ ہو اور بھوکے ننگے عوام کی مدد سب سے اہم مسئلہ بنایا جائے لیکن رونا تو یہ ہے کہ نظری حیثیت سے گذر کر جب ہم عملی دنیا میں آتے ہیں تو بھوکے اور ننگے عوام کی حالت زار پر آنسو بہانے والے عوام کی ہمدردی کو فرقہ دارانہ رنگ دیتے ہیں۔ ممکن ہے یوپی میں مسلمانوں کے ساتھ کانگرس کا وطیرہ منصفانہ ہو لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے مرکز بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد ہیں، بنگال کا مسلمان آسمان کی چیزوں کو آج چھوڑنے کے لئے تیار ہے اگر آپ اسے دنیا کی چیزیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ پنجاب کا لوڈی طبقہ غریب کسانوں کا وہاں کی کانگرس سے زیادہ ہمدرد ہے۔ صوبہ سرحد کا ہندو اس وقت تک کانگرس کے ساتھ ہے جب تک کانگرس ہندی گورمکھی سرکلر منسوخ کرنے کو تیار ہے اور اگر سر عبدالقیوم اس سرکلر کو منسوخ کرنے کا ذمہ لے لیں تو ہندو اسی کو آزادی کا پرستار سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان فرقہ پرستی سے بے زار ہیں لیکن اگر وہ اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ صوبے کی کثیر آبادی کو ننگے اور بھوکے رہنے دینا قومیت کے بلند آہنگ دعاوی کے منافی ہے تو اُن کو رجعت پسند اور فرقہ پرست کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے۔

ہمیں پنڈت جواہر لال کے تمام معاشی اور سیاسی اصولوں سے کلی اتفاق ہے۔ ہم ننگے بھوکے عوام کی مدد کو سیاست نہیں بلکہ مذہب کا سب سے اہم فرض سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جواہر لال جی کی یہ تمام نظریہ سازی صرف زیب قرطاس یا رونق محفل سے آگے نہیں بڑھتی۔ کانگرس کی عنانِ اختیار حقیقت میں اُس جماعت کے ہاتھ میں ہے جو معاشی انقلاب سے اُتنی ہی لرزاں ہے جتنے ہمارے لیگ کے ارباب اقتدار۔ ان حالات میں ہم کس منہ سے مسلمان عوام کو کہیں کہ آؤ کانگرس میں شریک ہو جاؤ کانگرس عوام ہندوستانیوں کی جماعت ہے۔ اور وہ تباہ حال لوگوں کی خدمت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

اگر محترم مضمون نگار صاحب ننگے بھوکے مسلمان عوام کو کانگرس کی حسن نیت کا یقین دلانے کی

کوشش کریں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان عوام کیلئے کانگرسی رہنماؤں کی تقریر بازیاں مسٹر جناح کے دعووں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مسلمانوں کے پبلک جلسوں میں شریک ہو کر دیکھئے۔ ایک طرف خوش بیان مقرر کی تقریر ہو رہی ہے۔ لیکن سامعین کی ایک بڑی جماعت کو آپ یہ سرگوشیاں کرتے سنیں گے کہ "میاں! ان لیڈروں کا کیا بھروسہ"۔ عوام کا اعتماد نہ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کو حاصل ہے اور نہ ہمارے کانگرسی رہنماؤں کو، اُن کے نزدیک نہ لیگ کا نظام دل کش ہے اور نہ کانگرس کا عوام سے ربط پیدا کرنے کا اعلان۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نظام ان کی زندگی کے حقائق سے بے گانہ ہیں ایک کو "سر" اور نوابوں کی سرپرستی کا فخر ہے تو دوسرے کو ہر قسم کے سرمایہ داروں کی اعانت کا شرف۔

بالفرض اس وقت اگر جنگ آزادی کا ہنگامہ کارزار گرم ہوتا اور کانگرس پردیسی دشمن کے خلاف معرکہ آرا ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس وقت مسلمانوں کو عقل کی دور اندیشیوں سے بے نیاز ہو کر بے دھڑک جنگ کی آگ میں کود پڑنا چاہئے۔ لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کانگرس کا انقلابی عنصر دستوری جماعت کے مقابلے میں اپنی ہار مان چکا ہے۔ کانگرس کی تحریک کا تمام زور صرف اصلاحی کوششوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس وقت مسلمان سے محض جذبات کے نام سے اپیل کرنا دانش مندی سے بعید ہے۔ آزادی کی دیوی واقعی دل کش ہے۔ لیکن خدارا آپ یہ تو بتائیے کہ اس پرستش کا اُسے کیا صلہ ملے گا۔ ہندو تو مگن ہے ملک اس کا۔ ملک کا جو تمدن ہے۔ جس تمدن کو وہ زندہ کرنا چاہتا ہے وہ اس کا۔ وہ مذہب کو خیرباد کہہ کر بھی ہندو رہے گا لیکن مسلمان کے لئے آزادی کے اس تخیل میں اپنے آپ کو کھپانا مشکل ہے۔

ہماری رائے میں کانگرس کی تحریک خالص قومی تحریک نہیں ہے۔ اس کی پچاس سالہ روایات بالکل ہندوانہ ہیں۔ جن کے اثرات آج بھی کانگرس کی ہر سرگرمی میں خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر "بندے ماترم" کے قومی گیت کو لیجئے اس گیت سے بنگالی مسلمانوں کو چڑ ہے۔ کیونکہ یہ گیت انھیں بنگال کی سیاسی زندگی کے اس دور کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر ہر مسلمان کے لئے سوہان روح ہے۔ دوسری مثال مہاتما جی کی ہے۔ ان کی عظیم المرتبت شخصیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن مہاتما جی کی سرگرمیاں بہت حد تک ہندو قوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کی بنیاد صرف

سیاسی اور معاشی اصولوں پر رکھی جاسکتی ہے یعنی یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ متحدہ قومیت کی ترجمان جماعت کس حد تک مذہبی اثرات سے بالاتر ہو چکی ہے۔ کانگرس کا وجود معجون مرکب بن کر رہ گیا ہے ، نام کو تو یہ سیاسی جماعت ہے لیکن اس کا رنگ روپ بالکل مذہبی ہے۔ اور جب تک اس کا یہ چلن رہے گا مسلمان من حیث القوم کبھی اس میں شریک نہیں ہوں گے ۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک کانگرس کی سال خوردگی خاص اہمیت رکھتی ہو لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ ملک جہاں بدیسی حاکموں کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں اور وہاں کی اقلیتیں اپنے مخصوص تمدن کا قومی شعور رکھتی تھیں۔ ان ملکوں کے قومی رہنما کٹر وطن پرست تھے انھوں نے مختلف فرقوں کو یکجا کرنے کے لئے قومی جماعت کی بنا نئے اصولوں پر رکھی ۔ مصر میں جنگ عظیم سے پہلے حزب الوطن کا زور تھا ۔ گو کہ یہ آزادی خواہ جماعت تھی لیکن اس کا رنگ ڈھنگ بہت حد تک اسلامی روایات سے متأثر تھا سعد زغلول نے قومی تحریک شروع کی تو اپنی نئی جماعت بنائی جس کی روایات اول تو تھیں ہی نہیں اور اگر تھیں تو خالص قومی ۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال نے یہی کیا۔ عراق اور شام میں اسلامی اکثریتوں نے اقلیتوں کو اسی طریق سے اپنا ہم نوا بنایا لیکن ہندوستان کی دنیا ہی نرالی ہے ۔ مہاتما جی کی تقریروں تحریروں اور اسکیموں کو لیجئے ان کا ہر لفظ دو ہزار سال پہلے کی زندگی کا آئینہ دار ہے ، ان کی تحریک کو سمجھنے کے لئے بدھ مت جینی روایات اور بھگوت گیتا کا مطالعہ ضروری ہو گیا ہے۔ اگر ہمارے قوم پرست مسلمان اپنے ہم مذہب بھائیوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمان سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے جداگانہ جماعت بندی نہ کریں تو سب سے پہلے ان کا فرض ہے کہ وہ کانگرس کو صحیح معنی میں ایک سیاسی ادارہ بنائیں۔ درحقیقت کانگرس خالص ہندو قومی تحریک کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے ۔ اگر آپ حضرات کو امپیریلزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی خواہش ہے تو کوئی نئی جماعت بنائیے جو ہندو تمدن کی حفاظت کی بجائے ہندوستانیوں کے حقوق کی محافظ ہو۔

نظری مذہب اور خیالی تمدن کی حمایت کے زعم میں ہم سیاسی اور معاشی آزادی کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن جماعتوں کے سامنے کوئی نصب العین رکھتے وقت یہ سوچ لینا چاہئے کہ یہ نصب العین

کہاں تک جمہور کی حسیات اور خیالات کا مظہر ہو سکتا ہے۔ بے شک معیشت زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے لیکن ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ محض معیشت انسانی زندگی کا قبلہ مقصود نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو دھرم کی طرح اسلام کا دائرہ اثر محض فکری دنیا تک محدود ہوتا تو مسلمان کو ہندو تمدن میں گھل مل جانے میں دقت نہ ہوتی لیکن اسلام محض ایک نظری عقیدہ نہیں، خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی تیرہ سو سال کی زندگی میں اسلام نے تمدن معاشرت اور سیاست کے متعلق زندگی کا ایک خاص زاویہ نگاہ بنا لیا ہے اور ہندوستانی مسلمان اس زاویہ نگاہ کا نہایت گہرا شعور بھی رکھتا ہے۔ نیز آپ سیاست اور مذہب کی تفریق کے ہزار اعلان کیجئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر سیاست اجتماعی زندگی کا ایک شعبہ ہے تو مذہب اسلام کو آپ مذہب اور سیاست سے الگ نہیں کر سکتے۔ مذہب کے نام سے ووٹ لینا۔ عوام کو اپنا آلہ کار بنانا اور اس کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا اور چیز ہے۔ اور زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر رکھنا دوسری چیز۔ مسلمان کو جب آپ یہ کہیں گے کہ سیاست سے مذہب اور تمدن کو جدا کر دو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اسے مذہب اور تمدن کو چھوڑنے کو کہہ رہے ہیں، ایک مسلمان کے سامنے جب قرآن کریم، رسول اللہ صلعم، صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کا نام لیا جاتا ہے تو اس کی چشم تصور کے روبرو فوراً تمدن اور سیاست کی ایک ملی جلی شکل آ جاتی ہے۔ مذہبی اور تمدنی، اداروں کی آزادی اور سیاسی جماعت بندی کی مخالفت کی دعوت دینا اسلامی تعلیمات سے بے خبری کا اعلان کرنا ہے۔ اگر آپ اسلام کو بحیثیت مذہب اور مسلمانوں کو بلحاظ ایک جداگانہ تمدن رکھنے والی جماعت کے زندہ دیکھنے کے متمنی ہیں تو انہیں سیاسی جماعت بندیوں سے نہ روکئے بے شک جمہور اسلام کافی عرصہ غلط مذہب، خود غرض قیادت اور جاہ پسند امارت کا تختہ مشق بن چکے زمانے کی نئی روش نے اب اسے بے چین کر دیا ہے۔ بڑے بڑے خطاب یافتہ اشخاص سے عوام مسلمانوں کا اندازہ کیجئے۔ بھوک، برہنگی، سامراج کی لوٹ کھسوٹ اور ہمسایہ قوم کی زر طلبی نے اُن کو نئے انقلاب کے لئے تیار کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ننگے بھوکے عوام کو غلط مذہب، خود غرض قیادت اور جاہ پسند امیروں سے نجات دلائی جائے۔ زندگی کی کلی کھلے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کا فلاکت زدہ مسلمان نہ ہندو کی برتری سے خوش رہ سکتا ہے اور نہ سرکار پرست مسلمان لیڈر

ان کی اٹھان کو روک سکتے ہیں شمالی ہند کے مسلمان کو آپ زوال آمادہ (DEMORALIZED) نہیں بنا سکتے۔ اس کے قوائے زندگی اب تک تمدن کے سرطان سے محفوظ رہے ہیں۔ اب اس کو زندہ ہونے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ قوالوں، "روز سروں" کا زمانہ اب گیا۔ انقلاب کا دھارا عوام کو بلند و بالا کر کے رہے گا۔

ہم چاہتے ہیں کہ عوام کی بیداری کی عمارت کانگرسی معماروں کے ہاتھ سے نہ بنے۔ ہم مذہب اسلام اور اسلامی تمدن کو دنیا کا مفید ترین عنصر سمجھتے ہیں۔ اور انسانیتِ نو کی تخلیق میں اس عنصر کا وجود ضروری جانتے ہیں۔ اس وقت کانگرسی نصب العین کو قبول کرنے اور اپنی سیاسی وحدت کو ختم کرنے کے معنی اپنے مذہب، اور تمدن سے ہاتھ دھو لینے کے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی ملی زندگی کا نصب العین کانگرس نہیں رکھنا چاہتے۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمان عوام کی بیداری اُن کی خالص قومی زندگی کے معیاروں پر ہونی چاہئے، اُن کو "مہاتما گاندھی جی کی جے" اور "بندے ماترم" کے نعروں کی بجائے۔ رسول اللہ صلعم صحابہ کرام اور سلف صالحین کا اسوۂ حسنہ پیش نظر رکھنا چاہئے، وہ ضرور بغاوت کریں۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم پر لڑیں۔ زندگی کی سوتوں کو بہنے سے روکنے والی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوں غلط مذہبیت اور خود غرض قیادت کے بتوں کو بے دریغ توڑیں لیکن اُن کی نشوونما میں ہم انھیں ہندو اثرات سے مامون رکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ جمود، توہم پرستی اور عقلی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں رہنے کے قابل ہو جائیں تو پھر وقت آئے گا کہ مسلمان اپنی سیاسی جماعت بندی کو چھوڑ کر اپنے تمدن اور مذہب کو محفوظ رکھ سکے گا۔

سادہ لوح اور انجان چالاک اشخاص کی جماعت میں رہ کر ان کا ڈھیل ہی بنتا ہے، خدارا مسلمان کو روٹی کے نام سے گمراہ نہ کیجئے۔ ممکن ہے کانگرس میں شامل ہو کر وہ بھوک اور برہنگی کو کچھ کم کر سکے (اگرچہ ہمارے خیال میں یہ بھی ممکن نہیں)، لیکن بحیثیت ایک انسان کے نہ اس کا ذاتی وقار رہے گا، اور نہ اس میں عزت نفس کا جذبہ باقی رہ سکے گا۔

"موسمِ بہار اُن کا"

جلوۂ بہار اُن سے، موسمِ بہار اُن کا
جان منتظر اُن کی، دل امیدوار اُن کا

دم لبوں پہ پھرتی رہی جانِ بیقرار اُن کا
اور کچھ نہیں حسرت، صرف، انتظار اُن کا

تا بحدِ نظر نکلا رنگِ روزگار اُن کا
خار کو بھی گل کر دے، حسنِ نو بہار اُن کا

لاکھ حسبِ سابق ہو، یوں ہی انتظار اُن کا
کیا کریں، نہیں جاتا، دل سے اعتبار اُن کا

گو مرے تڑپنے پر ہنس وہ دیں تجاہل سے
حال دل کا رکھتا ہے، رنگ بیقرار اُن کا

وہ نگاہِ عشرت خیز، وہ تبسمِ گل ریز
اک اشارۂ رنگیں، موسمِ بہار اُن کا

اے فلک! جو اُس در سے، خاک ہو کے لپٹے ہیں
قسمتِ رسا اُن کی، بخت سازگار اُن کا!

وہ رلائیں یا تڑپائیں، خیر، یہ خوشی اُن کی
ہم ہیں دل کے قابو میں، دل پہ اختیار اُن کا

ایسی سینکڑوں راتیں، کاٹ دی ہیں آنکھوں میں
اور ابھی دکھائے کیا، دیکھیں انتظار اُن کا

گو چھٹے ہوئے اُن سے، مدتیں ہوئیں نشتر!
ہے مگر خیال اب تک، دل سے ہمکنار اُن کا

تنقید و تبصرہ

A Monograph on Moslem Calligraphy، کچھ عرصہ ہوا اس نام سے محمد ضیاء الدین صاحب پروفیسر علوم اسلامیہ شانتی نکیتن نے اپنی یونیورسٹی کے رسالہ میں اسلامی فن خطاطی پر ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا وہ مضامین اب کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب آرٹ پیپر کے ۰ صفحوں پر مشتمل ہے، جس میں ۱۶۲ کے قریب فن خطاطی کے شہکاروں کی تصویریں ہیں۔ طباعت نہایت پاکیزہ۔ قیمت چار روپیہ ہے ملنے کا پتہ یہ ہے:۔

Visva-Bharati Book Shop,

210, Cornwallis Street, Calcutta.

اسلامی تمدن کے جمالیاتی عنصر کے روشن ترین مظاہر دو ہیں، فن تعمیر اور فن خطاطی۔ اسلامی روایات نے تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ تامل کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے جذبۂ حسن پرستی نے عمارت اور خط کو مقصود فن بنایا۔ ان دو فنوں میں مسلمان کسی پیشرو کے خوشہ چیں نہیں تھے۔ انھوں نے ان میں تمام قوموں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اس پر چل کر فنی کمال کے معراج کو پہنچے۔

خطاطی کا جوہر صرف کتابوں اور مرقعوں تک محدود نہیں رہا بلکہ عمارات کے حسن کو دوبالا کرنے میں بھی خطاطی سے مدد لی گئی۔ تاج محل آگرہ، مسجد رفاعی قاہرہ اور الحمرا غرناطہ کو زندہ جاوید بنانے میں خطاطی کا بھی حصہ ہے۔ قرون وسطیٰ میں اسلامی خطاطی نے یورپ کے اہل فن سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اور خطاطی کے بعض طغرے مسیحی کلیساؤں، اور عیسائی حکومتوں کے سکوں کی زینت بنے، اس مختصر سی کتاب میں مصنف نے اجمالی طور پر فن خطاطی کی نشو و نما اور اس کے ارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ خط کوفی کی ابتدا، اس کی تدریجی ترقی، خط نسخ اور نستعلیق کا معرض وجود میں آنا، اور خطاطی کی مختلف

قسموں کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور جا بجا مختلف خطوں کے نمونے بھی دئے ہیں!

خطاطی پر فنی نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے آپ نے خطاطوں کو ممالک اسلامیہ میں جو ہرالعزیز حاصل تھی اس کا ذکر کیا ہے اس ضمن میں بغداد، مصر، اسپین اور شام کی لائبریریوں اور نشر و اشاعت کے اداروں کے نظام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب مذکور کا یہ باب نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے اور اس کا مطالعہ تاریخ اسلام کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

خطاطی کے فنی تجزیہ اور اس کی تدریجی ترقیوں کی تاریخ بیان کرنے میں مصنف نے اپنی خوش ذوقی فنی بصیرت اور علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ اسلوب بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ الغرض موصوف کی یہ کوشش ہر لحاظ سے کامیاب اور قابل تعریف ہے۔ امید ہے اسلامی تمدن سے دلچسپی رکھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول ہوگی۔

م۔ ص

مبادی سیاسیات | جلد اول (مملکت) مولفہ ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے (کنٹب) صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ، ضخامت ۲۹۱، کاغذ معمولی، طباعت و کتابت مناسب، قیمت ۲ عہ ملنے کا پتہ:۔ غلام دستگیر بک ڈپو۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

سیاسیات کی اہمیت سے آج کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ متمدن اور ترقی یافتہ ممالک تو ایک طرف رہے موجودہ زمانے کی کشمکشوں نے معمولی لکھے پڑھے آدمیوں میں بھی سیاسیات کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ آج کرہ زمین کا کون سا خطہ ہے جہاں سیاسی ہنگاموں کی گرم بازاری نے عوام کے کانوں اور دلوں کو اپنی طرف نہیں کھینچا اور خاص طور پر جنگ عظیم کے بعد سے تو ہمارے ملک کی تمام سرگرمیوں پر سیاسیات کا ہی رنگ چھایا ہوا ہے۔ لیکن سیاسیات سے غیر معمولی شیفتگی کے باوجود ہماری زبان میں علم سیاست کے متعلق کوئی مختصر سی کتاب نہ تھی جس سے اردو جاننے والے مستفید ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ سے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں علم سیاسیات بھی نصاب تعلیم میں داخل ہے لیکن درسی کتابیں ایک تو انگریزی میں ہیں جن کی علمی اصطلاحات اس زبان میں کامل مہارت حاصل کئے بغیر بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتیں دوسرے اس قسم کی کتابوں میں ہندوستانیوں کے معیار لیاقت کا

خیال نہیں رکھا گیا۔ مبادی سیاسیات نے اُردو جاننے والوں کے لئے اس کمی کو پورا کردیا ہے۔

کتاب کے ۱۰ باب ہیں۔ ہر باب میں مملکت کے مختلف اداروں اور اُس کی خصوصیات کو فرداً فرداً لیا ہے۔ سیاسی نظریات پر بحث کرتے ہوئے مسلمان متفکرین ابن خلدون اور امام غزالی اور ہندو روایات کو بھی سامنے رکھا ہے اور مطالب کی توضیح میں مثالوں سے بھی کام لینے کی کوشش کی ہے بہرحال علم سیاست کے مبادی کو پیش کرنے میں مصنف کی یہ سعی ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور اس علم کا مبتدی بھی اس کتاب سے پورا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

مصنف نے عہد حاضر کی جملہ سیاسی تحریکوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس سلسلہ میں جرمنی اور اٹلی کی نسطائیت اور روس کی اشتراکیت پر خاص طور پر تنقید کی ہے دوران بحث میں دوسرے ملکوں کے حکومتی اداروں کا بھی ذکر کردیا ہے۔ الغرض ہر اخبار بیں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے کیونکہ بین الاقوامی واقعات اور قوموں کی باہمی چپقلشوں کا صحیح اندازہ کرنا سیاسیات کے مبادی کو جانے بغیر مشکل ہے۔

کتاب کی زبان زیادہ مشکل نہیں ۔ظاہر ہے کہ اس موضوع کو علمی اصطلاحات کے بغیر بیان نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن موصوف نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اصطلاحات کے اشکال کو تشریح کی مدد سے عام فہم بنایا جائے۔ بعض اصطلاحات کے ترجمہ کے متعلق ہماری چند گذارشات ہیں۔ مصنف نے Discipline کا ترجمہ تادیب کیا ہے، ہمارے خیال میں "نظم" اور "ضبط" سے یہ معنی بہتر ادا ہوتے ہیں اسی طرح Politician کا ترجمہ "سیاس" بھی غیر مانوس ہے، کتابت کی بھی چند غلطیاں ہیں، مثلاً صفحہ ۱۰ پر دہی کو بی، مملکتوں کو ملکوں لکھا گیا ہے صفحہ ۵ پر زمانہ کو زبان صفحہ ۹۵ پر رواداری کو رازداری ۔صفحہ ۱۱۴ پر جامہ کو جامعہ لکھا ہے۔ امید ہے دوسری اشاعت میں ان غلطیوں کی تصحیح کردی جائے گی۔

کتاب کے آخر میں ۱۴ صفحوں پر اصطلاحات کی فہرست ہے۔

م۔ص

طب العرب حصہ دوم | یہ کم وبیش ایک سو صفحے کا رسالہ ہے جس میں پروفیسر براؤن مرحوم کے ایک لیکچر کا اُردو ترجمہ ہے۔ موصوف نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں عربی طب کی تاریخ پر چار لیکچر دیے تھے جو بعد میں "طب العرب" کے نام سے کتابی صورت میں چھپے۔ زیر نظر رسالہ پروفیسر براؤن کے دوسرے لیکچر کا ترجمہ ہے۔ پہلا لیکچر گذشتہ جنوری میں اُردو میں منتقل ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ مترجم صاحب ان چاروں لیکچروں کے ترجمہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پروفیسر براؤن کے نام سے مشرقی علوم کا کون طالب علم ہے جو واقف نہیں موصوف کو مشرقی علوم سے محض شغف نہیں بلکہ والہانہ عشق تھا۔ اُن کی تاریخ ادبیات ایران فارسی ادب کی بے مثل تصنیف ہے۔ خوش قسمتی ہے کہ فن طب کے عالم اور لاہور کے مشہور حاذق طبیب حکیم سید نیر واسطی صاحب کو موصوف کی کتاب "طب العرب" کے ترجمہ کا خیال ہوا۔ واسطی صاحب نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں مصنف کی غلطی پائی ہے طب کی کتابوں کے حوالوں سے اس کی تصحیح کی ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف ہے، اور مترجم کے حاشیے اُن کی محققانہ کاوش اور عالمانہ ژرف نگاہی کا پتہ دیتے ہیں۔

ناشر نے رسالہ کے کاغذ میں بخل سے کام لیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ چاروں لیکچروں کا ترجمہ مکمل کر کے اُن کو ذرا اچھے کاغذ پر کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ یہ مضمون اس قابل ہے کہ اس کو مستقل کتاب کی صورت دی جائے۔

رسالہ کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ ۔ منیجر رسالہ شمس الاطبا، بھاٹی گیٹ لاہور۔

م۔ س

اسلامی طب | (شاہانہ سرپرستیوں میں) از قاضی معین الدین صاحب رہبر فاروقی، ضخامت ۱۰۱ صفحے، کاغذ معمولی۔ کتابت وطباعت عمدہ ملنے کا پتہ :- سن برج ہاؤس، عابد بلڈنگ مصطفےٰ بازار حیدرآباد دکن قیمت عہ

"اسلامی طب" میں مسلمان بادشاہوں کے زیر سایہ طب کے نشو ونما پانے اور پروان چڑھنے کو بیان کیا گیا ہے، اسلامی حکومتوں میں طب کو شروع ہی سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے چنانچہ اسلامی روایتوں میں "علم الادیان" کے بعد "علم الابدان" کا ہی درجہ ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت

یں اس فن کو خوب ترقی دی۔ یونان، مصر اور ہندوستان کی طب کو نئی زندگی بخشی۔ شفاخانے بنائے۔ دوا سازی کے فن کو کمال تک پہنچایا۔ معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں جو عرصہ دراز تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ "اسلامی طب" میں طب کی اس طویل داستان کو نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی ضخامت، اور مصنف کی محنت کا خیال کرتے ہوئے قیمت کل عہ بہت کم ہے۔

م۔ س

ہندوستان کے مسلمان کا نصب العین کیا ہے | یہ ۳۰ صفحے کا چھوٹی تقطیع کا ایک رسالہ ہے جس میں عزیز ہندی صاحب نے مسلمانوں کے نصب العین کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ موصوف زمانہ کے بہت نشیب و فراز دیکھ چکے ہیں۔ افغانستان کے امانی انقلاب، سرزمین پنجاب کی سیاسی شورشوں اور نئے دن کے ہنگاموں، مسلمانان ہند کے عام انتشار اور بے مقصدی کے الم ناک واقعات سے متاثر ہو کر عزیز ہندی صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ کا طریق فکر مجتہدانہ ہے مگر افسوس زبان مصنف کے افکار کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہے۔ موصوف کی یہ کوشش بہر حال قابل تحسین ہے، یہ رسالہ آپ کی زیر تصنیف کتاب کا باب اول ہے۔ قیمت کل ۲۰ر اور ملنے کا پتہ پنجاب اکاڈمی امرتسر ہے۔

م۔ س

ندائے حق | شائع کردہ ینگ مینز نیشنل لیگ، ملتان شہر۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۳۲ صفحات۔ کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ:۔ ینگ مینز نیشنل لیگ، قدیر آباد ملتان شہر۔

یہ ایک اصلاحی ٹریکٹ ہے۔ پہلے یہ "پکار" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، زیر نظر نسخہ ٹریکٹ کا دوسرا ایڈیشن ہے جس میں عنوان بدل کر ندائے حق رکھا گیا ہے۔

شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی پر تبصرہ ہے، اور آخر میں "ہمیں کیا کرنا چاہیے" کے زیر عنوان چند مشورے دئے گئے ہیں۔

مقدمے میں مقدمہ نگار صاحب نے "مولویوں کے طبقے" سے خاص طور پر بحث کی ہے اور اپنی تنقیدات کا انھیں کو مرکز بنایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رشد و ہدایت کو کچھ لوگوں نے ذاتی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بنایا اور اس سے مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی پر اثر پڑا۔ لیکن صاحب مقدمہ نے جس انداز میں اس چیز کو پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ اور حد اعتدال سے بہت بڑھ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ حالت ان کی سیاسی غلامی کا نتیجہ ہے۔ مولویوں کا طبقہ اس الزام سے بڑی حد تک مبرا ہے۔

اس کے علاوہ مرض کا جو درماں صاحب مقدمہ نے تجویز کیا ہے، ممکن ہے۔ اس سے مرض کم ہونے کے بجائے اور مہلک ہو جائے۔ موصوف نے مذہب کی موجودہ مسخ صورت پر حملہ تو کیا ہے، لیکن یہ نہ فرمایا کہ اس کی اصلی صورت کے احیا کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ اصل چیز مذہب کی اصلاح ہے اور اس کی طرف سے کنارہ کشی اختیار کرکے جماعتی اصلاح کا مشورہ دیا ریت پر عمارت کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہوگا۔ ب - ع

آکسفورڈ | از فضل احمد کریم صاحب فضلی بی۔ لٹ۔ (آکسن) آئی۔ سی۔ ایس۔ تقطیع ... ضخامت ۲۱ صفحات۔ ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

فضل احمد کریم صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے تفریحی مشاغل کو نظم کیا ہے۔ نظم میں ۲۲۶ اشعار ہیں ایک کافی بڑا حصہ اردو شاعری کی تنقید کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ حالانکہ تمہیداً چند اشعار کافی تھے۔ تمہیدی اشعار میں فاضل مصنف نے کسی قدر زیادتی اور غلو سے کام لیا ہے۔

اصل موضوع پر مصنف نے ایک ہلکے طنز کے ساتھ اچھے اور رواں اشعار لکھے ہیں اور مغربی تہذیب کو اس کے اصلی روپ میں پیش کیا ہے۔ جھوٹی محبت جو نفس کی ہوس رانیوں کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہے، مغربی جمالیات کا خاص پہلو ہے، جسے مصنف نے نہایت دلکش پیرائے میں باندھا ہے۔

خاتمے پر دو شعر ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جذبۂ "حب الوطن من الایمان" کی

...ے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی ہے :۔

یہ دریا کہاں یہ کنارے کہاں ؛ یہاں کے سے واں چاند تارے کہاں

نہیں یہ کہ واں چاند تارے نہیں ؛ بہت ہیں پہ ندیا کنارے نہیں

اور یہی اس نظم کی جان ہے۔

طنزیات مانپوری | از حضرت مانپوری، متوسط تقطیع، ضخامت ۱۷۰ صفحے، مجلد، کاغذ کتابت وطباعت معمولی۔ ملنے کا پتہ :۔ ندیم گیا۔ قیمت ۱۲؍

طنزیات مانپوری کا موضوع ہمارا سماج ہے، قدیم وضع کو مغرب زدہ سوسائٹی میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن کا بیان دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مفید بھی ہے۔ مرحوم اکبر اس صنف ادب کے امام تھے۔ موصوف نے مشرق اور مغرب کے اس تمدنی تصادم کو ایک حکیم اور شاعر کی نظر سے دیکھا، اُن کی شاعری نوحہ تھی سال خوردہ مشرق کی پسپائی کا جو اُسے نوجوان مغرب کے مقابلہ میں ہوئی۔ بیشک اکبر کے زمانہ میں صرف ایک مختصر سی جماعت تھی جو مغرب کی جادوگری کی تاثیر سے اپنے آپ کو بچا سکی تھی لیکن آج ہمارا یہ حال نہیں، مغرب کا دیوالہ نکل چکا ہے، اور اس کی "مرعوبیت" بھی قصہ ماضی بن چکی ہے۔ ضرورت تھی کہ شکست خوردہ مشرق نے اس دس سال کے عرصہ میں جو کروٹ لی ہے اس کو ہمارے ادیب اور اہل قلم موضوع سخن بناتے۔ اس میں شک نہیں کہ عہد ماضی کی مرثیہ گوئی اب "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کی شکل اختیار کر چکی ہے لیکن "اکبری رنگ" کے "اقبال" کا ہنوز انتظار ہے۔

"طنزیات" میں تمدن کی موجودہ کشمکش کو ایک ظاہر بین ادیب کی نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ زبان بہت صاف اور طرز بیان دلچسپ ہے۔ ظرافت میں کہیں کہیں ہلکا پن ہے، شروع میں ۸۰ صفحے کا جو عزیز مقدمہ ہے اس کی ماہیت باوجود غور وفکر کرنے کے معلوم نہ ہو سکی۔ بحیثیت مجموعی کتاب اچھی ہے۔

م۔ س

دکن کی پری | مصنفہ حکیم ناصر نذیر صاحب فراق مرحوم تقطیع ۲۲×۱۸/۲۹ ۔ ضخامت ۷۰ صفحات قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ

کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی۔

حکیم ناصر نذیر فراق اُردو کے مشہور انشا پرداز تھے، دہلی کی ٹکسالی زبان میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ روزمرہ اور محاورے کو اس خوبی سے نبھاتے تھے کہ پڑھئے اور مزے لیجئے۔

دکن کی پری ایک تاریخی افسانہ ہے۔ اس کے کردار کا انتخاب مصنف نے دکن کی بہمنی سلطنتوں کے زمانہ عروج سے کیا ہے۔ افسانے کی ہیروئن ایک غریب سنار کی لڑکی ہے جو حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ بیجاپور کا راجکمار اُسے اپنی ہوس پرستیوں کا مرکز بنانا چاہتا تھا، مگر ایک بزرگ کی عنایات سے وہ بچ جاتی ہے، اور آخر میں شاہی حرم میں آتی ہے جہاں اس کے والدین اور خود اس کی رضا سے اس کا عقد ولیعہد سلطنت سے ہو جاتا ہے۔

افسانہ پلاٹ کے لحاظ سے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اور نہ اس سے پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر ہوتا ہے۔ مگر زبان کے اعتبار سے اسے اور دوسرے افسانوں پر فوقیت ہے۔ م۔ س

کتابت و طباعت بھی اچھی ہے، سرورق سہ رنگی بلاک کا ہے۔ اور کتاب کی معنوی حیثیت کے مناسب ہے۔

قلعہ معلی کی جھلکیاں | از عرش صاحب تیموری۔ ناشر مکتبہ جہاں نما جامع مسجد دہلی، قیمت ۸ر ضخامت ۷۲ صفحے۔

مرزا احمد سلیم شاہ صاحب عرش خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے ہیں۔ موصوف نے اپنے بزرگوں سے قلعہ معلی کے دور اقبال کی جو باتیں سنی تھیں ان کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ مصنف نے شاہی خاندان کی آداب اور شہزادوں کے طریق بود و باش کو نہایت اختصار سے لکھا ہے، یہ موضوع جتنا تفصیل طلب اور دلچسپ تھا عرش صاحب نے اس کے بیان میں اسی قدر اختصار اور بخل سے کام لیا ہے۔ اُمید ہے موصوف قلعہ معلی کی عبرت خیز داستان کو کبھی زیادہ تفصیل سے لکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

ذخیرہ ثواب اُخروی | از مولانا محمد مشتاق صاحب ناشر کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی۔

اس رسالہ میں "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ" کی عربی تفسیر اور اس کا ترجمہ درج ہے۔

کلید قرأت | از مولانا خلیل احمد صاحب

علم قرأت کی یہ ابتدائی کتاب ہے جس میں مصنف نے نہایت آسان اور عام فہم الفاظ میں عربی حروف کے مخرج بتائے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے، بچوں کو تو یہ کتاب ضرور پڑھانا چاہیئے قیمت درج نہیں۔ اور ملنے کا پتہ :- ناظر ایجنسی لکھنؤ ہے۔ م۔ س

بقیہ کتب و رسائل پر آئندہ پرچے میں تبصرہ کیا جائے گا۔

رفتارِ عالم

شمالی افریقہ | اسپین کی خانہ جنگی اور مسولینی کی سامراجی چالوں نے شمالی افریقہ کے حاکموں اور محکوموں دونوں میں بڑی بے چینی پیدا کردی ہے یوں تو افریقی عرب برسوں سے فرانس کی غلامی کے جوئے کو اٹھائے رہا اور جنگ عظیم میں اس نے فرانس کی خاطر اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے گریز نہ کیا لیکن ۱۹۱۸ء کے بعد ترکی، شام، عراق اور مصر سے بیداری کی جو لہر اٹھی وہ بحرِ ظلمات تک بڑھتی چلی گئی، چنانچہ الجزائر میں بے اطمینانی پھیلی ٹیونس کے عرب رہنما جلاوطن کئے گئے۔ مراکش میں خون کی ندیاں بہیں اور ریف میں غازی عبدالکریم نے آزادی کا جھنڈا بلند کیا۔ سامراجی حکومتیں محکوموں کی اٹھتی ہوئی قوتوں کو دبانے میں مصروف تھیں کہ اسپین میں جنگ شروع ہوگئی اور جنرل فرانکو نے عربوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، ادھر مسولینی نے برطانی اور فرانسیسی سلطنتوں کا زور توڑنے کے لئے عربوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کی حکمت عملی اختیار کی، چنانچہ طرابلس کے عربوں کو یقین دلایا گیا کہ اطالیہ عربوں میں مسیحی تبلیغ کی اجازت نہیں دے گا نیز حبش کی مسلمان آبادی کو مراعات دی گئیں، اور اہل فلسطین کی جنگ آزادی سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ مسولینی کی اس سیاست سے برطانیہ اور فرانس بدکے، برطانیہ نے مصر کو معاہدہ پر راضی کرلیا، اور فلسطینی عربوں سے صلح و صفائی کی طرح ڈالی، فرانس نے ایک طرف تو شام اور لبنان کو خوش کیا اور دوسری طرف افریقہ کے عربوں کی شکایات کو دور کرنے کی تگ و دو شروع کی، الجزائر اور مراکش کے عربوں اور فرانس کی موجودہ کشمکش کا ذکر ذرا تفصیل سے سنئے۔

الجزائر | فرانس کو اس ملک پر قبضہ کئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے، اس طویل مدت میں فرانس کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ اہل جزائر کو اپنی زبان، مذہب، تمدن اور قومیت سے بیگانہ کرکے انہیں حقیقی معنوں میں ہمیشہ کے لئے فرانس کا غلام بنادیا جائے، اس ناپاک

تجویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے عربی زبان کی ترویج و تدریس پر پابندیاں عائد کی گئیں، اصلاح پسند علماء کو دبایا گیا اور توہم پرست صوفیوں اور پیروں کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ "روشن خیال" نوجوان اپنے مسخ شدہ مذہب سے نفرت کرنے لگ جائیں اور نئی نسلیں مذہب سے عاری اور فرانسیسی تمدن کی شائق بن کر نکلیں۔ جزائری عربوں کی قومیت کو ختم کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ جو جزائری اپنی قومیت چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرے اس کے ساتھ خاص رعایتیں کی جائیں، اور اس کو اپنے حکمراں فرانسیسی کا درجہ دیا جائے، فرانسیسی قومیت اختیار کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ نکاح، طلاق، وراثت اور شخصی قوانین میں شریعت کی بجائے فرانسیسی قانون کا پابند ہو جاتا ہے، حکومت چاہتی ہے کہ اس طرح سے جزائریوں کو فرانسیسی بنا کر اس ملک سے عربی زبان، اسلامی تمدن اور عربی قومیت کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔

اہل جزائر کو فرانسیسی بنانے کی مہم کو سر کرنے کے لئے حکومت عیسائی مشنریوں کو استعمال کر رہی ہے، سرکاری خزانے سے ان کو مدرسے کھولنے اور شفا خانے قائم کرنے کے لئے رقمیں ملتی ہیں۔ حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو عربی زبان کی تعلیم اور اسلام کی تبلیغ کو روکا جاتا ہے اور دوسری طرف مسیحی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

جزائریوں کو اپنی زبان، مذہب، تمدن اور قومیت کھو کر اگر تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی مل جاتی تو شاید آج الجزائر میں بے اطمینانی اتنی نازک صورت اختیار نہ کرتی فرانس نے عربوں کو صرف اپنی زبان، تمدن اور مذہب سے محروم نہیں کیا، بلکہ اس نے ساحل کی زرخیز زمینیں اصلی باشندوں سے چھین کر فرانسیسی آبادکاروں کو دے دیں تجارت، صنعت و حرفت اور دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع پر بدیسی قابض کر دئے، جزائری مزدور بن کر رہ گیا لیکن مزدوری میں خون پسینہ ایک کر کے بھی اس کے لئے آرام کی زندگی حرام ہو گئی۔ حکومت نے "جاہل، کندہ ناتراش اور مفلس عوام" پر قانون کی خاص لاٹھی مسلط کی اور متمدن آبادکاروں کے لئے دوسرے قوانین بنائے، فرانس کی یہ حکمت عملی آخر رنگ لا کر رہی، اہل جزائر کی بے چینی کا نقشہ

فرانسیسی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے جو الجزائر کے تحقیقاتی کمیشن کا رکن تھا ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"الجزائر کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک کا ہے، موسم گرما میں تو جزائری موت کا مقابلہ کر لیتے ہیں لیکن سردی میں ہزاروں کو بھوک اور ٹھنڈ کی شدت ہمیشہ کی نیند سلا دیتی ہے، پچھلے سال بدقسمت رعایا کو فاقہ کی موت سے بچانے کے لئے حکومت نے بڑے جتن کئے، پچاس کروڑ فرانک سے زیادہ تو نقد رقم تقسیم کی گئی۔ اس کے علاوہ منوں گندم، جو اور چاول کی رسد بانٹی گئی، اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ کام پر فاقہ کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اکثر تعداد تو ان کی ہے جو کام مانگتے ہیں لیکن ان کو کام نہیں ملتا۔"

آگے چل کر رکن مذکور عرب محلوں کی بے کسی اور بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"ہم نے بہت سے ایسے شہر دیکھے جہاں سینکڑوں ہزاروں اشخاص اس طرح رہتے ہیں کہ بدن پر چیتھڑے، چہرے پژمردہ، ہڈیوں پر گوشت کا نام نہیں، مکانات خستہ، ان کی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ جب تک انسان ان کو آنکھوں سے دیکھ نہ لے کبھی باور نہ کرے، دیکھنے کو تو بڑے بڑے شہر ہیں لیکن مکانات سب کے سب ٹین اور تختوں کے جو غلاظت اور تعفن کے مرکز ہیں، اس گندگی میں ننگے بھوکے بچوں کے غول کے غول پلتے ہیں، جب صفائی کی یہ حالت ہو تو الجزائر جیسی اچھی آب و ہوا میں ہزاروں بچوں کا اندھا اور دق میں مبتلا ہونا کوئی تعجب کی بات ہے؟"

فرانس کی صد سالہ حکومت کی یہ برکات ہیں جو اہل جزائر کو دنیا کی سب سے بلند دعویٰ کرنے والی جمہوریت سے ملی ہیں، حیرت تو یہ ہے کہ جزائریوں کی بدحالی کا اعتراف کرنے کے بعد رکن مذکور ان کی شورش اور بے چینی کا ذمہ دار چند شوریدہ سر اور فتنہ پسند لیڈروں کو ہی گردانتا ہے، فرانسیسی آباد کاروں کی محنت نے الجزائر کی ساحلی زمینوں کو واقعی بہشت بنا دیا لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ بہشت بنانے والے جزائری کاشتکار کے لئے اس میں جگہ ہے یا نہیں۔ گو اہل جزائر نے اب تک صبر سے کام لیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تباہ حالی نے انہیں احتیاجات کی بجائے اب گولیوں

سے کام لینے پر آمادہ کر دیا ہے، رکن مذکور لکھتا ہے کہ " اوران " کے ضلع میں شورشوں اور بلووں کا زور ہے، جلسوں میں پستولوں اور طمنچوں کا علی الاعلان مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایک اور مقام پر تحقیقاتی وفد کے جانے سے کچھ دیر پہلے موٹروں کے جلوس میں اسلحہ کی نمائش کر کے اہل جلوس نے اپنے مطالبات کے حق بجانب ہونے کا نمایاں طور پر اعلان کیا!

اہل جزائر فرانس کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے بھی مخالف ہیں، اگر فرانسیسی آباد کار ہر وقت عربوں کے حملوں سے پریشان رہتے ہیں تو یہودی تاجر بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی دکانوں پر بیٹھتے ہیں۔ اہل جزائر کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ان کی تمام مصیبتوں کا سبب فرانس ہے اور ان کے ہم وطن یہودی اس کے حلیف ہیں۔

فرانس نے اہل ملک کی بے چینی کو دور کرنے کے لئے عربوں کو جزائر کی اسمبلی میں ابھی ابھی اپنے نمائندے بھیجنے کا حق دیا ہے لیکن مرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ بقول رکن موصوف ان تدبیروں سے اس کا علاج ممکن نہیں، عوام روٹی چاہتے ہیں، اور زمانہ ہوتا تو حکومت روٹی کی بجائے گولہ اور بارود برساتی لیکن اب وقت بدل گیا، فرانس اہل جزائر کو کچل کر خود اپنی جان سلامت نہیں رکھ سکتا، آزادی اور غلامی کی اس کشمکش میں بظاہر تو آزادی کی جیت یقینی نظر آتی ہے۔

سلسلہ بیان میں ایک بات رہ گئی، فرانس نے پچھلے سالوں میں عرب قومیت کو ختم کرنے کی یہ تدبیر کی کہ اہل جزائر کو یہ طمع دیدی کہ اگر وہ عرب قومیت کی بجائے فرانسیسی قومیت اختیار کر لیں تو انھیں حکمرانوں کے حقوق دئے جائیں گے، ایک طبقہ نے اس پیشکش کو قبول کر لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ قوم نے ان کا بائیکاٹ کر دیا، ان کے مُردوں کو اپنے قبرستانوں میں دفن ہونے سے روکا اس پر حکومت نے اپنے وفاداروں کا ساتھ دیا۔ نوبت کشت و خون تک پہنچی، الغرض اہل جزائر کی سخت مخالفت کی وجہ سے یہ تحریک تقریباً مردہ ہو چکی ہے اور اب تک بیس پچیس ہزار جزائری جو فرانسیسی قومیت میں داخل ہو چکے ہیں ان کی جان بھی عذاب میں ہے۔

مراکش | سنہ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور برطانیہ کے درمیان مراکش کے متعلق ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی

ہ سے اول الذکر کو مراکش میں اپنی سیادت قائم کرنے کا حق دیا گیا، فرانس نے سلطنت کے نظم ونسق کو تو اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن "امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین" یعنی سلطان مراکش کی ذات گرامی کو باقی رکھا، دوسرے لفظوں میں حکم اور اختیار تو فرانسیسی ہائی کمشنر کو دیا گیا اور نام سلطان کا رہا۔ الجزائر کی طرح مراکش میں بھی اہل ملک جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، شروع میں جلوسوں اور اجتماعات تک معاملہ رہا لیکن فرانسیسیوں کی سختی سے تحریک آزادی روز بروز زیادہ قوت پکڑتی گئی اور باتوں اور تقریروں سے نوبت بلوؤں اور خونریز معرکوں تک پہنچ گئی، فرانس نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے اہل مراکش کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔

مراکش میں دو نسلوں کے مسلمان آباد ہیں۔ ایک تو عرب ہیں جو زیادہ تر ساحلی علاقوں میں اقامت گزیں ہیں اور دوسرے بربر ہیں جو اندرون ملک اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ عرب بیشتر تعلیم یافتہ ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے۔ لیکن بربر عربی زبان سے ایک حد تک بیگانہ اور اسلامی تمدن سے بہت کم متاثر ہیں، فرانس نے بربروں کو عربوں کے خلاف اکسایا اور انھیں عربی زبان، عربی تمدن اور اسلامی قومیت سے قطعی طور پر الگ کرنے کے لئے بربری قومیت کا خیال پیدا کیا۔ بربروں کی آبادی میں عربی زبان کی درسگاہیں بند کر دی گئیں، مسلمان واعظوں اور مدرسوں کو بربروں تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ اب تک بربر اسلامی قانون کے تابع تھے۔ فرانس نے شرعی عدالتیں منسوخ کر کے ان کی جگہ فرانسیسی قانون نافذ کیا، ان سلبی کوششوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی مشنریوں کو بربروں پر ریل دیا گیا۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں بربری آبادیوں میں پھیل گئے ہیں اور مدرسے اور شفاخانے بنا کر بربروں کو اپنے حلقہ اثر میں کر رہے ہیں۔

فرانس کے اس اقدام سے مراکش میں بڑی بے اطمینانی پھیل چکی ہے، نہ صرف یہ کہ عرب اس قانون کے خلاف ہیں بلکہ بربر بھی فرانس کے ان الطاف کو استحسان کی نظروں سے نہیں دیکھتے، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ کسی نہ کسی شہر میں ہنگامہ نہ ہوتا ہو، فرانس بری طرح رعیت کو دبا رہا ہے

لیکن بے چینی کم ہونے کی بجائے برابر بڑھ رہی ہے، مراکش کی اس صورت حال نے اسپین کی خانہ جنگی کی وجہ سے اور بھی نازک حالت اختیار کر لی ہے مراکشی عرب دیکھتے ہیں کہ ان کے پڑوسی فرانکو کی فوج میں بھرتی ہو رہے ہیں، اسپین کے ماتحت علاقہ میں جرمنوں نے باقاعدہ فوجی مدرسے کھول رکھے ہیں جہاں عربوں کو فوجی تعلیم دی جا رہی ہے، پچھلے دنوں یہ خبر ملی تھی کہ بہت سے مراکشی سرحد عبور کر کے اسپینی علاقہ میں جا رہے ہیں۔ ان حالات نے فرانس کو بہت پریشان کر دیا ہے، اب کوشش ہو رہی ہے کہ مراکشیوں کو دم دلا سا دے کر خوش کیا جائے اور فرانکو اور ہٹلر کے اثر سے ان کو مامون کر دیا جائے۔ عربی جرائد "الجزائر" اور "شہاب" سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ میں ہٹلر کو خاص طور پر ہردلعزیزی حاصل ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب یہودیوں سے تنگ ہیں اور ہٹلر کی یہود دشمنی ان کے دل کو لگتی ہے، دوسرے فرانس کے بیر نے ان کو اس کے دشمنوں کا دوست بنا دیا ہے۔

عراق | ایک سال ہونے کو آیا کہ عراق کے فوجی افسروں نے کابینہ کے ارکان کو توپ و تفنگ کی زور اثر سنطق سے قائل کر کے استعفے دے دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے عراق کی سیاسی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، عہد فیصلی کے پرانے گھاگ سیاسین یا تو گولی کا نشانہ بنے یا انھوں نے عراق سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ ہاشمی پاشا جو عراق کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور شاہ فیصل کے عہد حکومت میں اس کا شمار انگریز دشمن اور انتہا پسند سیاست دانوں میں ہوتا تھا غدار وطن قرار دیا گیا اور بیچارے کی بے کسی کی شرم خدا نے دیار غیر میں وطن سے دور موت دے کر رکھ لی، موت کے بعد نئی حکومت نے مرحوم کے لاشے کو وطن میں جگہ دینے سے انکار کر دیا، عسکری پاشا جیسا جہاں دیدہ سیاستداں ایک فوجی کے ہاتھوں قتل ہوا، نوری پاشا جو شاہ فیصل کا دست راست اور برطانی عراقی معاہدہ کا بطل تھا روپوش ہو کر موت سے بچ سکا۔ پرانے زمانے کے بااثر سیاسین نوجوان عنصر کی جرأت سے دم بخود ہو کر بیٹھ گئے اور کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔

اس فوجی انقلاب کا ہیرو کرنل باقر صدقی تھا، وزارت کا قلمدان سلیمان حکمت کو دیا گیا۔

نوآموز نوجوان نے تدبیر مملکت میں غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا چنانچہ انقلابی وزارت کے حسن انتظام کی داد برطانی اخبار "ٹائمز" تک نے دی، بظاہر عراق کی فضا سکون بخش معلوم ہوتی تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ یہ نوجوان حکومت کی کشتی کو کھینے میں مشاق ناخدا ثابت ہوں گے لیکن اچانک "رائٹر" کی اطلاع ملی کہ کرنل باقر صدقی کو موصل کے ہوائی اسٹیشن پر کسی سپاہی نے قتل کر دیا۔ دوسرے تیسرے دن خبر آئی کہ سلیمان حکمت نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا، اور نئی وزارت مرتب ہو گئی۔

تفصیلات کا ہنوز انتظار ہے امید ہے آئندہ پرچہ میں اس پر مفصل بحث ہو سکے گی۔

مصر | مصر کے نوجوان تاجدار ملک فاروق کی رسم تاج پوشی ۲۹ جولائی کو مصری پارلیمنٹ میں ادا کی گئی، اس تقریب میں مصری حکومت سے زیادہ مصری رعایا نے خلوص اور جوش عقیدت کا مظاہرہ کیا، شیخ الازہر مصطفیٰ مراغی چاہتے تھے کہ تاج پوشی کی تقریب کو مذہبی مراسم کے ساتھ منایا جائے لیکن وفد پارٹی کے صدر موجودہ وزیر اعظم نے یہ کہکر ٹال دیا کہ شاہ فاروق صرف مصری مسلمانوں کے بادشاہ نہیں بلکہ عیسائی بھی ان کی رعایا میں سے ہیں، بہر حال شیخ الازہر نے یہ کیا کہ تاج پوشی کے دن عشار کی نماز شاہ فاروق کو جامع ازھر میں پڑھائی اور ایک سادہ سی تقریب کے بعد قرآن کریم اور بخاری شریف کا ایک ایک نسخہ شاہ موصوف کی خدمت میں پیش کیا۔

مصری اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ وفد بادشاہ کی ہر دلعزیزی سے زیادہ خوش نہیں فواد مرحوم کے زمانہ میں قصر شاہی اور "بیت الامۃ" یعنی صدر دفتر وفد پارٹی میں برابر تصادم رہا۔ اب وفد کو خطرہ ہے کہ ان کے مخالفین شاہ فاروق کی ہر دلعزیزی کی آڑ میں وفد کو گرانے کی کوشش نہ کریں۔ وفد سے اب مذہبی طبقے عام طور پر خوش نہیں ہیں۔ نحاس پاشا اور ان کے ساتھیوں کی قبطیت پرستی سے بعض جماعتیں پہلے بھی نالاں تھیں لیکن اب مسلمان عوام کے کان بھی وفدیوں کی بعض حرکات سے کھڑے ہو رہے ہیں، شاہ فاروق نوجوان ہیں، ان کے والد تو زمانہ کے بہت سے رنگ دیکھ چکے تھے، اس لئے دھڑا بندیوں اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے

ڈاکر اپنا کام نکالنا خوب جانتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ہر موقعہ پر برطانی ریذیڈنٹ کا مشورہ اُن کے شامل حال رہتا تھا، لیکن اب حالت بالکل بدل گئی ہے، انگریزی دخل ختم ہوگیا، وفد والے برسرِاقتدار آگئے، اور بادشاہ ناتجربہ کار ہے، اگر قصرِ شاہی اور وفد میں صلح وصفائی سے کام چلتا گیا تو خیر ہے ورنہ بادشاہت اور جمہوریت میں ٹکر ناگزیر ہوجائے گی۔

مصری اخبار "المصور" لکھتا ہے کہ حکومت کو اپنی حلیف سلطنت سے ہدایت ملی ہے کہ جنگی تیاریوں کی رفتار کو تیز کردیا جائے، مصری طرابلس کی سرحد کو خاص طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کی دھڑا دھڑ فرمائشیں انگلستان پہنچ رہی ہیں، بازاری گپوں کا لذیذ ترین موضوع آئندہ جنگ بن گیا ہے۔ م - ہما

ترکی | ترکی حکومت نے حال میں اوقاف کے متعلق ایک قانون پاس کیا ہے، جس کی رُو سے اب تمام اوقاف متولیوں کے زیرِ انتظام رہیں گے، البتہ یہ متولی وزارت اوقاف کو جوابدہ ہوں گے، اور متولیوں کو ملکی ضروریات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اس ضمن میں مناسب ہے کہ ہم اوقاف کے پچھلے انتظامات پر ایک سرسری نظر ڈال لیں۔

سلاطینِ ترکی کے زمانہ میں تین طرح کے اوقاف تھے، ایک وہ جو کلیتہً متولیوں کے ہاتھ میں تھے اور سلطنت کی ان پر کوئی نگرانی نہیں تھی، دوسرے وہ جن کا انتظام تو متولی ہی کرتے تھے لیکن وزارت اوقاف ان کی نگراں تھی، اور تیسرے وہ جن کا اہتمام براہ راست وزارت کے سپرد تھا، جمہوریہ ترکیہ نے پہلی قسم کے اوقاف تو بالکل ختم کردئے تھے، یعنی تمام اوقاف وزارت کے ہاتھ میں دے دئے تھے۔ اس وقت تک کوئی ، ہزار اوقاف وزارت کے اہتمام میں تھے، جن کی ہ فی صدی آمدنی وزارت کے دفتری اخراجات پر صرف ہوتی رہی ہے۔

وزارت کی طرف سے ایک جنرل ڈائرکٹر تمام اوقاف کا ذمہ دار تھا اور اس کا تعلق براہ راست وزیرِاعظم سے تھا، جنرل ڈائرکٹر کے ماتحت متعدد ڈائرکٹر تھے، جو ملک کے تمام اوقاف کی دیکھ بھال کرتے تھے، باوجود اس کے کہ اوقاف کی جائدادوں کا ایک بڑا حصہ ملک کے داخلی محکموں، تعلیم اور

...پلٹیوں کو دیا گیا ہے مگر پھر بھی ان کی آمدنی نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے، ملک کی تمام مسجدوں کے علاوہ کئی ہزار عمارتیں، ...تین لاکھ ایکڑ جنگلات، تین لاکھ ساٹھ ہزار زیتون کے درخت، دس میدان، شاہ بلوط کے درختوں کے ۱۲ باغات، دو سو سے ...زیادہ سبزیوں کے باغ، چار ہزار کے قریب میدان، کانیں اور تقریباً دس ہزار جائدادیں اس وقت وزارت کے پاس ہیں۔

شروع میں تمام اوقاف اپنے متولیوں کے زیر انتظام تھے، اس کے بعد کچھ کو وزارت اوقاف نے ...اپنی نگرانی میں لے لیا اور بعض جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بالواسطہ وزارت کی نگرانی میں رہے یعنی انتظام متولیوں کا تھا اور نگرانی وزارت کی۔ غیر مسلم اقلیتوں کی جائدادیں بھی اوقاف میں شمار ہوتی تھیں لیکن ان کا انتظام منتخب کمیٹیوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا، جن کا انتخاب اقلیتیں الگ الگ کرتی تھیں۔

اقتصادی اعتبار سے ۱۹۳۶ء ترکی کے لئے بہت مبارک سال رہا۔ فصلیں بہت اچھی ہوئیں، مقدار بھی زیادہ رہی اور پھر قیمت بھی زیادہ اٹھی، بہت سے پیداواروں کا نفع بالخصوص گیہوں اور تمباکو کا، ۱۹۳۵ء کی نسبت بہت زیادہ رہا۔ اور یہی نہیں کہ زراعت غیر معمولی طور پر اچھی ہوئی بلکہ معدنیات نے بھی بہت ترقی کی، یہی وجہ ہے کہ ترکی حکومت نے اب "معدنیات" کو "قومی" بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے، یعنی اب غیر ملکی کمپنیوں کو اس کا اجارہ نہیں دیا جائے گا اور ملک میں انفرادی تاجر بھی ان سے نفع طلبی نہیں کر سکیں گے۔

اس سال ۲۵۰ کیلومیٹر ریل کی لائن تیار کی گئی، اس وقت ترکی کے قبضہ میں ۶ ہزار ۲ سو بیاسی کیلو میٹر ریلوے لائن ہے، حکومت نے طے کیا ہے ۱۹۳۷ء کے لئے عثمان بینک سے ۵ فیصدی سود پر روپیہ قرض لے لیا جائے۔

ترکی تجارت کی خوشحالی کا اندازہ کرنے میں ذیل کے نقشہ سے مدد ملے گی۔

غیر ملکی تجارت	برآمد	۱۱۷،۷۳۳،۰۰۰	ترکی پونڈ	۱۹۳۶ء
	"	۹۵،۸۶۱،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء
	درآمد	۹۲،۵۳۱،۰۰۰	"	۱۹۳۶ء
	"	۸۸،۸۲۳،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء

فاضل برآمد	۲۵٬۲۰۲٬۰۰۰	ترکی پونڈ	۱۹۳۶ء
//	۰٬۰۳۸٬۰۰۰	//	۱۹۳۵ء

اس نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کی برآمد بڑھ رہی ہے اور درآمد کو حکومت کم سے کم کر رہی ہے صرف دو سال کے اندر اندر درآمد کے مقابلہ میں برآمد کا یہ اضافہ حیرت انگیز ہے۔

مالیات عامہ کی حالت اس سال بھی نہایت اطمینان بخش رہی حکومت نے اس سال کوئی نیا محصول عاید نہیں کیا، اور نہ کسی ضروری مد کا روپیہ کم کیا اس کے باوجود ۳۶-۱۹۳۵ء کے میزانیہ میں ایک بہت بڑی رقم فاضل بچی۔

ترکی حکومت نئی آبادی میں اضافہ کے لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت معلوم ہوتی ہے، اس وقت یورپ میں عام طور پر شرح پیدایش کم ہو رہی ہے لیکن ترکی میں شرح پیدائش (روس کے بعد) سب سے زیادہ ہے، ۱۹۲۶ء میں شرح ۲ر۱۴ فی ہزار تھی اور ۱۹۳۵ میں ۲ر۱۷ فی ہزار۔

ایران | اس سال کا میزانیہ کئی مہینے ہوئے پارلیمنٹ پاس کر چکی ہے، اس میں گذشتہ سال کی نسبت دو سو پچاس ملین ریال اضافہ ہوا ہے جو پونڈ کے حساب سے تین ملین سے کچھ زیادہ (اکتیس لاکھ ۵۲ہزار پونڈ) ہوتے ہیں۔ کل میزانیہ ۱۲۵۰ ملین ریال یعنی ایک کروڑ چھپن لاکھ بیس ہزار پونڈ کے قریب ہے (انگریزی ایرانی تیل کمپنی کی سالانہ رقم جو دو ملین پونڈ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اس میں شامل نہیں ہے) ریلوے اور فوج کے شعبوں کے لئے اس دفعہ بھی بھاری بھاری رقمیں رکھی گئی ہیں۔ ایران کی کل فوج اس وقت ۲۹ ہزار ہے، جس میں ۱۲ ہزار محفوظ فوج ہے۔

انگریزی ایرانی تیل کمپنی، حکومت ایران کو جو سالانہ رقم ادا کرتی ہے، اس کو حکومت کے سالانہ میزانیہ میں شامل نہیں کیا جاتا بلکہ محفوظ میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور دوران سال میں جس مد میں کمی پڑتی ہے؟ یا کسی نئے خرچ کے لیے اس رقم میں سے روپیہ لیا جاتا ہے، اس سال اس محفوظ رقم میں سے ۶ ملین پونڈ جنگ کی مد میں خرچ کیا گیا (بجٹ میں ۲۵ ملین پونڈ منظور ہوئے تھے یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ کل آمدنی کا ½ ہے) اور ۵۰ لاکھ ریل میں صرف کئے گئے اور ۸ لاکھ شکر فیکٹری میں لگا یا گیا۔

آمدنی کی سب سے بڑی مد تو اجارہ ہے جس سے ہر سال کم از کم ۵۰ ملین تومان مل جاتے ہیں،
اس کے علاوہ ۱۰ ملین کسٹم سے وصول ہوتا ہے اور ۱۸ لاکھ ٹیکس سے (۹ لاکھ بلاواسطہ ٹیکس اور ۹ لاکھ
بلاواسطہ) اس کے علاوہ جرمانہ بھی آمدنی کی ایک معقول مد ہے یعنی ۱۰ لاکھ تومان (تقریباً ۲ لاکھ پونڈ)
کا سرکاری خزانہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۳۱ء ایک قانون کے ذریعہ تمام غیر ملکی تجارت حکومت ایران کا اجارہ قرار دی
گئی ہے۔ مذکورہ بالا ۵۰ ملین تومان (تقریباً ۲۵ لاکھ روپئے) ان ہی اجاروں سے ملتے ہیں۔

پچھلے دنوں شاہ ایران نے ترکستان سے خلیج ہند تک دورہ کیا۔ اس دورہ میں ملک کی
زرعی، صنعتی اور حرفتی حالات کا بغور مطالعہ فرمایا۔ ایران کی صنعت جس نے پچھلے دس سال میں ترقی کی
بہت سی منزلیں بہ یک طے کر ڈالیں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ریشم، چمڑا، شیشہ اور قالین کا کام
بڑے زور سے ہو رہا ہے، اور زراعت اس وقت صنعت و حرفت سے بھی آگے آگے ہے۔ زراعت
میں نئے نئے آلات اور جدید طریقوں سے کام لیا جا رہا ہے اس لئے روئی اور غلہ کی کاشت خوب ہو رہی
ہے، روئی اور تمباکو کی کاشت پر براہ راست حکومت کی نگرانی ہے اس لئے یہ اور ترقی کر رہے ہیں،
روئی کاتنے اور کپڑا بننے کی مشینیں بھی کھل گئی ہیں، اور روئی کی زراعت میں حکومت بڑی دلچسپی کا
اظہار کر رہی ہے، ملک کے ذمہ دار لوگوں کا خیال ہے کہ زراعت میں لگایا ہوا روپیہ زیادہ بارآور ہو رہا ہے۔
صنعت و حرفت اس کی نسبت کم مفید ثابت ہو رہی ہے، اس لئے اس سال صنعتی جوش و خروش میں
کمی ہو گئی ہے، صنعت و حرفت کے بہت سے سرکاری اور نجی پروگرام منسوخ کر دئے گئے ہیں، اور ساری
توجہ زراعت پر مرکوز ہو گئی ہے، روئی، گیہوں، چاول اور گنے کی زراعت میں بیش از بیش مدد دی جا رہی ہے۔
گیہوں کی زیادہ مقدار اب بھی جرمنی کو جاتی ہے، روئی کی بڑی مقدار تو روس لے لیتا ہے باقی
کو جرمنی ہاتھوں ہاتھ لے جاتا ہے، ملک کی ضروریات کے بعد جتنا چاول بچتا ہے اُسے بھی روس خرید لیتا
ہے۔ شکر کے کارخانوں میں گنے کی موجودہ مقدار ناکافی ہوتی ہے۔ ایران میں بے کاری اور بے روزگاری
کا نام و نشان نہیں ہے۔

ایران بیرونی مصنوعات کی درآمد کو کم کرنے میں لگا ہوا ہے، سنہ ۱۹۲۳ء میں ۵۶ لاکھ سے زیادہ روسی تیل ایران میں آیا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۳۶ء میں ۵۰ ۴۴ لاکھ ہی رہ گیا ہے۔ عام درآمد جس میں لوہے کی مصنوعات اور زراعتی مشینیں وغیرہ ہیں ابھی روس سے آرہی ہیں۔ روس کی کل برآمد ایران میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ سالانہ کے قریب ہے۔

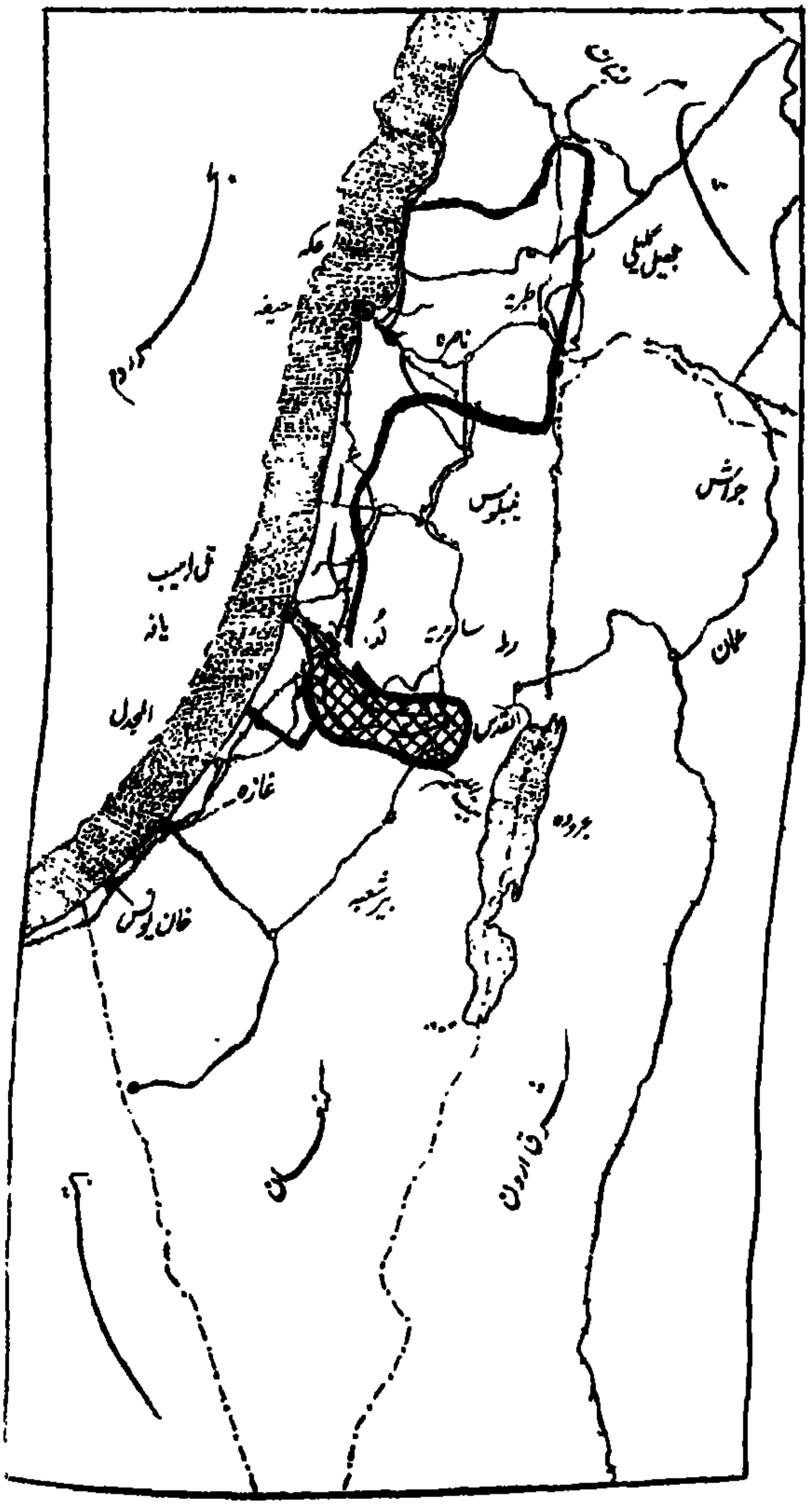
آج کل ایران میں جرمن بڑھ رہے ہیں، تبریز جو ایران کے بڑے شہروں میں دوم نمبر کا شہر ہے اور روسی سرحد سے ۸۰ میل ہے یہاں کے مغربی باشندوں میں نوے فیصدی جرمن ہیں، اور خود پایۂ تخت (طہران) میں بہت سی جرمن کمپنیاں، کارخانے اور دوکانیں ہیں۔ کل ایران میں کوئی بارہ سو جرمن ہیں۔

انگریزی ایرانی تیل کمپنی نے اس سال اسی لاکھ ٹن سے زیادہ تیل نکالا، جس سے پچانوے لاکھ پونڈ کے قریب نفع ہوا۔ یہ نفع گذشتہ سال کی نسبت ۳۵ لاکھ پونڈ کے قریب زیادہ ہے، عراق کے تیل کا ٹھیکہ بھی اسی کمپنی کے پاس ہے اس سال تک ان دونوں جگہ سے نوے کروڑ ٹن تیل نکالا جاچکا ہے۔

<u>فلسطین</u> | شاہی کمیشن کی رپورٹ مدت ہوئی شائع ہوچکی ہے اور حکومت برطانیہ نے ان سفارشات کو منوانے کا بھی فیصلہ کرلیا ہے اس لئے کہ برطانیہ کے نزدیک مسئلۂ فلسطین کا اس سے بہتر کوئی حل ہو نہیں سکتا۔ ان سفارشات کی رُو سے فلسطین کے زرخیز اور اہم ترین ساحلی علاقہ کے مالک یہودی ہوں گے، معمولی اور بنجر سا علاقہ عربوں کو دیا جائے گا۔ اور "بیت المقدس" شہر برطانیہ کی تحویل میں رہے گا۔ عربوں پر یہ کیا کم ظلم ہے کہ ان کے ملک کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے جائیں، غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ساحل کا تمام عمدہ علاقہ، ساری زرخیز زمینیں، اور پھر خود قبلہ اول، بیت المقدس کا شہر ان سے چھین لیا گیا، یہ ہے صلہ ان تمام وفاداریوں کا جو عربوں نے اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے کی تھیں۔ خود شاہی کمیشن کو اعتراف ہے کہ "جنگ عظیم میں اتحادیوں کی کامیابی کو عرب اپنی کمل آزادی سمجھے ہوئے تھے اور یہی ولولہ ان کو جنگ میں ہمت دلا رہا تھا"۔ جہاں تک برطانوی وعدوں کا تعلق ہے ہم عربوں سے

س خیال کو بے جا نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ شریف حسین نے بالتفصیل حدود کا حوالہ دیکر سر ہنری میکموہن کو یہ لکھا تھا کہ وہ کل جزیرۂ عرب کی آزادی چاہتے ہیں، اور اسی شرط پر اتحادیوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ میکموہن نے اپنے دوستانہ خطوط میں حدود کے مسئلہ کو قبل از وقت کہہ کر ٹال دیا لیکن یہ بہرحال طے تھا کہ عربی ممالک جس میں نجد و حجاز، عراق و شام شامل ہیں آزاد کر دئے جائیں گے۔ فلسطین ترکی حکومت میں شام میں شامل تھا اس لئے لازماً اس کے معنی یہ تھے کہ فلسطین بھی آزاد ہوگا۔ سر ہنری میکموہن کا خط تو آج تک شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا، شاید رموز حکومت نے اس کی اجازت نہ دی، لیکن یہ سب کو اقرار ہے کہ جزیرۂ عرب میں سے صرف وہ علاقے مستثنیٰ تھے جن کی آبادی واکثریت) غیر عرب ہے یعنی اڈانا اور حلب وغیرہ۔ شریف حسین کو اگرچہ یہ کاٹ چھانٹ بھی منظور نہ تھی لیکن بہرحال دلیل معقول تھی کہ ان علاقوں کی آبادی عرب نہیں ہے مگر فلسطین میں تو اس وقت بھی ۸۰ فیصدی عرب آباد تھے، اُسے کس طرح علیحدہ قرار دیا جا سکتا تھا؟ شریف حسین کو جزیرۂ عرب کی کمل آزادی کا یقین دلانے کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان کچھ رازکی باتیں شروع ہوئیں اور انھوں نے آپس میں ایک خفیہ معاہدہ کر کے شمالی عرب (شام و عراق) کو اپنے درمیان تقسیم کرلیا اور اتحادیوں کے مذہبی جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے" بیت المقدس کے لئے طے ہوا کہ اسے" ترکی حکومت سے علیحدہ کر کے آپس (فرانس، برطانیہ، روس) میں سے کسی ایک کو دیدیا جائے۔ اور بقیہ عرب'' عرب حکومت کے لئے چھوڑ دیا جائے"

ایک ہی علاقہ کے لئے یہ دو معاہدے تھے، اسی لئے دوسرا معاہدہ خاص طور پر پردہ راز میں رکھا گیا، اور ۱۹۱۷ء تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، مگر گھر کے بھیدی روس نے راز فاش کردیا۔ انہی دنوں یعنی نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے یہودیوں سے بات چیت شروع کی، اور اس کا نتیجہ' اعلان بالفور' کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس میں" فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور اس سلسلہ میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا گیا" اور ساتھ ہی ساتھ فلسطین کی غیر یہود آبادی کو یہ اطمینان بھی دلادیا گیا کہ" ان کی مذہبی، اور معاشرتی حقوق بالکل محفوظ ہوں گے" مسٹر لائڈ جارج نے


عکہ
حیفہ
طبریہ
ناصرہ
نیبلوس
جراش
تل ابیب
یافہ
لد
رملہ
القدس
عمان
المجدل
غازہ
بحر مردہ
بیر شبعہ
خان یونس
شرق اردن

اس وقت برطانیہ کے وزیراعظم تھے اس سلسلہ میں کمیشن کو بیان دیا ہے کہ "یہودی رہنماؤں نے ہم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر اتحادی فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن بنانے میں خاطرخواہ مدد کریں تو وہ اپنی تمام کوشش اتحادیوں کی حمایت میں صرف کریں گے۔ مسٹر لائڈ جارج پوری ایمانداری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں ان معاہدوں میں تضاد ہے اور وہ غریب اس طوفان حوادث کا ذکر بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ وعدے کئے گئے تھے

"اہل رومانیہ پس چکے تھے روسی فوج میں اضمحلال و بددلی پیدا ہو چکی تھی، فرانسیسی فوج اس وقت بسیط پیمانہ پر جارحانہ کارروائی کی اہل نہ تھی۔ اطالوی کیپو ریٹو کے مقام پر شکست کھا چکے تھے۔ جرمنی کی آبدوزکشتیاں برطانیہ کے بے شمار جہازوں کو غرقاب کر چکی تھیں، امریکہ سے کوئی فوج اس وقت تک فرانس نہیں پہنچی تھی"

لیکن یہ "قومی وطن" کیا چیز ہے، اس سے کیا مراد ہے، آیا یہودیوں کی مستقل حکومت یا محض آزادی سکونت، اس کی تشریح میں بھی شاہی کمیشن نے مسٹر لائڈ جارج سے بڑی چاہی تھی، موصوف نے ارشاد کیا، ہم فلسطین میں فوراً ہی تو کوئی یہودی ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے، اور یہ بغیر کثرت آبادی کی رائے کے ہو بھی کیسے سکتا تھا، لیکن ہاں یہ تھا کہ اگر یہودی .... وہاں اکثریت حاصل کرلیں تو فلسطین ایک یہودی ریاست بن جائے گا۔ لائڈ جارج جس چیز کو آج بھی صاف نہیں کہنا چاہتے وہ اُن کے سیاسی رفقا نے اسی زمانہ میں علی الاعلان کہہ دی تھی، مسٹر ولسن صدر جمہوریہ امریکہ جیسے ذمہ دار شخص کی زبان سے اتحادیوں کے ارادہ اور وعدہ کا اظہار اس طرح ہوا۔

"اتحادیوں نے ہماری حکومت اور ہماری قوم کی پوری موافقت کے ساتھ یہ منظور کر لیا ہے فلسطین میں یہودی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے گا" جنرل اسمٹس (برطانوی ساوراج کی جنگ کے رکن) نے جوہانسبرگ میں ایک تقریر میں فلسطین کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا "آنے والی نسلوں کے لئے ایک عظیم الشان یہودی حکومت تختۂ ارض پر وجود میں آنے والی ہے۔"

اگر ان صاف باتوں میں بھی کوئی ابہام پایا جاتا ہو تو اُن الفاظ کو کیا معنی پہنائے جا سکتے ہیں جس میں خود لارڈ بالفور نے یہ احسان جتاتے ہوئے کہ اتحادیوں نے "ظالم و جابر ترکوں" کی صدیوں کی غلامی سے عربوں کو آزاد کیا ہے' اور عراق کی حکومت خود اختیاری کا راستہ صاف کر رہے ہیں۔ فرمایا تھا کہ ہم ان کی زمین کا ایک' ناخن بھر' ٹکڑہ لے لیں تو کیا غضب ہو جائے گا۔

اوپر شاید یہ ذکر نہیں آیا ہے کہ برطانیہ نے اُس رقبہ کو بھی مستثنیٰ قرار دیا تھا جسے وہ" فرانس کو نقصان پہنچائے بغیر کسی کو نہیں دے سکتا " اس فقرہ کے متعلق ڈاکٹر ٹوئنبی اسٹارڈ نے لکھا ہے کہ " یہ فقرہ بلاشبہ انگریزی تاش کا " جوکر' تھا مگر اس سے مقصد حاصل ہوگیا۔ عرب چونکہ خفیہ معاہدہ سے ناواقف تھے انھوں نے یہ تصور کیا کہ یہ استثنا لبنان کے محدود ضلع سے تعلق رکھتا ہے وہ خوش خوش بغاوت کی تیاری کے لئے گھر واپس آئے اور دوسرے سال بغاوت ہوگئی "

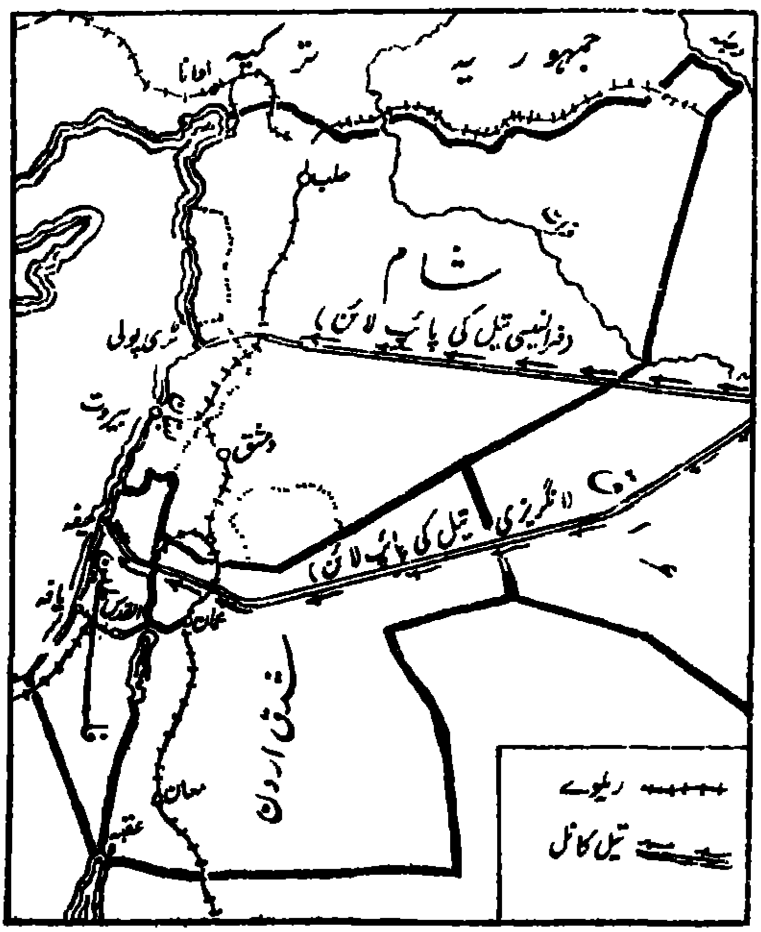
حقیقت یہ ہے کہ فلسطین کا فیصلہ آج سے بیس بائیس سال پیشتر ہی کیا جا چکا تھا، محض عربوں کو دھوکہ دینے کے لئے یہ حقیقت زیر نقاب رکھی گئی۔ اور اسی لئے ہنری میکموہن کے خط کو دنیا سے چھپایا گیا اور اسی لئے عربوں کو' شام' کی آزادی کا نام لے کر فلسطین کے جزئی خیال سے باز رکھا — حتیٰ کہ ۱۸ء میں فرانس اور برطانیہ نے صلح کے بعد عربوں کی تسکین کے لئے جو بیان شائع کیا اس میں بھی عراق اور شام وغیرہ کی تدریجی دستوری ترقی کا تصریحی وعدہ کیا اور فلسطین کو گول کر دیا۔ اور صرف قومی وطن' کی مبہم اصطلاح سے ۲۲ء تک یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ " ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہودیوں کو عربوں پر مسلط کر دیا جائے " اور چونکہ بالفور اعلان میں یہودیوں کی مراعات اہل فلسطین کے تحفظات کے ساتھ مشروط کی تھیں' اس لئے عربوں کے لئے بے چینی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ۲۰ء میں شریفی معاہدہ کے صریحاً خلاف' جب عراق شام اور فلسطین پر انتداب کا دیو مسلط کر دیا گیا تو عرب اس عجیب و غریب' آزادی' کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور اغیار کی بدنیتی نے انھیں خوفزدہ کر دیا۔ دفتر نوآبادیات نے ان کی حیرانی کو کم کرنے کے لئے پھر ایک' اطمینان بخش' بیان شائع کیا جس میں عربوں کو یقین دلایا کہ ہم نہ فلسطین کو بالکل یہودی بنانا چاہتے ہیں اور نہ خدانخواستہ وہاں عربوں کے تمدنی اور معاشرتی اثر کو کوئی صدمہ پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں"

عربوں کے اطمینان کے لئے یہ بیان کافی نہیں تھا، انگریزوں کے خلاف عام بے چینی پیدا ہوگئی ہنگامے اور فسادات شروع ہوئے جن کی تحقیقات کیلئے ۱۹۲۹ء میں مسٹر شاکی صدارت میں ایک کمیشن فلسطین پہنچا۔ اس کمیشن نے اگرچہ فسادات کی علت غائی یہ نہیں بتلائی کہ عرب برطانیہ پر اعتماد نہیں رکھتے لیکن یہ دیکھ کر کہ ذومعنین بیانات سے اب کام چلنا مشکل ہے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ "وہ صاف لفظوں میں اپنی پالیسی کا اعلان کرے۔ اور ۱۹۲۲ء کے اعلان کو از سر نو مستحکم کردے۔ یعنی یہ کہ انتداب میں یہودیوں کو جو مراعات حاصل ہیں وہ کسی درجہ میں بھی ان کو حکومت کے کام میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتیں" اس کے جواب میں وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ نے 'صاف لفظوں' میں پالیسی کا اظہار فرمایا "کہ ہم ہر جماعت کے ساتھ پورے عدل سے کام لیں گے اور ۱۹۲۲ء کے عہد کو پورا کریں گے"۔ انتداب کمیشن لیگ کے اجلاس میں شا رپورٹ اور اس بیان پر بڑی لے دے ہوئی اور انتداب کمیشن نے غیر معمولی جرأت کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ "فلسطین کی بے چینی کی اصل وجہ یہ ہے کہ برطانیہ نے اہل فلسطین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا' اور شا کمیشن کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ اس تصادم کو برطانیہ کی مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ فلسطین کے آخری فسادات سے متاثر ہوکر شاہی کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ اس نے "بیس سال کے پرانے جزئی واقعات" کی تحقیق کو گڑے مردے اکھاڑنے کے برابر سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن پھر بھی اس "افسوسناک حقیقت" کا اقرار ہے کہ،

"لڑائی کی ضرورتوں کی وجہ سے حکومت برطانیہ شریف حسین کو صاف صاف اپنے ارادوں سے مطلع نہ کرسکی۔ آپ دیکھیں گے کہ سر ہنری میکموہن کے خط مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں فلسطین کا واضح ذکر نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس سے پہلے کوئی خاص اشارہ کیا گیا تھا۔ بعد کی خط و کتابت میں شریف حسین اور سر ہنری میکموہن کے درمیان صرف بیروت اور حلب کے متعلق اختلاف تھا۔ شریف حسین نے اس بات پر زور دیا کہ یہ علاقے خالص عرب ہیں اور جب ہنری میکموہن نے فرانسیسی مصالح کی طرف توجہ دلائی، تو شریف حسین نے جواب دیا کہ اگرچہ وہ شمال میں اپنی حقیت سے

دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں، تاہم وہ سر دست برطانیہ اور فرانس کی باہمی مخالفت کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ اور فرانس کے مطلوبہ علاقوں (بیروت اور لبنان کے ساحلی علاقے) کے متعلق مزید گفت و شنید جنگ کے خاتمہ پر ملتوی کرنا مناسب خیال کرتا ہے۔"

یہی "افسوس ناک حقیقت" اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ برطانیہ اور شریف حسین میں فلسطین کے معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن ان تمام وعدوں کے باوجود فلسطین کا یہ حشر کیوں ہوا اس پر پچھلے سال ۱۹ جون کو پارلیمنٹ کے ایک معزز ممبر نے روشنی ڈالی تھی "مدافعت کے لحاظ سے فلسطین کی مقامی حیثیت نہایت اہم ہے، یہ گویا کیلفم جنکشن (لندن کا سب سے بڑا ریلوے جنکشن) ہے



ایک ایسے مقام پر واقع ہے، جو انگلستان، افریقہ اور ایشیا کے ہوائی راستوں کا مرکز ہے۔ بحر روم کے جدید حالات نے اس کی بحری حیثیت کو حد درجہ اہم بنا دیا ہے قبرص، فلسطین اور نہر یہ اگر مضبوطی کے ساتھ قبضہ رکھا جائے تو اس سے نہ صرف نہر سوئز کو کھلا رکھنا ممکن ہوگا بلکہ تمام مشرقی بحر روم پر بھی قبضہ رہ سکے گا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حکمبرداری کی رو سے ہم فلسطین میں بحری مرکز قائم کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ تاہم اگر حیفہ کو ترقی دے کر بحر روم کا ایک زبردست بندرگاہ اور تجارتی مرکز بنا دیا جائے نیز اس کو تیل کی فراہمی کا ایک بڑا منبع قرار دیا جائے تو جنگ کے زمانہ میں جب ہمیں کہیں اور سے تیل نہیں مل سکے گا، اس علاقہ کے نتائج نہایت اہم ہوں گے"۔

اس تقریر سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ فلسطین کے موجودہ حل میں یہودیوں کے وعدہ کا اتنا دخل نہیں ہے جتنا برطانیہ کے ذاتی مفاد کو، مسئلہ بیت اللحم اور دیوار گریہ کا نہیں بلکہ ان سے زیادہ مقدس شے "لار جسٹ پائپ لائن" کا ہے، ورنہ یہود کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ ان کو اگر کہیں پناہ ملی، تو مسلمانوں ہی کے سایہ میں ملی ہے، یہی یہود تھے جو اسلامی اسپین میں حکومت کے مشیر و وزیر تھے، ترقی کی ہر راہ ان پر کھلی ہوئی تھی، اسی طرح مصر میں ان کو ترقی کا پورا موقع دیا گیا اور خلافت راشدہ میں تو یہ حال تھا کہ خلیفہ وقت کے ذاتی مقدمات یہودیوں کے حق میں فیصل ہو جاتے تھے، آج بھی یہود ٹیونس، الجیریا اور عراق میں مسلمانوں کے ساتھ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فلسطین کو اگر دینی حیثیت سے دیکھا جائے تو کون نہیں جانتا کہ انجیل اور توریت کے نام لیوا ازل سے ایک دوسرے کے پیغمبروں کے دشمن ہیں، اور صرف مسلمان ہی ہے جس کے دل میں ان دونوں مقدس پیغمبروں کا یکساں احترام موجود ہے، اور جس طرح آج بھی "قیامہ" کا کلید بردار مسلمان ہے فلسطین کا واقعی محافظ بھی مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمان کا اثر وہاں گوارا کیسے ہو جب کہ "وہ (فلسطین) سلطنت برطانیہ میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کا اہم نقطہ ہے" اور اُن کے نقطۂ نظر سے یہ دیکھتے رہنا ضروری ہے کہ وہاں کسی ایسی قوم کو آباد ہونے اور اپنی قومیت کو عظیم الشان ترقی دینے کی اجازت نہ دی جائے جو بالآخر ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو" (کرنل کلفش براؤن ممبر پارلیمنٹ)

اسی لئے یہودجیسی غیر سیاسی قوم کو دنیا سے لالاکر اس ساحل پر بسایا گیا ہے، اور اس خیال سے کہ کہیں یہ کچھوا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے عربوں اور یہودیوں کے درمیان میں خود بدولت اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے ہیں۔ یہودیوں اور عربوں میں برابر چلتی رہے اور بیت المقدس کے مذہبی محافظ پنچ کی حیثیت سے دونوں کے سرپرست ہوں، فلسطین کا ساحل دنیا کی اس مذہبی خدمت کے عوض ان کے اثر میں رہے، اور دنیا کے مذہبی احساسات کی خاطر تکلیفیں جھیلنے والی سلطنت کے جہازوں کو آسانی سے تیل ملتا ہے۔ غریب یہودی بھی بس ایک بہانہ ہیں، اور ان کے سردار ڈاکٹر وائس مان نے ایک دوسرے سلسلہ میں سچ کہا تھا کہ "یہودی ہمیشہ ہی بہت اچھا بہانہ ثابت ہوئے ہیں"!

مویشیوں کی نسلی اصلاح | لارڈ لنلتھگو نے جب سے ہندوستان کی وائسرائی کا چارج لیا ہے، ملک کی زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ذیل میں موصوف نے ہندوستانی زراعت کے اس پہلو پر خاص زور دیا ہے جو قوتِ محرکہ اور حیواناتی مصنوعات سے متعلق ہے یعنی مویشیوں کی اچھی نسل کا رواج۔

ہندوستان اپنے طبعی ماحول کی بنا پر ازمنۂ قدیم سے ایک زراعتی ملک رہا ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی کچھ پیچھے نہ تھا، اور ایک زمانے میں اس کی مصنوعات کا دنیا کی منڈیوں پر قبضہ تھا، مگر اس کا خاص پیشہ زراعت ہی رہا ہے۔

زراعت کے لئے جہاں طبعی ماحول اور زمین کی زرخیزی لازم ہے، وہاں قوتِ محرکہ بھی ایک ضروری جزو ہے۔ یہاں قدیم زمانے سے آج تک قوتِ محرکہ مویشیوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر بیل اور بھینسے اس کام کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر بیلوں کا حصہ نسبتاً زیادہ اور اہم ہے۔ ہل چلانا، کنوئیں سے پانی کھینچنا اور پیداوار کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا سب کام بیلوں سے لئے جاتے ہیں۔

ہندوستانی معیشت میں مویشیوں کی اہمیت کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو جائیگا۔
یہ اعداد ۲۵-۱۹۲۴ء کے ہیں۔

برطانوی ہند میں:۔

زراعت میں کام آنے والے مویشیوں کی کل تعداد ... ۱۵۹۹۳۵۰۰۰

بھیڑوں اور بکریوں " " ... ۶۱۱۵۷۰۰۰

دیگر مویشی مثلاً گھوڑے، گدھے، خچر اور اونٹ " ... ۳۸۰۱۰۰۰

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ مختلف صوبوں میں ہر ۱۰۰ ایکڑ مزروعہ زمین پر مویشیوں کی تعداد کا اوسط کیا ہے اور ہر ۱۰۰ نفوس پر اوسط تعداد کیا ہے۔

	مویشیوں کا اوسط تعداد	
	ہر سو ایکڑ مزروعہ زمین پر	ہر سو نفوس پر
اجمیر میرواڑہ	۱۴۴	۸۶
آسام	۱۰۰	۶۹
بنگال	۱۰۸	۵۲
بہار و اڑیسہ	۸۸	۵۷
بمبئی	۳۸	۶۰
برما	۳۴	۴۲
سی پی و برار	۵۶	۸۹
کورگ	۱۰۰	۸۴
دہلی	۷۵	۲۴
مدراس	۷۵	۵۳
سرحدی صوبہ	۵۰	۴۴
پنجاب	۶۰	۶۷

آبادی کی اکثریت کی نظر میں گائے کو جو مذہبی حیثیت حاصل ہے وہ دراصل اسی اہمیت کا نتیجہ ہے۔ برطانوی حکومت تاجروں کی حکومت ہے، اس نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ ملک کی حالت میں کم سے کم دخل دے کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ لیکن کسان کی حالت درست کئے بغیر تجارت کو فروغ دینا بھی دشوار تھا۔ اس لئے ہوتے ہوتے ادھر کچھ توجہ شروع کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۰ء سے پیشتر یہاں کی اقتصادی زندگی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن کے عہد میں زراعت کو فروغ دینے کے لئے کچھ کوشش کی گئی تھی۔ مگر یہ کوشش ابھی ابتدائی منزل میں تھی۔ صرف ایک مرکزی ادارہ بہار کے صوبے میں پوسا کے مقام پر جدید سائنٹفک زراعتی تجربات کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جس میں نئے نئے بیجوں اور زمین کی مختلف صلاحیتوں کا تجربہ کیا گیا تھا۔ تجربہ کامیاب دیکھ کر سنہ ۱۹۰۵ء میں زراعتی تحقیق کی از سرِ نو تنظیم کی گئی۔ اس میں ایک مرکزی تجربہ گاہ کے بجائے صوبہ جاتی اداروں کے قیام کی ضرورت تسلیم کی گئی اور بڑے بڑے صوبوں میں زراعتی ادارے کھولے گئے۔ سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد کبھی کبھی جزوی تبدیلیاں اور اضافے ہوتے رہے۔ کوئی بنیادی اور اہم اضافہ نہ ہوا۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۲۶ء میں زراعت کی تحقیقات کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر کیا گیا، اس کمیشن کے صدر لارڈ لنلتھگو صاحب تھے۔ اس کمیشن کی رپورٹ میں مویشیوں کے متعلق نہایت سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ اور اس کی طرف خاص توجہ دینے کی سفارش کی گئی تھی۔

لارڈ لنلتھگو نے اپنے دورِ حکومت کا آغاز زراعت کے اسی پہلو کی اصلاح سے کیا ہے، اس تحریک کی بنیاد مندرجہ ذیل مقاصد پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ مویشیوں کی اہلیت کارکردگی بڑھانا۔

۲۔ حیواناتی پیداوار اور مصنوعات کی تنظیم۔

ظاہر ہے گایوں اور بیلوں کی موجودہ نسل نہایت خراب ہے۔ بیل چھوٹے ہوتے ہیں، تھوڑے کام میں تھک جاتے ہیں اور کسان کو کام ادھورا چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اس لئے مجبوراً اس کو کئی جوڑیاں

بھی پڑتی ہیں۔ پھر ان جوڑیوں کے علاوہ اس کے یہاں گائیں اور بھینسیں بھی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے چارے کے لیے مستقل انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ چارے کے لئے زمین کی کمی کے سبب وہ مستقل کھیت وقف نہیں کر سکتا، اس لئے غلے کے کھیتوں سے جو کچھ چارہ ملتا ہے وہ سب کا سب بیل کھا لیتے ہیں گایوں اور بھینسوں کو چرنے پر قناعت کرنی پڑتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دودھ اور گھی وافی مقدار میں پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ نسل ہی معقول پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ چھوٹی نسل کے مویشی کھاتے بہت ہیں۔ رائل کمیشن کی رپورٹ میں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل سائنٹفک نتیجے نکالے گئے ہیں:-

> یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جس قدر چارہ ایک سو چھوٹے بیلوں کے لئے درکار ہوگا، اتنا ہی پچاس دو گنے قد وقامت کے بیلوں کے لئے بھی ہوگا۔ مویشی جس نسبت سے نسل میں خراب اور چھوٹے قد کے ہوتے ہیں، اسی نسبت سے ان کی خوراک بڑھ جاتی ہے۔

اس تحریک میں جہاں بیلوں کی نسل پر زور دیا جا رہا ہے، وہاں اچھے قسم کے چارے کے انتظام کی طرف بھی خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ اور ذاتی چراگاہ یا چارے کے لئے کھیت بنانے کے بجائے اس امر پر زور دیا جا رہا ہے کہ ہر گاؤں یا کئی گاؤں مل کر ایک مشترک چراگاہ کا انتظام کریں اور اسے ہرا بھرا رکھنے کے لئے معقول محنت اور سرمایہ لگایا جائے۔ اس سلسلے میں چارے کے لئے کھتیاں بنانے، چارے میں غذائیت کا جزو بڑھانے کے لئے تجربات ہو رہے ہیں اور اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ یہاں بھی مویشی اور چارے کا انتظام انھیں اصولوں پر چلایا جائے جن پر کاربند ہو کر آسٹریلیا اور کنیڈا اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کرتے ہیں حالانکہ وہاں کام کرنے والے مویشیوں کی اتنی کثرت نہیں ہے، جتنی ہندوستان میں ہے۔

تحریک کا دوسرا رخ مویشیوں کے ذریعے ملک میں دودھ مکھن کے کاروبار کو فروغ دینا ہے دودھ گھی کی جتنی مقدار اچھی ذات کی گایوں اور بھینسوں سے حاصل ہوتی ہے، چھوٹی ذات کی گایوں اور

بھینسوں سے نہیں ہوتی۔ پنجاب میں اچھی ذات کی گایوں اور بھینسوں کے پالنے کا رواج ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے پہلے ہوا ہے۔ یہاں نہروں اور دریاؤں کی کثرت کے سبب چارے کا انتظام بھی قدیم چلا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دودھ اور گھی کی جتنی کثرت اس صوبے میں ہے، دوسرے صوبوں میں نہیں ہے۔ چھوٹی ذات کی گائیں بچہ دینے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک سال تک دودھ دیتی ہیں وہ بھی دودھ کی مقدار کچھ تو انکی ذات کی خصوصیت کی وجہ سے اور کچھ چارے کا انتظام اچھا نہ ہونے کے باعث دوسرے تیسرے مہینے سے کم ہونی شروع ہو جاتی ہے، اور آخر میں چل کر ان میں ایک پاؤ کر لے کر آدھ سیر تک دودھ رہ جاتا ہے۔ دودھ کی کمی کا اثر بچھڑے پر بھی بہت برا پڑتا ہے۔ وہ دن بدن دبلا ہوتا چلا جاتا ہے، اور عین شباب کے زمانے میں بھی محنت سے جی چراتا ہے۔

اچھی نسل کی گائیں پالنے کے رواج سے ایک طرف محنتی اور بڑے بڑے بیل حاصل ہوں گے، دوسری طرف دودھ مکھن کثرت سے ہوگا، اس لئے ملک کی ضروریات سے جو بچ رہے گا ان کی برآمد سے قومی دولت میں اضافہ ہوگا۔ کنیڈا، ڈنمارک، آسٹریلیا اور امریکہ سے دودھ کی مصنوعات کی درآمد اس بات کی شاہد ہے کہ اس ایک شعبہ سے کتنا روپیہ ہندوستان سے باہر چلا جاتا ہے، حالانکہ دودھ دینے والے جانور یہاں ان ملکوں سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ملکی ذرائع پیداوار کا بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ بصورت خام ہندوستان میں ہر چیز موجود ہے، صرف تنظیم اور چاہئے زراعتی تنظیم کا موقع وائسرائے کی تحریک سے ہاتھ آیا ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

<u>تحریک کی رفتار</u> اس تحریک کو ایک سال کا زمانہ ہوا ہے۔ اور لوگ بھی (وہ خواہ سرکاری افسران ہی کیوں نہ ہوں) اس کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔ گذشتہ مئی میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ایک آل انڈیا اجلاس شملہ میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں ہر صوبے کے نمائندے شریک ہوئے تھے، اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ تحریک حیوانات کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر بنانے اور اس کا اثر گاؤں تک پہنچانے کے لئے مزید تدابیر پر بحث کی جائے۔

وائسرائے نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ قابل غور ہیں۔

آپ نے فرمایا تھا۔

"یہ امر محتاجِ تشریح نہیں کہ ہندوستان کی زراعت کا تمام انحصار مویشیوں پر ہے۔ اس لئے کہ قوتِ محرکہ کے حصول کی مویشیوں کے علاوہ ہندوستان میں اور کوئی سبیل نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کی زراعت کو فروغ دینے کے لئے مویشیوں کی نسلی اصلاح سے بڑھ کر اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔"

زراعت کے تحت میں مویشیوں کی اہمیت جتانے کے بعد وائسرائے نے اس تحریک کا اقتصادی اور تجارتی پہلو کو بھی واضح کیا۔

"ہندوستان کی سالانہ آمدنی میں مویشیوں کے ذریعے کم وبیش تیرہ ارب روپیہ آتا ہے۔ اس میں مویشیوں کی محنت، ڈیری کی مصنوعات، کھاد وغیرہ سب اجزا شامل ہیں۔ یہ محض ایک اندازہ ہے مگر اس سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بحالت موجودہ مویشیوں کا وجود کس قدر اہم اور پیداآور ہے۔ آج آپ لوگ جہاں مویشیوں کی نسلی اصلاح کی تحریک کی کامیابی کے ذرائع تجویز کرنے کے لئے آئے ہیں وہاں آپ کے سامنے بہت سے ضمنی مسائل بھی آئیں گے جو بظاہر اقتصادیات سے متعلق ہوں گے مگر ان کی اصل مویشیوں سے ملتی ہو گی۔ مثلاً بھیڑ بکری کی پیداوار، اون کی پیداوار، چمڑے اور ہڈی کی صنعت اور گھوڑوں کی اچھی نسل پیدا کرنا۔ وغیرہ جن کا تعلق ملک کی قومی دولت سے بہت گہرا ہے۔"

تحریک کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا اثر مرکز سے نکل کر صوبوں تک پہنچنا چاہئے۔ اور اصل میدان تو صوبے ہی ہیں، اس لئے کہ عوام اور کسانوں کا تعلق جتنا قریبی صوبوں اور ضلعوں سے ہے، مرکز سے نہیں ہے۔ مرکز کا کام تو متعدد صوبوں میں باہم تبادلۂ اطلاعات کا انتظام کر دینا اور گاہے بگاہے صوبائی تحریکوں کو ایک جگہ پر جمع کر دینا ہے۔ آخر میں آپ نے آئندہ کے لئے امید کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"آخر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے پہلے الفاظ پھر دہراؤں کہ ہم کسان کی بھلائی اس سے بڑھ کر اور نہیں کر سکتے کہ مویشیوں کی اصلاح کے لئے قدم اُٹھائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے صحیح راہِ عمل اختیار کی اور ہماری پالیسی صحت نیت پر ہوئی تو ہم بہت جلد کامیاب ہوں گے۔ اور آگے چل کر کسانوں کا طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا۔"

وائسرائے کی تقریر کے بعد جناب سر جگدیش پرشاد صاحب کی صدارت میں کانفرنس میں صوبوں کے نمائندوں نے اپنے صوبے کے تجربات پیش کئے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف اسکیمیں پیش کیں۔ ان تمام اسکیموں میں قدر مشترک چیز یہ تھی کہ صوبوں میں مویشیوں کی تحریک کے لئے فنڈ کھولا جائے اور صوبے کے وزیر زراعت کی صدارت میں محکمۂ اصلاح مویشیان قائم کیا جائے۔ اس محکمے کا کام یہ ہو کہ مشترکہ فنڈ سے اچھے نسل کے بیل خریدے۔ اور ان کے ذریعہ اپنی نگرانی میں ہر ضلع میں اچھی نسل کے گائے بیل کی پیدائش کا انتظام کرے۔

یہ محکمہ اسی ضمن میں حتی المقدور مشترک چراگاہوں کے قیام کی کوشش بھی کرے گا۔ اور اچھے چارے کی کاشت کا رواج بھی بڑھائے گا؛ جو اچھے نسل کے مویشیوں کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔

وائسرائے کی یہ تحریک جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ہندوستانی زراعت کے لئے نہایت مبارک ہے۔ مگر اس کی کامیابی بڑی حد تک مشروط ہے، اور اگر اس کی طرف خلوص نیت سے توجہ نہ کی گئی اور کارآمد ذرائع اختیار نہ کئے گئے تو بقول مسٹر کھاپرڈے چند ایکڑ زمینوں میں تو اچھے موٹے اور جاندار بیل نظر آجائیں گے۔ مگر کاشتکاروں کی آبادی بالکل محروم رہ جائے گی۔ ہندوستان کا کسان اَن پڑھ ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز کی اہمیت سمجھ بوجھ کر تسلیم نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ جب وہ اچھے موٹے تازے گائے بیل دیکھے گا تو اُسے تحریص ضرور ہوگی، مگر یہ جذبہ ممکن ہے اس کے اندر مستقل نہ رہے۔ اس باب میں کسانوں کی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا تو اثر بھی اس تحریک کا پائدار ہوگا، اور اس کی کامیابی میں وقت بھی کم صرف ہوگا۔

کسان غریب بھی ہے، اچھی نسل کے جانور خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں۔ اس لئے ان کی خریداری میں اسے سہولتیں بھی بہم پہنچانی چاہئیں۔ امداد باہمی کے بنک اس باب میں کسانوں کی خاصی مدد کرسکتے ہیں۔

تحریک بہ حیثیت مجموعی مفید ہے، مگر ہندوستان کے لئے کوشش فلاح کا محض ایک رخ ہے۔ دنیا میں آج کل زراعت و صنعت جب تک دوش بدوش نہ چلیں کوئی ملک کما حقہ ترقی نہیں کرسکتا۔ حکومت برطانیہ کی پچھلی پالیسی دیکھئے تو یہ رہی ہے کہ ہندوستان کو انگلستان کی مشینوں کے لئے اشیاء خام کی فراہمی کے لئے استعمال کیا جائے۔ زراعت کو فروغ دینے میں بھی یہ حکمت مضمر ہے کہ کسان کی قوت خرید بڑھے تو برطانوی مال کی کھپت اس منڈی میں زیادہ ہو۔ اس لئے اس یک رخی تحریک فلاح کو دیکھ کر جہاں خوشی ہوتی ہے، اور امید بندھتی ہے وہاں ایک گونہ تشویش بھی ہوتی ہے کہ ؎

ہم تک کب ان کی بزم میں آیا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں — ب۔ع

کانگریسی وزارتیں | ہندوستان کے چھ بڑے صوبوں میں کانگریس نے کئی مہینہ سوچ بچار اور بحث مباحثہ کے بعد وزارتیں قبول ہی کرلیں۔ قانون ساز مجلس کے جلسے بھی ہوچکے۔ جمہور کی طرف سے مجالس کے افتتاح کے وقت ہر جگہ جو مظاہرے ہوئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں بالکل نئی بات تھے۔ پہلی مرتبہ ان مجالس کو جمہور نے اپنے فلاح اور بہبود کے ادارے جانا اور جو مناظر پہلے قومی جلسوں میں دیکھنے میں آتے تھے وہ قانون ساز مجالس کی عمارتوں کے باہر اور اندر دکھائی دیئے۔ جلوس، ہجوم، جیکارے، بندے ماترم، غرض وہی قومی جلسوں کا سا جوش، وہی خلوص، وہی عقیدت — اور کہیں کہیں وہی بے ترتیبی! یہ ہونا چاہئے بھی تھا اور ہو بھی چکا، لیکن حکومت کا کام محض جوش اور عقیدت اور بے ترتیبی سے انجام نہیں پاتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے غور و فکر اور تدبیر کی۔ جس جوش کا مظاہرہ جمہور کی طرف سے ہوا ہے اس سے وزارتوں کی ذمہ داری بڑھتی ہے، ان توقعات کا پتہ چلتا ہے جو جمہور کو ان سے ہیں، ان کے کاموں میں جمہور کی طرف سے تعاون کا وعدہ بھی مل گیا

مضر ہے، مگر فکر اور تدبیر کا فرض بہر حال وزارتوں کے ذمہ رہتا ہے۔ ان کی کامیابی اب اس سے نہیں جانچی جا سکتی کہ کسی وزیر کا اسٹیشن پر کس شان سے استقبال ہوا، کیسا جلوس نکلا، یا انھوں نے کیسی دل ہلانے والی تقریر کی۔ اب کامیابی کا معیار یہ ہوگا کہ ان کی تدبیر سے صوبہ کی خوشحالی میں کیا اضافہ ہوا، کتنے بھوکوں کے پیٹ بھرنے کی سبیل نکلی، کتنے بے کاروں بے روزگاروں کو کام ہاتھ آیا، کتنے بیماروں کے علاج کی اور کتنے تندرستوں کو بیماری سے بچانے کے لئے حفظ ماتقدم کی تدابیر کی گئیں کتنے ان پڑھ جاہلوں کے لئے لکھنے پڑھنے کا اور اپنے آس پاس کے معاملات کو سوچنے سمجھنے کے قابل بنانے کا سامان کیا گیا، غریب کے لئے انصاف حاصل کرنے میں کیا سہولتیں پیدا کی گئیں، رشوت کا بازار کس حد تک سرد پڑا، گاؤں اور شہر کے درمیان حمل ونقل کے ذرائع میں کیا ترقی ہوئی، صوبہ کی آبادی کے مختلف حصوں میں جو بے اعتمادیاں ہیں وہ کہاں تک مٹیں، قوم کی معاشی اور سیاسی ترقی کی طرف سے جو مایوسیاں یا شبہے ہیں وہ کہاں تک کم ہوئے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی اس طرح جانچی جائے گی کہ جب یہ عنان حکومت ہاتھ سے دیں گے اس وقت ان کا صوبہ پہلے سے زیادہ خوشحال ہوگا یا بدحال، اور آزادی کی طرف اعتماد کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ ہوگا یا اس تجربہ کی وجہ سے اس میں کچھ جھجک پیدا ہو جائے گی۔

اس معیار پر پورا اترنے کے لئے ان وزارتوں کو بڑے مالی وسائل درکار ہوں گے اور قابل آدمی افلاس، بیکاری، بیماری، جہل باتوں سے نہیں مٹائے جا سکیں گے۔ آدمیوں کا حال یہ ہے کہ جتنے اعلیٰ عہدہ دار ہیں، جنھیں ان وزارتوں کے دست و بازو سمجھنا چاہئے ان پر زیادہ تر انگریز پہلے سے متمکن ہیں، ان کے جملہ حقوق قانوناً محفوظ ہیں، انھیں کوئی مشکل ہی سے چھو سکے گا۔ عہدہ داروں کا فرض تو یہ ہے کہ وزارت وقت کے احکام کی تعمیل کریں اور یہ عہدہ دار بھی تعمیل ضرور کریں گے۔ مگر تعمیل تعمیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جب حکومت کے مقاصد کے باب میں وزارت اور اس کے عملہ میں ایسا بنیادی اختلاف ہو جیسا کہ اندیشہ ہے کہ موجودہ وزارت اور اس کے عملہ میں ہو سکتا ہے، اور پھر وزارت کو اس عملہ کی برطرفی، یا ان کی تنخواہ میں اضافہ و تخفیف کا حق بھی نہ ہو تو وزارت کے بہت سے منصوبے

ں ہی سے تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں یہ مشکل بھی حل ہو جائے تو وسائل کا معاملہ ہے۔ کانگریس جن چیزوں کا
مت سے وعدہ کرتی رہی ہے ان کو پورا کرے تو وسائل اور کم ہوتے ہیں۔ کسان پر لگان کم کرے تو
ندار سے مالگذاری کم وصول ہوگی، شراب کی فروخت بند کرے تو آبکاری کی آمدنی ہاتھ سے
ے گی۔ مصارف میں تخفیف کرکے اس کمی کی تلافی ہو سکتی تھی، تو بڑے تنخواہ دار ملازموں کی
ہیں گھٹانے کا حق ہی نہیں ہے۔ چھوٹوں پر مشقِ تخفیف سے کیا حاصل ہوگا۔ فوج، ریلیں،
ل اور تار، محاصل، یہ سب مرکزی حکومت کے تحت ہیں ان میں نہ خرچ کم کرنے کا اختیار ان
توں کو ہے نہ ان سے آمدنی بڑھانے کا۔ بعض ملکوں میں وسائل بڑھانے کے لئے حکومت
ج کی مقدار بڑھاتی ہے، سو اس کا اختیار بھی صوبجاتی حکومتوں کو نہیں، سیاست، زرگری بھی
زی حکومت کا حق ہے! قومی تعمیر کے کام اگر اٹھائے گئے تو غالباً صوبائی حکومتوں کو قرض لینا
ا، اور ان اغراض کے لئے قرض لینا مالیاتی اصول سے غلط بھی نہ ہوگا، لیکن یہاں بھی گورنر بہادر
ر جنرل کی خوشنودی شرط ہے!

اس سے یہ تو واضح ہوگیا کہ جو بنیادی مسائل کسی قومی حکومت کو حل کرنے چاہئیں ان کے
کی توقع موجودہ قومی وزارتوں سے کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ قانون دستور کے
نجہ میں جکڑی ہوئی ہیں اور وہ انھیں قدم قدم پر روکے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر دوسرے ایسے
وزارتیں انجام دیں جس سے جمہور کا اعتماد ان پر قایم رہے تو ان معاملات میں وزارت کی ناکامی
ے دستور کو بدلوانے کا مطالبہ قوی ہوگا اور حرکت آزادی میں قوم ایک قدم اور آگے بڑھنے کو
ہو گی۔

مگر اس بے بسی کے باوجود جس کا ہم نے ذکر کیا یہ وزارتیں کس طرح جمہور کا اعتماد قایم رکھ
تی ہیں؟۔ ایک تو یوں کہ آزادی کے لئے کام کرنے والوں کو محض آزادی خواہ ہونے کے جرم
جو تکلیفیں، اور سزائیں اٹھانی پڑتی تھیں ان کو ختم کرادیں۔ آزاد خیال اشخاص پر، طالب علموں پر،
باروں پر، جو زیادتیاں پچھلے زمانہ میں ہوتی رہی ہیں، خفیہ پولیس کی تاک جھانک سے انھیں جو حرج

تنگ کیا جاتا رہا ہے، اس کا سد باب ہو جائے۔ اس سے آزادی اور سچی خدمت قومی کی قوتیں اور ولولے ترقی کریں گے۔ اور جب دستور کی بنیادی خامیوں کی وجہ سے اس کا چلانا ممکن نہ رہیگا تو یہ قوتیں کام دیں گی۔ پھر یہ وزرا اپنی شخصی مثال سے اور اپنے حکم سے اس کا اہتمام کر سکتے ہیں کہ سرکاری عہدہ دار اپنے کو قوم کا خادم سمجھیں۔ یہ ممکن ہونا چاہئے کہ اب لوگ پولیس کے پاس شکایت لے جانے سے اس لئے نہ ڈریں کہ خود مصیبت میں پھنس جائیں گے اور عدالت میں اس وجہ سے نہ جانا چاہیں کہ قدم قدم پر رشوت دیتے دیتے اپنے مطالبہ سے زیادہ زیر بار ہو جائیں گے۔ خفیہ پولیس کا رخ آسانی کے ساتھ سیاسی جلسوں کی طرف سے موڑ کر عدالتوں کی جانب کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہاں یہ بھی اس رشوت کے "قومی ادارہ" سے تمتع نہ کرنے لگیں!

یہ سودیشی کی تحریک کو، قومی تعلیم کے کام کو، دیہات سدھار کی کوششوں کو، جنھیں ابتک غیر سرکاری قوتیں انجام دیتی رہی ہیں اپنی تھوڑی سی توجہ سے بہت پھیلا سکتے اور بہت مضبوط کر سکتے ہیں۔ اگر وسائل کی کمی خود حکومت کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ ان کاموں کو پوری طرح خود انجام دے تو شاید اچھا ہی ہے، بہتر یہی ہے کہ یہ کام غیر سرکاری طور پر انجام پائیں اور دفتریت کی مرجھانے والی ہوا سے دور ہی رہیں، مگر حکومت کی ہمدردی اور توجہ سے ذرا زیادہ آسانی کے ساتھ فروغ پا سکیں۔

یہ وزارتیں باوجود وسائل کی کمی کے یہ کر سکتی ہیں کہ اپنے زمانہ اقتدار میں اپنے صوبہ میں ان آزادی دشمن افراد اور جماعتوں کے زور کو توڑ دیں جو گاؤں گاؤں اور شہر شہر قوم کی گردن پر تسمہ پا کی طرح مسلط ہیں۔ یہ وزارتیں ہمدرد ماہروں کی مدد سے اپنے صوبوں کی زراعتی، صنعتی، تعلیمی، ضرورتوں کی کلی تحقیق کرا سکتی ہیں جن کے بغیر وسائل ہاتھ آجانے کے بعد بھی کوئی پائدار تبدیلی کرنا ممکن نہ ہوگا اور سب سے زیادہ یہ کہ یہ وزارتیں اپنے عمل سے اس بے اعتمادی کو بہت کچھ کم بلکہ ختم کرانے میں مدد دے سکتی ہیں جو ملک کے ہندو مسلمانوں میں باہم اس وقت پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس کہ صوبجات متحدہ میں کانگریس اور مسلم لیگ میں وزارت کے معاملہ میں سمجھوتہ کی کوششیں ناکام رہیں، ورنہ حکومت کے

۔، بارمیں ان دونوں جماعتوں کا تعاون اس بے اعتمادی کے رفع کرنے میں بہت کچھ مدد دیتا۔ مگر یہ
ہیں کہ اس کے مواقع ختم ہو گئے۔ ہر روز ایسے مواقع پیدا ہوں گے کہ وزارت اپنے عمل سے اس
ے عتمادی کو کمزور اور بالآخر مٹانے کی کوشش کر سکے گی۔ لیکن یہی مواقع اگر صحیح طور پر استعمال
۔ سکے گئے تو بے اعتمادی کو بڑھا بھی سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا' تو وزارتوں کے سامنے
شان سے مہتم بالشان کارنامے ایک طرف ہوں گے اور قومی مستقبل کے ساتھ یہ ایک
ت ایک طرف۔ اور اس خیانت کا بوجھ زیادہ ہی ہوگا۔ اس لئے کہ جب موجودہ کانگریسی
زارتیں دستور کے نقص کی وجہ سے بنیادی تبدیلیوں سے قاصر ہیں تو پھر تو ان کی کامیابی کا معیار
بس ۔ سب کہ وہ قوم کو اس دستور کے بدلوانے اور پوری قوت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش
نے تیار کرتے ہیں یا نہیں۔ اور جب تک وہ ہندو مسلمان کی یہ باہمی بے اعتمادی ——— چاہے
ہی غیر منطقی اور غیر عقلی ہی ثابت کی جا سکے ——— رفع نہ کر لیں یہ تیاری پوری نہیں کی جا سکتی۔
ن وزارتوں پر ہماری قومی زندگی کے مستقبل کی ذمہ داری ہے خدا کرے یہ اس سے اچھی طرح
ہدہ برآ ہوں۔

ذ۔ح



"مسولینی صاحب کے نرالے تیور"
کسی نہ کسی سے کسی نہ کسی بات پر ضرور لڑیں گے!!

شمالی یورپ | رسالہ جامعہ کی پچھلی اشاعت میں ایک مضمون شمال کے برفیلے رقبہ میں روس کی صنعتی بحری اور جنگی تیاریوں کے متعلق شایع ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ روسی اس علاقہ میں کس انہاک سے کام کر رہے ہیں۔ روسی ہواباز متعدد بار قطب شمالی کے اوپر سے اڑکر امریکہ پہنچ چکے ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پائیگا کہ قطب شمالی پر کا ہوائی راستہ دنیا کے طیاروں کی شاہراہ بن جائے گا۔ اس لئے کہ ہماری دنیا کے سب اہم مرکز دنیا کے شمالی نصف میں واقع ہیں۔ اگر دنیا کی چھت پرسے اڑکر سفر کیا جائے تو ان مرکزوں کے درمیان کا فاصلہ اس سے کم ہو جاتا ہے کہ زمین کی کمر کے چاروں طرف اڑکر اسے طے کیا جائے۔ لندن سے ٹوکیو جانے کے لئے اگر خط استویٰ کے پاس پاس جائیے تو زیادہ دور کا سفر ہے قطب شمالی پرسے اڑکر پہنچ جائیے تو کم۔ یہی حال ماسکو سے سین فرانسسکو یا نیویارک سے شنگھائی کے سفر کا ہے، پھر اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ روسی اپنے ہوائی جہازوں کو مشرق بعید میں ایسے راستہ سے بھیج سکتے ہیں جہاں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ دشمن کے ہوابازوں کو نہ تو اس سرد علاقہ میں اڑنے کی مشق ہوگی نہ لاسلکی کے وہ قطبی مرکز ان کے ہاتھ میں ہوں گے جو روسی ہوابازوں کو منٹ منٹ کی خبر دیتے ہیں۔ روس جاپان کی جنگ ہوئی تو روسی ہوائی جہاز جاپانی محاذ پر عقب سے حملہ کر سکیں گے۔ اور اگر امریکہ روس کے ساتھ ہوا تو برابر روس کی مشرقی فوج کو قطب کے اوپر سے ہو کر سامان پہنچ سکے گا، اور جاپانی اس راستہ میں کچھ نہ کر سکیں گے۔

لیکن اس جاپانی۔ روسی جنگ سے زیادہ آج کل روس اور جرمنی میں جنگ کے امکانات پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ لندن کے اخبار پچھلے دنوں شمال میں فوجی تیاریوں کی عجیب عجیب داستانیں شایع کرتے رہے ہیں۔ کسی نے رات کو ناروے اور سویڈن کے شمال میں فوجی طیاروں کو اڑتے دیکھا ہے، کسی نے ایک جرمن آبدوز کو چھپ کر ساحل کے پاس آتے دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنرل بلوم برگ بھی خفیہ طور پر ناروے کے ساحل کا تفصیلی معائنہ کر گئے ہیں، مرمانسک بندرگاہ میں روس بھی پوشیدہ تیاریاں کر رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شمال کے یہ ممالک عرصہ سے جنگ سے مامون ہیں۔ سویڈن اور ناروے تو نپولین کے

جنگ کے بعد سے محفوظ رہے ہیں، ڈنمارک ۱۸۶۴ء میں پروشیا سے لڑا تھا اس کے بعد سے کسی سے نہیں۔ یہ ملک جمعیتہ اقوام اور امن عالم کے بھی بڑے حامی ہیں۔ انھوں نے اب تک بلا کسی شرط کے اور دوسروں سے بھی اس کا مطالبہ کئے بغیر اپنی فوجی قوت کو گھٹایا ہے۔ لیکن آج جبکہ اس پُرامن حصہ میں بھی ہر دم جنگ کا ذکر ہے۔ بات یہ ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے اس شمالی علاقہ میں کل چار با اختیار ریاستیں تھیں آج دس ہیں۔ نئی ریاستیں کچھ پرانے روسی علاقہ میں سے بنائی گئی ہیں، کچھ جرمن علاقہ میں سے۔ روس اور جرمن کی موجودہ رقابت سے ان ریاستوں کے لئے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

سب سے زیادہ خطرہ میں ڈنمارک ہے۔ پسے جنگ کے بعد جرمنی کا کچھ علاقہ بھی دیا گیا تھا۔ اس چھوٹے سے ملک کا ساحل ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ کا ہے۔ اور کہیں کوئی ساحلی چٹان نہیں، سب صاف سپاٹ میدان۔ جرمنی کو کچھ تو اپنا علاقہ واپس لینے کا حوصلہ ہے، کچھ یہ کہ سرحد کے پاس ہی اس کے ہوائی جہازوں اور بعض جنگی صنعتوں کے خاص مرکز ہیں۔ ڈنمارک کسی طرح اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ان کے مشہور سیاسی ہوئرپ کا قول تھا کہ "اسلحہ کس کام کے؟" چنانچہ اس نے اپنی فوجوں کو برابر گھٹایا۔ آج کل ۸ ہزار فوج ہے، ۵۰ ہوائی جہاز ہیں، اور بیڑہ کا مجموعی وزن ۱۱ ہزار ٹن! لیکن باوجود اس بے بسی کے یہ بھی اب جنگ کے لئے کچھ نہ کچھ تیاری کر رہے ہیں۔

سویڈن کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں اچھا لوہا نکلتا ہے۔ اور اس لوہے کا بہت بڑا حصہ جرمنی کو جاتا ہے۔ پچھلے سال میں جتنا کچھ لوہا جرمنی میں آیا اس کا تقریباً آدھا سویڈن سے خریدا گیا ہے۔ اور جرمنی جنگ میں مبتلا ہو جائے تو شاید لوہا حاصل کرنے کا ایک موقع یہیں سویڈن سے ہی ہو۔ روسی چاہیں گے کہ یہ رسد بند ہو جائے۔

ناروے اس جھگڑے میں یوں آلودہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوہا جاتا ہے اس کے بندرگاہ ناروک سے جو سویڈی کانوں کے قریب ہے۔ چنانچہ سویڈن اور ناروے بھی اپنا فوجی خرچ بڑھا رہے ہیں فنستان جس نے روس سے الگ ہو کر آزادی حاصل کی ہے اب اپنے دوسرے شمالی ساتھیوں کی

ملا ہوا ہے ۔ جنگ کے بعد بحیرہ بالٹک کے جزائر آلینڈ اسے دے گئے تھے، حالانکہ سویڈن انہیں اپنا حق سمجھتا تھا ۔ سویڈن کو خوش کرنے کے لئے ۱۹۲۱ء میں یہ طے ہوا تھا کہ ان جزائر کے فوجی قلعے مسمار کر دیئے جائیں ۔ لیکن اب یہ کا یہ حال ہے کہ مشترکہ اغراض کے تحفظ کے لئے سویڈن والے اس پر راضی ہیں کہ ان جزائر کو فوجی مرکز بنا دیا جائے ۔ اور روس والے اس پر خاصے برہم ہیں ۔

غرض اس علاقہ میں بھی جنگ کا خوب چرچا ہے ۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ ان امن پسند ملکوں کی فوجی تیاریاں نہ روس سے حفاظت کے لئے کافی ہوں گی نہ جرمنی سے ۔ اس لئے یہ اس فکر میں ہیں کہ برطانیہ سے روابط بڑھائیں کہ وہ جنگ کی حالت میں ان کی مدد کرے ۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ اپنے باہمی اتحاد عمل کو بڑھا کر معاشی تعاون کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ جنگ کی صورت میں یہ دوسروں کے بالکل دست نگر نہ ہوں ۔ (ز ۔ ح)

چینی جاپانی تعلقات | یہ اقتباس ایک مشہور جاپانی رسالہ "نگی شنجو" سے لیا گیا ہے ۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ جاپانی، چین سے اپنے تعلقات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ۔ دوسرے نانکنگ کی حکومت پر چینی اشتراکیوں کے اس اثر کی جو متحدہ چین، کی تحریک کے سلسلے میں پڑا ہے، (جس کا ذکر تفصیل سے ہم اپنی پچھلی اشاعت میں کر چکے ہیں) کچھ دلچسپ تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں ۔

کچھ دن ہوئے میں سیر و سیاحت کی غرض سے چین کے شمالی علاقے میں گیا تھا ۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ لوگوں کو کہتے سنا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ چینی جاپانی تعلقات اس وقت تک خوش گوار نہیں ہو سکتے جب تک کوئی بنیادی فیصلہ نہ ہو جائے ۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو میں تین تسین (TIENTSIN) پہنچا ۔ ایک دن یہاں کے ایک بڑے بازار سے گزر رہا تھا کہ یکایک میری نظر چین کے ایک نقشے پر پڑی جو ایک بہت بڑے کتب فروش کی دوکان میں شیشے کی بیرونی کھڑکی میں لٹک رہا تھا ۔ اگرچہ یہ نقشہ مئی ۱۹۳۶ء کا چھپا ہوا تھا لیکن اس میں منچوریا کو چین کا ایک حصہ دکھلایا تھا اور اس کے تمام صوبوں اور شہروں کے نام وہی تھے جو "مان چوکو" کی تعمیر سے پہلے تھے ۔ اسی

، تخ دیواروں اور تار کے کھمبوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے دیکھے جن میں قومی نعرے درج تھے۔ بہ حدک مت ر نے چینیوں کے قومی جذبے کو جس شدت کے ساتھ اُبھارا تھا جاپانی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بڑی موٹی بے بنیاد باتیں متحرک تصویروں کے ذریعہ دکھائی جاتی تھیں اور جاپان کے خلاف چینیوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے جاپانی سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی خوشی سے سوئین کی جنگ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی موثر پروپگنڈا کرنا نہیں جانتے۔

اس سفر میں "سیان" کے حادثے کے متعلق جو باتیں مجھے معلوم ہوئیں وہ ان روایات سے مختلف ہیں جو جاپان میں بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً جاپان میں کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اس جنگ میں ماؤ سے تنگ، چوطے (MAE TSE TUNG ' CHUTE. ، چو این لائی کمیونسٹ رہنما بھی شریک تھے۔ چین میں یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ مارشل چیانگ کائی شک کی رہائی کے سلسلہ میں نانکنگ کے مدبرین نے اس عام جذبے کی حمایت کا یقین دلایا تھا جو جاپان کے خلاف تمام چین میں پھیلا ہوا تھا۔ نیز انھوں نے ۶۰ (ساٹھ) لاکھ "یان" چاندی کی در بیس لاکھ نانک کے نوٹوں کی شکل میں کمیونسٹوں کی سپاہ اور (CHANG HSUEH LIANG) اور (YANG HU CHANG) چانگ سوے لیانگ اور یانگ ہوچنگ کی فوجوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا سرخ فوج کے لئے بہت سے ہتھیار اور جنگی ساز و سامان مہیا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ اس میں موٹر گاڑیاں اور بیس ہوائی جہاز بھی شامل تھے جو سیان میں حکومت نانکنگ کے قبضے میں تھے۔ ان کے علاوہ حکومت کا یہ بھی وعدہ تھا کہ وہ ہر مہینہ نصف لاکھ یان ( ) یانگ ہوچنگ کی معرفت سرخ فوج کو دیتی رہیگی۔ یہ ہیں وہ واقعات اور تفصیلات جن پر جاپان کو خاص طور سے غور کرنا چاہئے۔ اُسے چاہئے کہ وہ سیان کے حادثے کی تحقیقات کرے۔ اسی کے ساتھ ساتھ چین میں پیش آنے والے آئندہ واقعات کو بھی سامنے رکھنا چاہئے اور پھر طے کرنا چاہئے کہ چین کے معاملات میں اس کا کیا رویہ رہیگا۔

اسی کے برابر اہم وہ اعلان بھی ہے جو کومن تانگ نے شائع کیا ہے اور جو ایک اعتبار سے سیان کے حادثے کے جاری رہنے کا سبب بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلان میں بار بار اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ کومن تانگ مملکت چین میں کسی قسم کی شورش پسند نہیں کرتی اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس وقت تک چینی اور جاپانی تعلقات کی تجدید ناممکن ہے جب تک مشرقی ہوپی کی حکومت اور خود ہوپائی اور چہار کا ملکی نظم و نسق بیرونی انتداب سے پاک نہ ہو جائیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ چین اور جاپان کے رجحانات میں کس قدر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ ایک طرف جاپان یہ سمجھتا ہے کہ مان چوکو ایک خودمختار ریاست کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ چین سے ہر طرح علیحدہ ہے۔ دوسری طرف چین تعلقات کی تجدید اس وقت تک کرنے کے لئے تیار نہیں جب تک مانچوکو پہلے کی طرح اس کے قبضہ میں نہ آ جائے۔ اور چین کو کاروباری تعلقات میں برابر کا مرتبہ نہ حاصل ہو جائے۔

دوسری طرف روسی حکومت شمالی چین میں اپنا اقتدار بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔ چینیوں کی سرخ فوج کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اور سیان کے حادثے کے بعد سے جنگی ساز و سامان میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر کام آ سکے۔ اگرچہ خود چین میں ابھی اتنی قوت نہیں پیدا ہوئی کہ وہ جاپان کا مقابلہ کر سکے، لیکن چینیوں کی سرخ فوج سے نانکنگ کا پلہ بھاری ہوتا چلا جا رہا ہے اگر لڑائی چھڑ جائے تو یقیناً چینیوں کی سنٹرل فوج سرخ فوج کے جرنیلوں کے بڑھنے کے لئے راستہ صاف کر دے گی۔ چین سے کوئی معاملہ کرتے وقت جاپان کو یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ چین میں جاپانیوں کی مخالفت کی اصل وجہ یہی سرخ فوج رہی ہے۔

غرض شمالی چین میں اپنی سیاحت سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ جمود پر غالب آنے کے لئے جاپان کو مناسب ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ آسے چاہئے کہ وہ فروعی باتوں کو چھوڑ کر چینی جاپانی تعلقات استوار کرنے کے لئے نانکنگ کی حکومت سے بنیادی مسائل طے کرے!

پہلا بنیادی مسئلہ مانچوکو کی ریاست کا ہے۔ جاپان کو چینیوں کے سامنے مانچوکو کے وجود کی غرض و غایت کی اچھی طرح تشریح کر دینی چاہئے اور نانکنگ کی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ

...کو کی نئی حکومت کو ایک خود مختار ریاست تسلیم کرلے ۔ دوسرا ضروری مسئلہ یہ ہے کہ چین اور جاپان
...ے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہو جانا چاہیئے جو چین سے کمیونسٹ تحریک کا خاتمہ کردے ۔ دوسرے
...ں کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ مشرق سے کمیونزم کا بالکل خاتمہ ہو جائے ۔ اس کے بعد اگر
...انگ کی حکومت کے رویہ سے یہ ظاہر ہو کہ وہ مشرق بعید میں سرخ فوجوں کی قوت دور کرنے کے لئے
...ہیں کرنا چاہتی تو پھر جاپان کو مجبوراً چین میں ایک قابل اعتماد (!) حکومت قائم کرنی پڑے گی۔
...ر اگر جاپان ایشیا میں کوئی نئی روح نہیں پیدا کرنا چاہتا اور نہ اس میں اس کی اہلیت ہے تو اُسے
...ر اعظم سے دست کش ہو جانا چاہیئے۔ (ب - ل)



سیاسی بازیگری

تعلیمی دنیا

گورنمنٹ آف انڈیا کے ماہرین تعلیم مسٹر وڈ اور ایبٹ کی رپورٹ شائع ہوگئی ہے۔ رپورٹ کا بنیادی اصول کتابی تعلیم کی مخالفت اور فنی اور صنعتی تعلیم کی حمایت ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے رپورٹ میں نظام تعلیم کی نئی تشکیل کے لئے سفارشات کی گئی ہیں۔

حکومت تجرباتی طور پر دہلی اور لاہور میں دو صنعتی ادارے کھولنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ دہلی میں تو اس اسکول کے نصاب کا تعلق صنعت پارچہ بافی سے ہوگا جو دہلی کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ لاہور میں کوئی بڑی صنعت نہیں اس لئے وہاں کا مدرسہ ریلوے کے محکمہ کے لئے طلبا کی تربیت کا انتظام کرے گا۔ بالخصوص ڈاک اور تار اور محکمہ رفاہ عامہ کی تعلیم پر توجہ دی جائے گی۔ اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کی طرف سے ان تمام محکمہ جات کا پورا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائیگی تاکہ طلبا کو تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت حاصل کرنے میں مناسب سہولتیں بہم پہونچائی جاسکیں۔

مہاتما گاندھی نے اخبار ہریجن میں مسئلہ تعلیم پر اپنے ذاتی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :-

"ہر بچے کی تعلیم کسی مفید دستکاری سے شروع ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنی تربیت کے آغاز سے ہی اپنے ہاتھ سے چیزیں بنانا شروع کردے۔ اور اگر حکومت مدرسوں کی تیار کردہ اشیاء کو خریدنے کا انتظام کردے تو ہر اسکول مالی لحاظ سے اپنی مدد آپ کر سکیگا۔ طریقۂ تعلیم کے متعلق گاندھی جی کا خیال ہے کہ پہلے تعلیم زبانی ہو اور بعد میں الف بے پڑھائی جائے۔ یہ تجویز بادی النظر میں تو حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے مگر اس سے محنت میں بہت بچت ہوگی۔ اور طالب علم سال بھر میں ہی بہت کچھ سیکھ سکے گا۔ مہاتما جی نے ابتدائی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ اور نیز اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ انگریزی زبان کی تدریس کی اہمیت کم کرنا چاہئے۔ کالج کی تعلیم کا حیات ملی سے گہرا تعلق ہونا چاہئے۔ اور صنعتی و حرفتی اداروں اور ٹکنیکل شعبوں کا کارخانوں سے الحاق ہونا چاہئے۔ مثلاً ٹاٹا کا کارخانہ ایک انجنیرنگ کالج اپنی طرف سے جاری کردے۔

کچھ عرصہ ہوا، ڈاکٹر ٹیگور نے ایک ایسی انجمن کے قیام پر زور دیا تھا جو ان اشخاص کے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہونچا سکے جنہیں کبھی درسی تعلیم کا موقعہ نہیں ملا۔ اس انجمن کے مقاصد میں سے مختلف مضامین پر مفید مطلب کتابوں کی فہرستیں مرتب کرنا، ایسی موضوعات پر کتابیں تیار کرنا جو بازار میں دستیاب ہی نہیں ہو سکتیں، اور مختلف مرکزوں میں ایسے طلبا کے امتحان لینا جنہوں نے اس سلسلے میں تعلیم پائی اور نتائج کے طور پر اسناد عطا کرنا۔ وشوابھارتی نے اس کام کو اپنے ذمے لے لیا اور بنگال کے لئے ان تجاویز کا خاکہ بھی منظر عام پر آچکا ہے

تحریک تعلیم بالغان انگلستان میں ۱۸۹۹ء میں شروع ہوئی اور آج نیشنل ایڈلٹ سکول یونین کے زیر اہتمام ۱۲۰۰ سے زائد مدرسے اس اہم فرض کو انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارے کا تعلق ایک دوسری تحریک سے بھی ہے جس کا مقصد تعلیم بالغان کے اصولوں کا تمام دنیا میں پرچار کرنا ہے۔ اس کی بین الاقوامی کمیٹی کچھ عرصے سے ہندوستان میں مسئلہ تعلیم بالغان پر خاص طور پر توجہ دے رہی ہے۔ اسی سلسلے میں مسٹر ہوم اور ان کی بیوی نے پچھلے موسم سرما میں ہندوستان کا ایک تعلیمی دورہ کیا جس کے دوران میں ان کو ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی اداروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بالخصوص ناگپور میں انھوں نے نیشنل کرسچین کونسل کے مباحثوں میں شرکت کی۔ مسئلہ تعلیم بالغان کونسل کے اس اجلاس کا خاص موضوع تھا۔ نیشنل یونین کی طرف سے ہندوستان میں تعلیم بالغان کے موضوع پر ایک "ہینڈ بک" تیار کی جارہی ہے جس میں ہندوستانی اور انگریزی ماہرین تعلیم کے مقالات ہونگے۔ ان میں سر رادھا کرشنن اور پروفیسر سیدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نیز انجمن تعلیم بالغان دہلی، شہر میں تعلیم بالغان کا ایک مرکز قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔

ڈاکٹر نیل کنٹھ داس رائے نے اندھوں کی تعلیم کے لئے ہندوستان کی ضروریات کے مطابق بریل سسٹم ایجاد کیا ہے جو تمام ہندوستانی زبانوں کے لئے کام آسکے گا۔ مرکزی مشاورتی بورڈ اس ایجاد میں خاص دلچسپی لے رہا ہے اور صوبائی حکومتوں کی رائے بھی اس کے جاری کرنے کے سلسلے میں دریافت کی جارہی ہے۔

ریاست بڑودہ کی پچھلے سال کی تعلیمی رپورٹ کے مطالعہ سے ریاست میں تعلیمی ترقی کے متعلق بعض دلچسپ باتیں ظاہر ہوتی ہیں، جو برطانوی ہند کے ماہرین تعلیم کے لئے بھی قابل توجہ ہیں۔

ریاست میں لازمی ابتدائی تعلیم کی برکت سے پچھلے دس سال کے اندر پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اس سال ۵۳ دیہاتی کتب خانے اور ۸ عورتوں اور بچوں کے کتب خانے قائم کئے گئے۔ ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد بڑھانے کی پالیسی پر شدت سے عمل کیا گیا۔ نیز تمام ممکن وسائل مثلاً ریفریشر کورس تعلیمی سائل اور پرچوں۔ تنخواہ کے اضافے۔ بونس وغیرہ سے اساتذہ کی لیاقت اور قابلیت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔

حکومت مدراس نے تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں ایک اعلان شائع کیا ہے۔ لازمی تعلیم کے متعلق حکومت کا خیال ہے کہ فی الحال جبریہ تعلیم سے زیادہ اہم مسئلہ موجودہ مدارس کی تعلیمی اصلاح ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کا معیار گھٹاکر ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کو زیادہ ترقی دی جائے۔ مڈل اور ہائی اسکولوں کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔ یونیورسٹی میں داخلے پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ اس آخری مقصد کی تکمیل کے لئے حکومت قوانین ملازمت میں ضروری ترمیم کے لئے آمادہ ہے۔

برٹش گی آنا کے ہندوستانی باشندگان نے دوسری ہندوستانی کانفرنس کے موقع پر حکومت سے استدعا کی ہے کہ ان کو پبلک بورڈوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔ جبریہ تعلیم کا قانون زیادہ سختی سے نافذ کیا جائے تاکہ ہندوستانی طبقے میں خواندگان کی تعداد میں معقول اضافہ ہوسکے۔ نیز ٹریننگ کالج میں ہندوستانی طلباء کیلئے زیادہ تعداد میں نشستیں مخصوص کردی جائیں۔

ہوائی کی یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کا اک شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا نام "اورینٹل انسٹیوٹ" ہوگا۔ مسٹر سنکلیر ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ کے قول کے مطابق۔ ہندوستان کی تہذیب اور اس کے ادبی خزائن اہل یونان اور روما کے تمدنی شاہکاروں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس مقصد کیلئے یورپ

نی طرف سے ڈاکٹر کالیداس ناگ کلکتہ یونیورسٹی کو ہندوستانی تمدن کے موضوع پر چھ تقاریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ جن میں ہندوستانی ادب ۔آرٹ۔فن سنگ تراشی مصوری وغیرہ پر بحث کی گئی۔ ڈاکٹر ناگ انسٹیٹیوٹ کی بنیادی تشکیل اور انتظام میں بھی بطور ماہر ادب وفنون ہند مشورہ دے رہے ہیں۔

پروفیسر سر پی سی ۔رے استاد کیمیا کلکتہ یونیورسٹی پچھلے دنوں بوجہ ضعیف العمری اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ پروفیسر موصوف ہندوستان میں علم کیمیا کی تدریس اور تحقیقات کے پہلے علمبردار ہیں۔ نہ صرف انھوں نے سینکڑوں طلبار کو علم کیمیا کی اہمیت سے روشناس کرایا بلکہ ہندوستانی صنعت دواسازی بھی ان کی کچھ کم مرہون منت نہیں۔ بنگال فارمیسوٹیکل کمپنی کو جاری کر کے انھوں نے ولایتی اور ہندوستانی ادویہ کی صحیح کیمیائی ترہیت اور خالص پیداوار کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ نجی زندگی میں پروفیسر موصوف قرن اولے کے اساتذہ کا نمونہ ہیں طبیعت میں انتہائی سادگی ہے۔ انھوں نے اپنی بیش قرار تنخواہ ہمیشہ طلبار کے وظائف اور امدادی رقوم کے لئے وقف رکھی ۔اور پچھلے دنوں ہی انھوں نے اپنے کمپنی کے سالہا سال کے جمع شدہ منافع کو یونیورسٹی میں کیمیاوی تحقیقات کے لئے وقف کر دیا۔ آپ نے اعلان کیا ہے کہ وہ درسی کام سے فارغ ہو کر دیہات سدھار پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے۔ قارئین جامعہ کے لئے یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ پروفیسر موصوف نے جامعہ ملیہ کے پہلے تقسیم اسناد کے جلسہ میں ایک معرکتہ الآرا صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اور اس کے بعد بھی ہمیشہ جامعہ کے کام میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شاہ سلیمان چیف جسٹس الہ آباد نے دنیائے سائنس کے سامنے نظریۂ اضافیت کے مقابل ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ جو نیوٹن کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ان دو متضاد نظریوں کا حتمی فیصلہ ان علمی تجربات اور مشاہدات پر ٹھیرا جو پچھلے اپریل میں سورج کے مکمل گرہن پر جاپان میں کئے گئے تھے ۔حکومت ہند نے اس غرض کیلئے ڈاکٹر رایڈ کو ایک علمی وفد کا قائد بنا کر بھیجا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے مشاہدات کی بنا پر حال ہی میں رائل سوسائٹی لندن میں ایک مقالہ پڑھا ہے۔ جس میں ڈاکٹر سلیمان کی پیشین گوئی کو صحیح اور نظریۂ اضافیت سے حساب کردہ پیش گوئی کو تجربی طور پر غلط بتایا۔ ڈاکٹر سلیمان نے ستاروں کی شعاع کے متعلق جو پیشین گوئی کی ہے۔ اس پر ڈاکٹر میخائی لوف کام کر رہے ہیں اور اس کے نتائج

بھی چند ماہ میں شائع ہو جائیں گے۔

جامعہ ازہر کے مفتی اعظم شیخ المصطفیٰ مراغی نے اعلان کیا ہے کہ وہ عنقریب دنیا بھر کے مسلم علماء کو ایک نمائندہ اجتماع میں شریک ہونے کی دعوت دینگے جو امور ذیل کو بحث و نظر کے بعد قابل تعمیل بنا سکیگا۔ (۱) اسلامی دنیا میں دینی مدارس کے قیام کا مسئلہ۔ (۲) نصاب دینیہ کا تعین اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح۔ (۳) تبلیغ اسلام کے اسباب و وسائل وغیرہ۔ شیخ المصطفیٰ المراغی ان چند روشن خیال اور بلند حوصلہ علماء میں سے ہیں جو ہمارے دینی نصاب و طریق تعلیم کی اصلاح کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ شیخ موصوف نے پچھلے دنوں ہی جامعہ ازہر میں بنیادی اصلاحات جاری فرما کر دنیائے اسلام پر احسان کیا ہے۔ نیز چین۔ جاپان۔ ہندوستان۔ سوڈان وغیرہ میں علماء کے وفود بھیج کر اشاعت اسلام کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ شیخ موصوف کی قیادت میں اجتماع مذکور اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہوگا۔

چند مخلص قومی کام کرنے والی خواتین کی کوششوں سے روس کے بعض شہروں میں والدین کے لئے یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ یہ ادارے والدین کے لئے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور نگرانی کی راہ پر مشعل ہدایت کا کام کرینگے۔ نصاب کے چند اہم مضامین شادی اور کنبہ۔ بچوں کی تربیت۔ بچے اور تھیٹر۔ بچوں کے فالتو اوقات کا صحیح استعمال وغیرہ ہونگے۔ ان جماعتوں میں مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں داخل ہو رہی ہیں۔ بالعموم یہ ادارے کلب گھروں کے قریب کھولے گئے ہیں اور زمانۂ تعلیم سات ماہ سے دس ماہ تک ہے۔

بین الاقوامی پی۔ ای۔ این کانگریس کا پندرھواں اجلاس پیرس میں منعقد ہوا جس میں آزادیٔ تحریر کے موضوع پر بہت سی ضروری تجاویز متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ ایچ جی ولز کانگریس کے پرانے صدر نے ایک پیغام بھیجا جس میں آزادیٔ تحریر و تقریر پر بندشوں اور سختیوں کی شدید مذمت تھی۔

ایک تجویز میں حکومت جرمنی کی ان پابندیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی جو مقررین اور مصنفین پر عائد کردی گئیں ہیں بالخصوص حکومت کے اس اقدام پر سخت نکتہ چینی کی گئی کہ حکومت نے کارل فان اوزیٹسکی کو جنہیں

نوبل پرائز ملا تھا اوسلو جانے سے روکا۔ نوبل پرائز کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انعام پانے والے ادیب کو اوسلو میں ایک کمیٹی کے سامنے حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اور اپنے خاص مضمون پر ایک تقریر بھی کرنا ہوتی ہے۔

ایک تجویز میں اسپین کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کیا گیا۔ اور غرناطہ میں مشہور اسپینی شاعر لورکا کے قتل کی سخت مذمت کی گئی۔ کیونکہ متوفی نے اسپین کی سیاسی جنگ میں کسی گروہ کی بھی طرفداری نہ کی تھی۔ ایک بہت اہم تجویز میں ان پابندیوں کی شدید مذمت کی گئی جو بعض یورپی ممالک میں اقلیتوں کے تمدن اور تہذیب پر عاید کی گئی ہیں۔

اس کانگریس میں کارل کاپک (چکوسلوویکیا)، جیمز جائس (آئرلینڈ)۔ ڈاکٹر امیہ چکرورتی (ہندوستان)۔ جے ۔ بی پرسٹلے (انگلستان) وغیرہم نے شرکت کی۔

ورلڈ فیڈریشن آف ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کا ساتواں اجلاس ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ مضامین زیر بحث میں سے چند عنوان تعلیمی آزادی، ریڈیو کے ذریعہ السنۂ جدیدہ کی تدریس، ریڈیو کی نفسیات، تعلیمی صنعت و حرفت، ریڈیو کے ذریعہ ورزش، گھر اور مدرسہ کا اتحاد عمل، تعلیم کے ذریعہ بین الاقوامی یک جہتی اور مفاہمت، تعلیم اخلاق، دیہاتی تعلیم وغیرہ ہیں۔ مقررین میں سے خاص سربرآوردہ اصحاب سر حسن سہروردی نائب صدر میڈیکل کونسل ہند، پروفیسر پال منرو، ٹیچرز کالج کولمبیا، ڈاکٹر سٹیفن ڈگن ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن ہیں۔

اس سلسلے میں جاپان کے قومی آرٹ کی نمائش کا انتظام کیا گیا ہے جس کا انصرام واسیدا (Waseda University) اور ٹوکیو امپیریل میوزیم کے ہاتھ میں ہے۔ پھولوں کی نمائش ان اساتذہ کے ہاتھ میں ہے جو پرانے سجاوٹ اور ترتیب کے اصولوں کے ماہر ہیں۔ نمائش میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ نہ صرف پھولوں کی زیبائش کے پرانے اصولوں کا مظاہرہ ہو بلکہ مہمانوں کو ان مختلف طریقوں سے بھی آگاہ کیا جائے جن سے یہی اصول نئے گھروں کی زیب و زینت کے لئے کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتے ہوں۔

ہر صبح کانفرنس میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے متعلق فلمیں دکھائی گئیں۔ کانفرنس کی طرف سے مہمانوں کی ضیافت اور تفریح کے لئے تاریخی اور علمی سیروں کا انتظام کیا گیا۔

پچھلے دنوں انگلستان کے چند علمی حلقوں کی طرف سے تجویز پیش کی گئی تھی کہ لندن میں ہندوستانی آرٹ کی نمائش کی جائے۔ امید ہے کہ یہ تجویز اگلے موسم سرما تک عمل میں آجائے گی۔ اس سے پہلے لندن میں چینی اور ایرانی آرٹ کی نمائشیں ہو چکی ہیں جو ہر طرح کامیاب رہیں۔ ہندوستان میں بھی فن سنگ تراشی، مصوری، اور دیگر فنون لطیفہ کے نادر شاہکار موجود ہیں۔ خاص لندن میں بھی برٹش میوزیم، البرٹ میوزیم اور انڈیا آفس میں ہندوستانی آرٹ اور صنعت کے بہترین نمونے موجود ہیں۔

اوکسفورڈ یونیورسٹی نے سر عبدالرحیم صدر اسمبلی، سر تیج بہادر سپرو اور سر اکبر حیدری کو ڈاکٹر آف سول لا کی اعزازی ڈگری دی ہے۔

پیام تعلیم

اپنے مدرسے سے فارغ ہوکر ظاہر ہے کہ تھوڑا وقت تم ورزش اور کھیل کود میں صرف کرتے ہوگے۔ مگر اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ ہم تمھیں بہترین مشغلہ بتائیں! پیام تعلیم پڑھا کرو۔ یہ رسالہ محض تمھاری خاطر تو جاری کیا گیا ہے۔ اس میں تمھاری دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھے اور مزے دار قصے، کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات، لطیفے، مفید مشغلے، لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس کے پڑھنے کے بعد تمھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعے تمھارے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کہ مفید مشغلوں میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو۔ تمھاری خاطر ہم نے اس کی قیمت بھی بہت کم رکھی ہے۔

صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ) سالانہ

پیام تعلیم کا سال نامہ بھی اسی چندے میں ملتا ہے۔ اس کی قیمت خریداروں سے علیحدہ نہیں لی جاتی۔ یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمارے سال نامہ سے بڑھ کر بچوں کے کسی پرچے نے سال نامہ شائع نہیں کیا۔ اس سال بھی یہ سال نامہ بہت اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ صرف سال نامے کی قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

مضامین رشید

از

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اردو کے منتخب لکھنے والوں میں ہیں۔ خصوصاً ان کی مزاحیہ نگاری ملک کے ہر طبقے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشتِ زعفران، ترو تازہ شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوش نمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت دو روپے (عہ)

مکتبہ جامعہ، دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیرادارت : ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

نمبر ۴	اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء	جلد ۲۸

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپے (صہ) فی پرچہ آٹھ آنے (۸ر)

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پیامِ تعلیم

اپنے مدرسے سے فارغ ہو کر ظاہر ہے کہ تھوڑا وقت تم ورزش اور کھیل کود میں صرف کرتے ہوگے۔ مگر اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ ہم تمھیں بہترین مشغلہ بتائیں! پیامِ تعلیم پڑھا کرو۔ یہ رسالہ محض تمھاری خاطر جاری کیا گیا ہے۔ اس میں تمھاری دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھے اور مزے دار قصے، کہانیاں مفید اور دلچسپ معلومات لطیفے، مفید مشغلے، لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسے پڑھنے کے بعد تمھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعے تمھارے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے کہ مفید مشغلوں میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو۔ تمھاری خاطر ہم نے اس کی قیمت بھی بہت کم رکھی ہے۔ صرف

دو روپے آٹھ آنے (عہ) سالانہ

پیامِ تعلیم کا سال نامہ بھی اسی چندے میں ملتا ہے۔ اس کی قیمت خریداروں سے علیحدہ نہیں لی جاتی یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمارے سال نامے سے بڑھ کر بچوں کے کسی پرچے نے سال نامہ شائع نہیں کیا۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بہار میں اردو کانفرنس

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن استاد جامعہ

۲۰ اور ۲۱ اگست کو پٹنہ میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، اس کی روئداد پچھلی اشاعت میں شائع نہیں کی جا سکی اس لئے کہ رسالہ چھاپے خانے بھیجا جا چکا تھا۔ لیکن کانفرنس کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کی یادگار بحثوں کو اب بھی شائع کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کانفرنس کے اکثر ڈیلیگیٹ ادبی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتے ہیں، اور مختلف موقعوں پر جو خیالات ظاہر کئے گئے اور جو فیصلے ہوئے وہ مثال کا کام دے سکتے ہیں۔ کانفرنس انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کے سکرٹری قاضی عبدالودود صاحب، بی اے (کینٹب) کے اصرار پر منعقد کی گئی تھی۔ ان کو یہاں اختصار کے لئے سکرٹری صاحب انجمن کہا جائے گا۔ مولوی عبدالحق صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی، پنڈت برج موہن دتاتریا صاحب کیفی، مولانا ظفر الملک صاحب، پروفیسر غلام السیدین صاحب، پروفیسر رشید احمد صاحب، آل احمد سرور صاحب نے اپنی موجودگی سے کانفرنس کو زینت بخشی۔ میں جناب شیخ الجامعہ صاحب کے ارشاد پر جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ میرے نام بھی دعوت نامہ آگیا۔ غرض کہ میں بھی موجود تھا۔ یہ نہیں معلوم کہ کل کتنے لوگ بلائے گئے تھے۔ بہر حال معذرت کے تار نہیں سنائے گئے اور سکرٹری صاحب انجمن کے چہرے سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔

۲۰ کی صبح کو ہم سب سکرٹری صاحب کے دولت خانے پر جمع ہوئے۔ بعض لوگوں کو ٹھیک ٹھیک معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا چاہیئے، اس لئے کہ انھیں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی، لیکن بھٹکتے بھٹکتے وہ بھی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ کوئی مہمان باقی نہیں ہے، تو مولانا سید سلیمان صاحب سے صدارت کی درخواست کی گئی، اور انھوں نے سکرٹری صاحب سے کہا کہ انجمن کو بتائیں کہ کیا کرنا ہے اور کس ترتیب سے۔ کانفرنس کا کوئی ایجنڈا تیار نہ تھا۔ سکرٹری صاحب نے وہ رسالہ

پڑھنا شروع کیا جو تمام ڈیلیگیٹوں کے پاس بھیجا جاچکا تھا اور ان مختلف مسائل کی توضیح کرنے لگے جن کا اس میں ذکر تھا اور توضیح بھی کی جاچکی تھی۔ معلوم ہوا کہ دو اہم مسئلے ہیں جن پر کانفرنس کو رائے دینا ہے، ایک تو عدالت کی زبان، اور دوسرے تعلیم کی زبان۔ کچھ دیر اسی قسم کی باتیں سننے کے بعد سب اس پر متفق ہو گئے کہ عدالت کی زبان صوبجاتی مسئلہ ہے اور اس پر کانفرنس کا رائے دینا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ پھر تعلیمی زبان کا مسئلہ چھڑا۔ سکرٹری صاحب نے وہ تجویز سنائی جو پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ میں بابو بلدیو سہائے صاحب نے پیش کی تھی، کہ ہندستانی کو، جو صوبے میں عام طور پر بولی جاتی ہے، ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے۔ اس تجویز کے پیش ہونے کے تھوڑے دن بعد بہار کی انجمن ترقی اُردو کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں سکرٹری صاحب کی رائے جو ہندستانی کے متعلق تجویز سینٹ میں نہایت عجلت کے ساتھ پیش کردی گئی تھی منظور ہوئی اور ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس کا آخری حصہ یہ ہے:۔

"سینٹ کی تجویز میں علمی مضامین کے لئے میٹرکولیشن تک انگریزی کی جگہ ہندستانی ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے لیکن ہندستانی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بالکل ناکافی اور مبہم ہے۔ حامیانِ اُردو اسے تسلیم نہیں کرتے، اور انھیں بے حد اندیشہ ہے کہ ہندستانی کے نام سے ہندی ذریعۂ تعلیم نہ بنادی جائے۔ اس جلسے کی خواہش ہے کہ حامیانِ اُردو کے ایک وفد کو اس کا موقع دیا جائے کہ اس مسئلے کے متعلق اپنے خیالات حکومت کے سامنے پیش کرے اور اس کے بعد ذریعۂ تعلیم کے مسئلے کا فیصلہ کیا جائے۔"

اسی سلسلے کا ایک اور ریزولیوشن یہ بھی تھا۔

"چونکہ اُردو کا مسئلہ سارے ہندستان کا مسئلہ ہے اور زبان میں انقلاب انگیز تغیر الی ادب و انشا کے غور و خوض کے بغیر نہایت خطرناک ہے، یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ حکومت بہار ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق (مرکزی) انجمن ترقی اُردو سے دریافت کرے کہ وہ موجودہ زبان میں کس حد تک تغیر کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ کوئی فیصلہ جو اس انجمن کو، جو اُردو بولنے والوں کی نمائندہ

سلہ انجمن سے منظور نہیں، بہار کے حامیان اُردو کو منظور نہ ہوگا۔۔۔"

بہار کی انجمن کو خاص فکر اس کی تھی کہ (۱) سائنس کی اصطلاحات کس زبان سے لی جائیں گی (۲) ان اصطلاحات سائنس کا کیا حشر ہوگا جو روزمرہ کی زبان میں داخل ہو چکی ہیں' (۳) الفاظ کے داخل کرنے یا خارج کرنے کا کیا معیار ہوگا' (۴) ان الفاظ اور محاورات کے متعلق کیا عمل کیا جائے گا جو اُردو میں رائج اور مستند ہیں' ہندی میں نہیں' یا ہندی میں رائج اور مستند ہیں اور اُردو میں نہیں' (۵) اُردو ہندی کے صرف و نحو میں جہاں اختلاف پایا جاتا ہے وہاں کسے ترجیح دی جائے گی' اور (۶) ہندستانی کے بنیادی قواعد کون سی جماعت وضع کرے گی۔ چنانچہ اسی جلسے میں جہاں مندرجہ بالا ریزولیوشن پاس کئے گئے اس کا بھی اعلان کیا گیا کہ "یہ جلسہ گورنمنٹ کو آگاہ کرتا ہے کہ اگر متذکرہ بالا انجمنوں کے مشورے کے بغیر اُردو زبان میں کچھ تغیرات کئے گئے تو وہ بہار کے اُردو داں طبقے کے لئے ناقابل قبول ہوں گے۔"

سکرٹری صاحب نے یہی ریزولیوشن سنائے اور اپنے اندیشے بیان کئے، اگرچہ انھوں نے خیالات کی ترتیب اور طرح دی تھی۔ کانفرنس کے بعض ڈیلیگیٹ بے صبر ہو گئے اور ایک نے سلسلۂ گفتگو کو توڑ کر مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ایسی بحث تو کبھی ختم نہیں ہوتی' دو بجے راجندر بابو سے ملاقات کرنا ہے' اور اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے رخصت ہو جائیں تو اپنے خیالات کو اور اگر کوئی مطالبے ہوں تو انھیں ترتیب دے دینا چاہئے۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی' لیکن چونکہ سکرٹری صاحب ابھی کھڑے تھے' اس لئے ان سے درخواست کی گئی کہ اصولی بحث کو چھوڑ کر وہ بتائیں کہ انھیں شکایت کس بات کی ہے اور وہ کیسی اصلاح چاہتے ہیں۔ سکرٹری صاحب نے فرمایا کہ ٹکسٹ بک کمیٹی نے جتنی کتابیں مشترک زبان یعنی ہندستانی میں منظور کی ہیں وہ بلا استثنا، بہت ہی خراب زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بکثرت الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو اُردو کی کسی لغت میں نہیں ملتے۔ عام زبان کی جگہ عموماً گنواری زبان استعمال کی گئی ہے۔ نظم کے نام سے جو چیزیں ہیں ان میں قواعد عروض کا مطلق خیال نہیں کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی

فرمایا کہ ٹکسٹ بک کمیٹی میں ایسے لوگ کم ہیں جو غلط اور صحیح اُردو میں تمیز کر سکیں یا کتابوں کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کر سکیں ، اور اگر لوگوں کا رونا اور کتابوں کی زبان یہی رہی تو اُردو کا خاتمہ سمجھنا چاہیئے ٹکسٹ بک کمیٹی کی شکایتیں کرتے کرتے سکرٹری صاحب نے کہا کہ میں بھی اس کمیٹی میں تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہیں اور جب میں کوئی اعتراض کرتا ہوں تو وہ اسے تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ ہاں بھائی تم ٹھیک کہتے ہو، ہم تو کچھ کر نہیں سکتے ، لیکن تم جس طرح کی ترمیم پیش کرو ہم منظور کر لیں گے اور جس کتاب کو تم ناقص پاؤ اُسے ہم خارج کر دیں گے ۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں تمام کتابوں کو دیکھتا ، اور چونکہ اور کسی کو اس کام سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے استعفا دیدیا یہ کیفیت سن کر کانفرنس کے کان کھڑے ہوئے اور مولانا ظفرالملک صاحب نے کہہ بھی دیا کہ قاضی صاحب آپ نے بڑی سخت غلطی کی، مگر استعفا تو کب کا منظور کیا جا چکا تھا اور کانفرنس کو بیٹھ کر سنتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔ پھر کسی نے ان کتابوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جن کی زبان کا رونا رویا گیا تھا۔ سکرٹری صاحب کو شاید توقع نہ تھی کہ کانفرنس والے ایسی کھوج کریں گے اور ان کے یہاں کتابیں تھیں بھی نہیں ۔ ایک صاحب بھیجے گئے تو وہ ساٹھ کتابوں میں سے کل چار عدد ڈھونڈھ کر لا سکے ، اور باقی کے متعلق وعدہ کیا کہ تلاش کر کے لا دیں گے ۔ ان چار کتابوں کو سب نے الٹ پلٹ کر اور ادھر ادھر سے پڑھ کر دیکھا ۔ سیدھی سادی سلجھی ہوئی زبان تھی، "لڑکو" کے ساتھ قوسین میں " بالکو " تھا تو " محبت " ، " نفرت " " عداوت " جیسے لفظ بھی بغیر ہندی کے ہم معنی الفاظ کے لکھے ہوئے تھے ۔ نظمیں میر اور غالب کے کلام کی ہم پلہ نہ تھیں تو دیہاتی بچوں کے لئے خاصی اچھی اور موزوں تھیں اور ان میں عروض کے خون کے بھی ایک ہی دو ننھے ننھے بوند دکھائی پڑے ۔ تب کسی نے کہا کہ قاضی صاحب ، ہمیں تو ان کتابوں کی زبان میں کوئی خاص عیب نظر نہیں آتا ، اب آپ کوئی مثال دیجئے تو ہم شاید اپنی رائے بدلیں ۔ سکرٹری صاحب نے ایک کتاب اٹھائی اور اُسے پڑھنا شروع کیا ۔ صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھ گئے اور کوئی غلطی ایسی نہ ملی جو کانفرنس کے سامنے جتائی جاتی ۔ پھر انھوں نے ایک نظم شروع کی ، اور پہلے مصرع کو کہا کہ دیکھئے بالکل ناموزوں ہے ۔ مگر اسے بھی پروفیسر غلام السیدین صاحب

نے ایک لفظ کا تلفظ صحیح کرکے پڑھا تو وہ موزوں نکلا۔ سکرٹری صاحب نے کتاب رکھ دی اور کہا کہ اصل میں ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ معیار فصاحت کیا ہے۔ اس پر ایک صاحب بڑبڑانے لگے اور سیدین صاحب نے فرمایا کہ میری رائے میں یہ کتابیں ان کتابوں سے ہرگز بدتر نہیں ہیں جو یوپی میں مشترک زبان کی ریڈریں کہلاتی ہیں۔ اور ہاں یوپی میں بڑی کوشش کرنے کے بعد یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ نظم کا حصہ مشترک نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہندی اُردو کے قواعد عروض میں بڑا اختلاف ہے۔ اس لئے ہمیں بہار کی ریڈروں کے اس حصے پر سخت تنقیدی نظر نہ ڈالنا چاہئیے۔ معیار فصاحت کی بحث اپنی جگہ پر ٹھیک ہے، لیکن ایسی کتابوں میں جو زیادہ تر دیہاتی بچوں کے لئے لکھی گئی ہوں اس معیار کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں تو بول چال کی زبان کے قریب تر لانے کی فکر کرنا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

اس موقع پر وہی حضرت جنھوں نے پہلے کہا تھا کہ راجندر بابو سے گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئیے پھر بول اُٹھے کہ اس کے متعلق کچھ نہیں طے ہوا۔ اب کانفرنس متفقہ طور پر راضی تھی کہ خیالات کو ترتیب دیا جائے، اور جناب صدر نے یہ تجویز کیا کہ کانفرنس ہندستانی زبان کی ایسی تعریف کرے جو سب کو منظور ہو، اور پھر اس تعریف کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ کیا تجویز کیا جا سکتا ہے۔ پنڈت کیفی صاحب نے ہندستانی کی تعریف کی، اور کسی قدر بحث کے بعد کانفرنس نے قریب قریب کامل اتفاق رائے سے طے کیا کہ "ہندستانی سے مراد اس ملک کی وہ زبان ہے جو اس ملک کی ہندو مسلمان قوموں کے میل ملاپ سے بنی ہے اور جس کو شمالی ہندوستان کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں اور ہندستان کے دوسرے رہنے والے عام طور سے سمجھتے ہیں اور جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے نامانوس الفاظ سے خالی ہو اور اُردو اور دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے۔" زبان کی اس طرح تعریف کرنے کے بعد پھر باقی باتوں کا جلد جلد فیصلہ ہو گیا۔ ہم انھیں ترتیب وار دیتے ہیں:-

(۱) ابتدائی چار جماعتوں کی کتابیں ایسی عام اور آسان ہندستانی زبان میں لکھی جائیں جو اُردو اور ہندی رسم خط کے اختلاف کے علاوہ یکساں طور سے اُردو اور ہندی بولنے والوں کی سمجھ میں آسکیں۔

(۲) ایسی کتابوں کے انتخاب اور منظوری میں جو طریق عمل اس وقت جاری ہے وہ قابل اطمینان نہیں ہے۔ حصہ نثر میں کم اور نظم میں زیادہ اس قسم کی بے عنوانیاں ہیں جن کی اصلاح ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر اس اصول کو سامنے رکھنا لازم ہے کہ ہندی اور اُردو کے طلبار کی ذہنیت اور مذاق پر ایسا اثر نہ پڑے جو آگے چل کر ان کے ادبی مذاق کی ترقی میں حائل ہو۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کا حصۂ نظم لازمی طور پر مشترک نہ ہو۔

(۳) ثانوی جماعتوں میں اُردو پڑھنے والوں کو ہندی اور ہندی پڑھنے والوں کو اُردو سیکھنا لازمی ہوگا، جیسا کہ صوبۂ متحدہ میں ہوتا ہے۔

(۴) ابتدائی جماعتوں میں علوم کا ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہوگی۔ علمی اصطلاحیں کوشش ہو کہ ہندستانی سے بنائی جائیں، اور جو رائج ہیں وہ برتی جائیں، اور جو موجود نہ ہوں ان کے لئے ہندی اُردو کی عام فہم اصطلاحوں کو ایک ساتھ استعمال کیا جائے۔

(۵) ثانوی جماعتوں میں ادبی ریڈریں علیحدہ ہوں۔ ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہو، بشرائط بالا۔

(۶) قواعد زبان، اصطلاحات اور لغات کے لئے انجمن ترقی اُردو اور ہندی کی کسی نمائندہ جماعت سے مساوی تعداد میں لوگ لئے جائیں جو ان باتوں کا فیصلہ کریں۔ اختلاف کی صورت میں اُردو سب کمیٹی کی رائے اُردو رسم خط کی کتابوں کے لئے اور ہندی سب کمیٹی کی رائے ہندی رسم خط کی کتابوں کے لئے فیصلہ کن سمجھی جائے۔

یہ سب طے کرنے کے بعد کانفرنس نے شرف الدین حسن صاحب رئیس باڑھ کے یہاں دعوت کھائی اور پھر سب لوگ سکرٹری صاحب کے مکان پر راجندر بابو اور بلدیو سہائے صاحب سے ملاقات کے لئے پہنچے۔ راجندر بابو یا کانفرنس والوں کو وقت بتانے میں کوئی غلطی ہوگئی تھی ہم لوگ جب پہنچے تو راجندر بابو انتظار کر رہے تھے۔ کانفرنس کے بعض لوگوں کو ڈر تھا کہ کہیں یہ ملاقات ہندی اُردو ہندستانی کے چھیڑے ہوئے جذبات کو برانگیختہ نہ کرے، لیکن یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوا۔ سب راجندر بابو سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ

ہدیو سہائے صاحب، جو اس وقت کانگریسی حکومت کے سرکاری وکیل ہیں اور جنھوں نے یونیورسٹی سینٹ میں ہندستانی کے متعلق ریزولیوشن پیش کیا تھا تشریف لائے۔ انھیں جلدی تھی اور ان کی درخواست پر راجندر بابو اور کانفرنس والے اس پر راضی ہوگئے کہ پہلے ان سے گفتگو کر لی جائے۔ ان کا انداز اس شریف آدمی کا سا تھا جس پر بیجا الزام لگائے گئے ہوں۔ انھوں نے یہ انداز کیوں اختیار کیا تھا یہ کانفرنس کو معلوم نہ ہو سکا، ہم نے تو بس یہ دیکھا کہ سکرٹری صاحب اپنی کرسی گھسیٹ کر بلدیو سہائے صاحب کے سامنے لے آئے، اور ہمیں ان کے لہجے میں کچھ تیزی محسوس ہوئی، مگر شاید یہ وہ گرمی تھی جو کسی کل کے دیر تک چلتے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کانفرنس والے تو بس ہوں ہاں کرتے رہے، اس لئے کہ دوران گفتگو میں جو انکشافات ہوئے انھوں نے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

(۱) کانفرنس نے 'ہندستانی' کی ایسی تعریف کر لی تھی جو معیار کا کام دے سکتی تھی، اور چونکہ سکرٹری صاحب نے فرمایا تھا کہ 'ہندستانی' کی جو تعریف سینٹ میں کی گئی تھی وہ " بالکل ناکافی اور مبہم ہے" اور اس کی وجہ سے " بیجا اندیشہ ہے کہ ہندستانی کے نام سے ہندی ذریعۂ تعلیم نہ بنادی جائے" اس لئے کانفرنس بلدیو سہائے صاحب کی تعریف کو اپنی کسوٹی پر جانچنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن بلدیو سہائے صاحب نے بسم اللہ اس سے کی کہ میں زباں داں ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، میں اور میرے خیال کے لوگ بس یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہے۔ ہندی کیا ہے اور ہندستانی کیا یہ آپ لوگ جانئے، ہم نے سینٹ کے ریزولیوشن میں تو عام بول کی زبان کو تعلیمی زبان بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ان کے پاس اس کارروائی کی روئداد موجود تھی، انھوں نے ہم کو ریزولیوشن پڑھ کر سنایا۔ اس پر واقعی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سکرٹری صاحب نے بھی وہ ریزولیوشن پڑھا تھا اور اس کا ترجمہ بھی ٹھیک کیا تھا، لیکن ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے سمجھ لیا کہ اصل انگریزی عبارت کا مطلب عام بول چال کی زبان نہیں عوام کے بول چال کی زبان ہے، اور اسی بنا پر انھوں نے ہم سے شکایت کی تھی کہ یہاں کے لوگ عوام کی بول چال کو ہندستانی کا نام دے

بتے ہیں، حالانکہ یہاں عوام کی کوئی ایک بولی نہیں، بلکہ اکثر ضلعوں میں ہر گانو کی الگ بولی ہے جسے پڑوس کے دوسرے دیہاتی بھی نہیں سمجھتے ۔ بلدیو سہائے صاحب نے سینٹ کا رزولیوشن دو بارہ پڑھ کر سنایا ۔ ہم سر ہلا کر چپ ہو گئے ۔ کوئی کہتا تو کیا کہتا ؟

(۲) اس کے بعد بلدیو سہائے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے یہاں اُردو ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے ۔ میں نے حفیظ صاحب کے ساتھ دورہ کر کے دیکھا کہ اکثر اسکولوں میں ایک ہی استاد اُردو ہندی بولنے والوں کو ساتھ ساتھ پڑھاتا ہے، اُردو والے اُردو کی کتاب، ہندی والے ہندی کی سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں، اور سبق اور استاد کی باتیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔ یہ واقعہ بیان کر کے سمجھئے بلدیو سہائے صاحب نے کانفرنس کے سر پہ دو پتھر مارا ۔ ہمارے پاس طریقِ تعلیم کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھی اور ہمیں کچھ بتایا بھی نہیں گیا ۔ سکرٹری صاحب خود اس حقیقت سے واقف نہیں تھے یا انھوں نے ایسی ذرا سی بات کا ذکر کرنا بالکل فضول سمجھا . . . .

حفیظ صاحب، جو ایک سربرآوردہ وکیل اور موجودہ اسمبلی کے رکن ہیں آ نہیں سکے تھے یا بلائے نہیں گئے تھے، اس لئے بلدیو سہائے صاحب کے بیان کی تائید یا تردید نہیں کی جا سکتی تھی ۔ ہم پھر چپ ہو گئے۔

(۳) اس کے علاوہ ہمیں معلوم ہوا کہ ٹریننگ کالج میں داخلے کے جو امیدوار ہوتے ہیں ان میں ایسوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ہندی اُردو دونوں جانتے ہوں، اور ٹریننگ اسکولوں میں دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں ۔ استادوں کے تقرر میں پہلا حق ان لوگوں کا مانا جاتا ہے جو ان دونوں زبانوں کو اچھی طرح جانتے ہوں ۔ یہ سب باتیں بھی سکرٹری صاحب کو معلوم نہ تھیں یا انھوں نے ہم کو بتائیں نہیں ۔ بلدیو سہائے صاحب جب رخصت ہوئے تو کانفرنس والوں کو بھی بستر باندھ کر اپنے اپنے گھر چل دینا چاہیئے تھا، یا اتنے دنوں ٹھہرنے کا ارادہ کر لینا چاہیئے تھا کہ سکرٹری صاحب غور و فکر کے لئے ضروری مواد فراہم کر دیں ۔ بلدیو سہائے صاحب جاتے جاتے یہ بھی فرما گئے کہ سینٹ کے فیصلے کے بعد اب آپ لوگوں کا کام ہے کہ ہماری ہدایت کریں ۔ میں تو قاضی صاحب سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں کہ ہماری مدد اور ہماری کوششوں کی اصلاح کریں ۔ اُردو ہندی کے معاملے میں فیصلہ کرنا درکنار میں تو

نے آپ کو کوئی رائے رکھنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ آپ لوگ جو کچھ فیصلہ کریں اسے میں منظور کروں گا۔ پہلے سکریٹری صاحب اسی بات کی شکایت کر چکے تھے کہ سارا کام انھیں کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ ایک دفعہ ٹکسٹ بک کمیٹی سے استعفا دے چکے تھے۔ مگر اس وقت کچھ فخر تھا کہ وہ اس ...مہ داری کے مستحق سمجھے جا رہے ہیں۔

بلدیو سہائے صاحب تشریف لے گئے تو راجندر بابو سے گفتگو شروع ہوئی۔ وہ نہایت ہی شائستہ، منکسر مزاج اور صلح پسند آدمی ہیں، اُردو یا ہندستانی بہت صاف اور صحیح اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں، لیکن شاید اسی وجہ سے کہ وہ اہل ادب و انشا میں زبردستی شامل کر لئے گئے ہیں ان کے سامنے کوئی معیار فصاحت نہیں، اور وہ اُردو بولنے والوں کو مخاطب کرتے ہیں تو ایسی اُردو اور ہندی سمیلن میں ایسی ہندی بولتے ہیں کہ اہل ادب و انشا ان کے پیچھے نہ پڑیں، اور سننے والوں کی خواہش کا لحاظ کرنے کی بدولت بعض لوگوں کو خیال ہو گیا ہے وہ زبان کے معاملے میں تعصب برتتے ہیں۔ اس ملاقات میں انھوں نے جو باتیں کیں ان پر متعصب اُردو داں کسی قسم کا اعتراض نہ کر سکتا تھا۔ آخر میں ان سے یہ طے ہو گیا کہ اُردو ہندی جاننے والوں کی مجلس ہندستانی کی لغت تیار کرنے کے لئے قائم کی جائے گی۔ غلام السیدین صاحب نے گفتگو کا انداز دیکھتے ہی راجندر بابو اور مولوی عبدالحق صاحب کی طرف سے مشترک اعلان شایع کرنے کی تجویز پیش کی، دوران گفتگو میں اعلان کا مسودہ تیار ہوا، اور اس پر دستخط بھی ہو گئے۔

کام ختم ہوتے ہی لوگ دعوتوں میں شریک ہونے کو چلد ئیے۔ دوسرے دن صبح تک جو کچھ ہوا وہ کانفرنس والوں کا ذاتی معاملہ تھا۔ دعوتوں سے بہرحال کوئی ہرج نہیں ہوا۔ دوسرے دن بھی حاضری پوری تھی۔

لیکن کام کچھ نہیں تھا۔ ایک صاحب کی تحریک سے بابو بلدیو سہائے صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہ نوٹ کر لیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خواجہ محمد نور صاحب، جج ہائی کورٹ، تشریف لائے، اور ان سے بھی بہت کچھ جو کانفرنس والوں کو پہلے سے بتایا جانا چاہیئے تھا، معلوم ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ بلدیو سہائے

صاحب نے جو کچھ استادوں کے بارے میں بیان کیا تھا وہ صحیح ہے، لیکن عموماً جس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے وہ بہت خراب ہوتی ہے۔ انگریزی، ہندی اور اردو کے پرچے جانچنے کے لئے الگ الگ ممتحن ہوتے ہیں، اور امتحانوں میں کوئی ایسی بے انصافی نہیں ہوتی جس کی شکایت کی جاسکے۔ عدالتوں میں اس وقت ہندی رسم خط رائج ہے اور رائج رہے گا۔ اس سلسلے میں اردو کے ساتھ جو زیادتی کی گئی وہ ایک تاریخی واقعہ ہے، اس کا ہندی اردو کی موجودہ کشمکش سے کوئی واسطہ نہیں، اب اس کی شکایت کرنا فضول ہے۔ اس وقت کاغذات اگر ہندی رسم خط میں ہوتے ہیں تو دوسری طرف زبان اور اصطلاحیں وہی ہیں جو پہلے تھیں، جب عدالتی زبان اردو تھی۔

گفتگو کے سلسلے میں ایک بہت دلچسپ بات معلوم ہوئی۔ سکریٹری صاحب انجمن نے پہلے روز درسی کتابوں کی زبان پر جو اعتراض کئے تھے ان میں سے کانفرنس نے ایک بھی تسلیم نہیں کیا۔ مگر جب انھوں نے فرمایا کہ ان کتابوں میں بھیڑئے کی جگہ "ہنڈار" لکھا ہے اور بھیڑئے کو قوسین میں رکھا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ معیار فصاحت پلٹ دیا گیا ہے تو کانفرنس لاجواب ہوگئی، اس لئے کہ مولانا سلیمان ندوی کے سوا کسی نے بھی ہنڈار کا لفظ نہیں سنا تھا۔ چنانچہ اس وقت خواجہ صاحب سے اس کا فیصلہ کرنے کی درخواست کی گئی کہ ہنڈار اور بھیڑئے میں کس کو فضیلت حاصل ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بہار میں شہری اور دیہاتی سب ہنڈار ہی بولتے ہیں، میں آپ لوگوں کی ہنسی سے ڈر کر چاہے بھیڑیا کہوں، لیکن گھر پر میں بھی بھیڑئے کی جگہ ہنڈار بولتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ قاضی صاحب (یعنی سکریٹری صاحب) بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ چونکہ اردو اور ہندستانی دونوں کو بول چال کی زبان ہونے کا دعویٰ ہے اور لکھنؤ جیسے مرکز فصاحت میں بھی گیدڑ کو سیار کہنے کی اجازت ہے۔ اس لئے سکریٹری صاحب کا یہ آخری اعتراض بھی رد کر دیا گیا اور بھیڑئے کو ہنڈار کہنا بہار والوں کے لئے صحیح مانا گیا۔

اس جلسے کے بعد صاحب کے یہاں کھانے اور سچدآنند سنہا صاحب، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے یہاں چائے کی دعوت تھی۔ ساڑھے چھ بجے کیفی صاحب، سیدین صاحب، مولوی

عبدالحق صاحب، مولانا سلیمان ندوی صاحب اور رشید صدیقی صاحب نے سینیٹ ہال میں ہندو مسلمانوں نے ایک بہت بڑے جلسے میں تقریریں کیں۔ یہ کانفرنس کی آخری کارروائی تھی۔

مسلمانوں کی تہذیب کا سہارا اب لے دے کر بس ان کی زبان رہ گئی ہے، اور اگر یہ سمجھ کر کہ وہ خطرے میں ہے ان کے چند نمائندے پہنچ جائیں، بڑے لوگوں سے مل لیں اور بڑے جلسوں میں تقریریں کر لیں تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے دل و دماغ پر اب تک نیند کی سستی چھائی ہے، اور ہم ایک دوسرے پر اتنا کم بھروسا کرتے ہیں کہ کسی کے ذکر چلا اٹھنے پر بھی لوگ ہمدردی میں اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو خیال ہوتا ہے کہ قوم کا پرانا معمول بدل رہا ہے۔ پٹنہ کی کانفرنس میں جو بھی گیا اس لئے گیا کہ اس کے دل میں مسلمانوں کی اور ان کی زبان کی قدر تھی، اور اس نے دعوت قبول کرنا اپنا فرض سمجھا۔ کانفرنس کرنے کی جو غرض تھی وہ بھی ایک حد تک پوری ہوئی۔ لیکن ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ پٹنہ کے بہت سے مسلمان جو اُردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو پہلے سے یہ نہیں بتایا گیا کہ کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے، اور بہت سے ہندو دوستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ کانفرنس ہندی کی مخالفت یا اس سے مقابلہ کرنے کے لئے بلائی گئی ہے۔ کانفرنس کی خوش قسمتی سے کانگریسی حلقوں میں ایک بات بنانے والا موجود تھا، ورنہ ایک جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ کانفرنس بہت سے مقامی لوگوں کے تجربے اور معلومات سے مدد حاصل نہ کر سکی، اور ان لوگوں کی اس نئی صورت بھی نہیں دیکھی جن سے اس جمہوری دور میں زبان کی سچی خدمت کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ تعمیری کام کا شوق بڑے مجموعوں میں برجستہ تقریریں کرنے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے آنکھ کو آنکھ سے، دل کو دل سے ملنا ہوتا ہے۔

کانفرنس کے دوسرے جلسے میں کام ختم کرنے کے بعد پروفیسر غلام السیدین صاحب نے سکریٹری صاحب انجمن کو تنبیہ کی تھی کہ اب لغت اور محاورے اور معیار فصاحت پر بحث کرنے کا زمانہ نہیں ہے، اب اصولاً ہمیں کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنی زبان کو عوام کی زبان کے قریب تر لائیں ملے زیادہ

سے زیادہ آسان کر کے زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔ لیکن اہل ادب و انشا تو ان ملکوں میں جہاں جمہوری نقطۂ نظر عادت بن گیا ہے اپنی محبت الگ چاہتے ہیں، ہندستان میں اس گروہ کی خود پسندی کب گوارا کرے گی کہ وہ زبان کو پھیلانے میں مدد دے۔ چنانچہ یہ کانفرنس چند شبہات جو ایک صاحب کے دل میں پیدا ہو گئے تھے رفع کر کے منتشر ہو گئی۔ اس سے نہ پوچھا گیا اور نہ اس نے بتایا کہ زبان کو پھیلانے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور کون سے لوگ ہیں جو اس فرض کو انجام دینے کا حوصلہ یا استعداد رکھتے ہیں۔ کانگریسی وزارت کے تعلیمی منصوبوں کا بھی کوئی ذکر نہیں آیا، اس لئے یہ سوال بھی پیدا نہ ہوا کہ مسلمانوں کو خدمت کا حق وصول کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کرنا چاہئیں۔ غضب تو یہ ہے کہ ہماری انجمن ترقی اردو کی کارگذاری بھی اس کے سامنے پیش نہیں کی گئی، اور سوائے اس کے کہ اس کے ڈیلیگیٹوں نے ایک اخبار کے لئے سفارشی خط پر دستخط کئے، اس سے کسی قسم کی عملی امداد کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ کارکنوں اور ہمدردوں کے اس رویے کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق اندیشے پیدا ہوں تو کیا بیجا ہے؟

مسلمان، کانگریس اور مسلم لیگ

از جناب ریاض صاحب سابق ایڈیٹر ملت دلنوید

مسلمان مسلم لیگ کے ذریعہ اپنی تنظیم کریں یا کانگریس میں داخل ہو جائیں اس مسئلہ پر رسالہ جامعہ کی اشاعت ماہ اگست میں کسی صاحب نے بحث فرمائی ہے۔ نام کی جگہ انھوں نے اپنے کو "ایک قوم پرست مسلم" لکھا ہے۔ مسلم اور قوم پرست! ایک عجیب سی بات ہے۔ مسلمان کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ صرف خدا پرست ہو اور کوئی پرست نہ ہو۔ لیکن اب وہ وطن پرست بھی ہو سکتا ہے اور قوم پرست بھی اور پھر بھی مسلم رہ سکتا ہے۔ عجب نہیں کہ کوئی قوم پرست اس اعتراض کو دیکھ کر یہ کہے کہ "وہی کٹ ملا پن، وہی قل اعوذ یوں کی سی گفتگو، اسی وجہ سے تو مسلمان تباہ ہیں اتنی باریکیوں پر غور کر کے لفظ پرست تھوڑی لکھا گیا ہے" اور اگر ذرا ذہین ہوئے اور بحث کی طرف مائل ہو گئے تو ممکن ہے کہ یہ فرمائیں "ہم سیاسی حیثیت سے قوم پرست ہیں اور مذہبی حیثیت سے خدا پرست۔ بحث چھڑنے پر معترض بھی طرح طرح کے سوالات کر سکتا ہے۔ وہ پوچھے گا کہ معاشی حیثیت سے؟ تمدنی حیثیت سے؟ زراعتی حیثیت سے؟ صنعتی اور حرفتی حیثیت سے؟ تجارتی حیثیت سے؟ جنگی حیثیت سے؟ ادبی حیثیت سے؟ علمی حیثیت سے جناب کیا ہیں؟ اندیشہ ہے کہ پھر یونانیوں کی پوری فہرست اصنام بغیران تمام سوالات کا جواب دینا جو اس سلسلہ میں پیدا ہو سکتے ہیں مشکل ہوگا۔ پھر معترض بھی اگر طبیعت کا سقراط ہوا تو وہ پاک اور ناپاک، انصاف اور ناانصافی کی بحث چھیڑ دیگا۔ مختلف حیثیتوں کے اصولوں میں تصادم ہوگا، مختلف حیثیتوں کے دیوتا دست و گریبان ہوں گے، زندگی ایک ہنگامہ اور خلفشار بن جائے گی کیسی مشکل ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ اخبار نویس الفاظ کا ترجمہ کرنے میں بڑے بے احتیاط ہیں۔ پیٹری اٹ (PATRIOT) کا ترجمہ وطن پرست اور نیشنلسٹ (NATIONALIST) کا ترجمہ قوم پرست کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی بلا غور کئے یہی الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں، پرستش کا حقیقی مفہوم کسی کے

ذہن میں نہیں ہوتا مگر یہ اعتراض میں نے ضرورتاً قائم کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مضمون کے خاتمے پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے جداگانہ تنظیم نہیں کرنی چاہئے کانگرس میں شریک ہو جانا چاہئے اور مذہبی اور تمدنی اغراض کے لئے جداگانہ تنظیم کرنی چاہئے۔

اب یہاں کیسی اہم بحث پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہب، سیاست، اقتصادیات اور تمدن بالکل الگ الگ ہیں، ان کے درمیان حدود فاصل قائم ہیں یا یہ سب باہم مربوط ہیں ؟

ترکی گورنمنٹ نے ٹرکی میں یورپین قسم کی چھجے دار ٹوپی رائج کردی ہے۔ چونکہ یہ گورنمنٹ کا حکم ہے اس لئے سیاسی ہے مگر لباس کے متعلق ہے لہٰذا عمل میں آتے ہی تمدن کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اس ٹوپی میں چھجہ ہے اس لئے سجدہ نہیں ہو سکتا عبادت میں حارج ہے۔ اب یہ وسیع معنی میں نہیں بالکل محدود معنی میں مذہبی مسئلہ ہو گیا۔ مجبوراً نماز پڑھنے کے لئے ٹرکی کے مسلمان کپڑے کی ایک دوسری ٹوپی جیب میں رکھتے ہیں ہر وقت دو ٹوپیاں۔ کپڑے کی ٹوپی بار بار دھلتی ہے اس وجہ سے ان کو ایسی کئی ٹوپیاں رکھنی پڑتی ہیں ایک ہی حکم کا یہ چوتھا اقتصادی پہلو ہے ایک بہت ہی چھوٹی اور خفیف سی بات ہے مگر ایک ساتھ سیاسی بھی ہے، اقتصادی بھی ہے، تمدنی بھی ہے اور مذہبی بھی ہے۔ پھر اسی ایک مثال سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ سیاست مذہب کے اثرات سے بالکل آزاد ہونے کے بعد بھی کس قدر مداخلت پسند واقع ہوئی ہے کہ اتنی اتنی سی بات کا انتظام کرتی ہے کہ ٹوپی کیسی پہنیں اور انھیں اس پر مجبور کرتی ہے کہ ایسی پہنیں جس سے وہ نماز نہ پڑھ سکیں۔

"سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں" لوگوں کے ذہن میں اس خیال کی تاریخ محفوظ نہیں ہے ورنہ وہ یہ بات ایسی آسانی سے نہ کہیں۔ جس زمانے میں یورپ کی حکومتیں کلیسا سے دبی ہوئی تھیں اور کلیسا اپنے اقتدار کا غلط استعمال کر رہا تھا تو اس دور کے حکمرانوں نے کلیسا کے استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے یہ ایک اصول وضع کیا تھا۔ لیکن جب اس کوشش میں کامیابی ہوگئی تو حکومت اور سیاست غالب ہوگئی اور کلیسا مغلوب ہوگیا۔ کلیسا میں سیاست کی مداخلت شروع ہوگئی، یہ نہ ہو سکا کہ مذہب کا دائرہ عمل الگ ہو جاتا اور حکومت کا الگ۔ صاحب قوت جو کوئی بھی ہو مداخلت پسند ہوتا ہے اور بالخصوص

سیاست سب سے زیادہ ۔

روس میں اس وقت اقتصادی سیاست کا دور ہے لیکن مذہب میں جتنی مداخلت وہاں ہے اور کہیں نہیں ہے ۔ خدا کے خلاف حکومت کی طرف سے ایک مستقل تحریک جاری ہے کسی کی مجال نہیں کہ خدا پر اعتقاد رکھے ۔ یہ انھیں سوشیلسٹوں اور کمیونسٹوں کا عمل ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں مذہب ہر شخص کا نجی معاملہ ہے ۔

ہر سیاست اور تمدن کا ایک پس منظر ہوتا ہے روس کے موجودہ تمدن اور سیاست کا پس منظر زار روس کا استبداد اور زار کی شہنشاہی کے موید کلیسا کا جبر ہے اس لئے روس کی بالشویکی حکومت بادشاہت اور مذہب کی عداوت سے کبھی پاک نہیں ہو سکتی ۔

یورپ نے مظلوم اور بے یار و مددگار عیسائیت کو اپنے دامن قوت وسیاست میں پناہ دی تھی اور اپنی شرائط پر اس مذہب کو قبول کیا تھا، یعنی دور جاہلیت کے تمام رسم و رواج قایم رہیں گے ۔ لہٰذا وہی پس منظر یورپ کے تمدن میں منعکس ہے ۔ مذہب سیاست کا خدمت گار ہو کر رہ سکتا ہے، افراد کا نجی معاملہ ہے وہ سیاست میں مخل نہیں ہو سکتا ۔ یورپ کا تمام فلسفہ سیاست اسی خیال پر مبنی ہے اور جس روز سے یورپ کی سیاست کو مشرق پر غلبہ حاصل ہوا ہے اس خیال کی خوب تبلیغ کی جارہی ہے اور ہم اس سے متاثر ہیں ورنہ یہ بات کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں ایسی لچر بات ہے کہ اس پر ذرا استدلال کیجئے یہ ایک خیال پریشان ثابت ہوگی ۔

اس خیال کے مویدوں کے پاس اس کے سوا، اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ یورپ کامیاب ہے اور ہم ناکام ہیں ۔ مگر یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے ۔ مسلمانوں نے بھی ایک زمانہ میں بڑی بڑی حکومتیں قایم کی ہیں ۔ ان کی سیاست اس وقت ساری دنیا پر غالب تھی اور اس وقت بھی وہ اس کے قائل نہ تھے کہ سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں ۔ بلکہ اس کے قائل تھے کہ مذہب زندگی کی تمام سرگرمیوں پر حاوی ہے ۔ پھر ٹھیک اسی دن سے زوال شروع ہوا جس دن سے سیاست مذہب کے قابو سے باہر ہوئی ۔

کفر ہو یا اسلام مذہب ہو یا انکار مکمل اور مربوط ہونا چاہئے ضرور کامیاب ہوگا ۔ فرق صرف یہ رہیگا کہ

اسلام کی کامیابی دنیا کے لئے برکت اور راحت کا سبب ہوگی اور انکار کی کامیابی باعث زحمت اور پریشانی۔

یورپ کامیاب ضرور ہے مگر اس کامیابی کے نتائج کو اُسے اب سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے ساری دنیا میں اختلال کی سی صورت پیدا ہے۔ کہیں دولت کے ڈھیر ہیں اور کہیں کھانے کے لئے اتنا بھی میسر نہیں جتنا جینے کے لئے ضروری ہے۔

روس کی خلاف فطرت مساوات کا تماشا بھی دیکھتے جائیے۔ ابھی پورے بیس برس بھی تو نہیں ہوئے اسٹیلن کے زمانہ میں لینن کا کمیونزم باقی نہیں رہا افراد کے حق میں ترقی کے ساتھ مراعات جاری ہیں مگر پھر بھی تمدن میں توازن قایم نہیں ہوتا۔

جب تک متضاد عناصر کمزور ہیں بس اسی وقت تک خیر ہے جب طاقت ور ہو جائیں گے تصادم لازمی ہے۔ یورپ کا سرمایہ دارانہ اقتدار ایک مہیب دھماکے کے ساتھ عنقریب پاش پاش ہونے والا ہے روس کے بے ربط اور خلاف فطرت تمدن کی یہ ساعت شاید ابھی کچھ دور ہو۔ لامرکزی (CENTRIEFUGAL) میلانات دوسرے معاملوں میں ممکن اور مفید ہیں مگر مذہب اور تمدن میں ان کے لئے بالکل گنجائش نہیں ہے۔

اسلام دنیا کا آخری مذہب ہے اور قرآن آخری پیغام۔ یہ بالکل تازہ ہے اس میں سہو، نسیان اور تصرف و الحاق کو کوئی دخل نہیں ہے۔ مذہب کا صحیح تخیل وہی ہے جو قرآن پر مبنی ہو۔ قرآن میں ہر قسم کے اصول تعلیم کئے گئے ہیں، سیاسی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، تجارتی اور وہ بھی جو عبادت اور عقائد کے متعلق ہیں۔ غرضکہ اسلام جس طرح قرآن میں تعلیم کیا گیا ہے ایک مکمل تمدن اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا کامل اور مربوط ضابطہ ہے جس کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے۔ اگر مذہب محض عبادات تک محدود ہوتا تو قرآن زیادہ سے زیادہ ایک جزو کی کتاب ہوتی جس میں نماز روزہ اور بڑی مشکل سے حج کے متعلق کچھ احکام ہوتے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ قرآن کے تصور میں ایک عالمگیر تمدن ہے سیاست، اقتصادیات، معاشرت، معاشیات اور عبادت وغیرہ اس کے شعبے ہیں۔ قرآنی اخلاقیات (ETHICS) پر یہ سب مبنی ہیں اور یہی ان کے درمیان ربط قایم رکھتے ہیں۔

مذہب کے متعلق یورپ کا اور غالباً ساری غیر مسلم دنیا کا تخیل ناقص ہے۔ وہ صرف عبادت کو اور اللہ کے متعلق عقیدے کو مذہب کہتے ہیں۔ باقی تمام زندگی کے شعبوں کو اس دائرے سے خارج سمجھتے ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو کسی مذہب میں یہ احکام نہیں ہونے چاہئیں کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، غیبت نہ کرو، زنا نہ کرو، رشوت نہ لو، غصب نہ کرو، بخل نہ کرو، ظلم نہ کرو، قتل نہ کرو، انصاف کرو، جو مصیبت میں ہوں ان کی مدد کرو، سچی شہادت دینے سے گریز نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔

یہ احکام ہر اس مذہب میں موجود ہیں جو کسی کتاب پر مبنی ہے اور ان میں سے کسی چیز کا تعلق عبادت اور طریقہ عبادت سے نہیں ہے بلکہ سب سیاست، معاشرت، اقتصادیات اسی دنیوی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ہیں۔ حکمائے اخلاقیات نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ بھی سب یہی ہے۔ اسی کا نام ایتھکس ہے اور اسی پر سیاست اقتصادیات اور معاشرت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ اخلاقی اصول ان آسمانی کتابوں نے ان حکیموں سے اڑائے یا حکیموں نے فکر، بحث اور تشریح کے لیے ان کتابوں سے یہ اخذ کر لئے۔ مجھے یقین ہے کہ بات آخری ہی ٹھیک ہے۔ قرآن چونکہ تازہ ترین پیغام ہے اور مسلمانوں کی زبان پر ہے اس لئے مسلمان سیاست کے متعلق کہے، معاشرت کے متعلق کہے، اقتصادیات کے متعلق کہے وہ سب قرآنی تعلیمات اور اسی کے اصولوں کے حوالے سے کہتا ہے۔ یورپ والے جو کچھ کہتے ہیں وہ فلسفیوں کے حوالے سے کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اصل ماخذ ان کے ہاں بھول میں پڑ گیا ہے۔ یورپ کو اگر مذہب کے سلسلے میں کوئی چیز یاد ہے تو وہ صرف دور وسطیٰ کے ان پادریوں اور بطریقوں کا جاہلانہ تعصب، تنگ نظری اور تشدد ہے جنھوں نے تعلیم اور غسل تک کو حرام قرار دے دیا تھا۔

یورپ کا اہل سیاست جب سیاست میں مذہب کی مداخلت پر تحقیر اور نفرت کا اظہار کرتا ہے تو اس کے ذہن میں وہی غلط اور مکروہ مذہبیت ہوتی ہے اور ہمارے ان کے لوگ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یہاں تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی انہی کی کورانہ تقلید کرتے ہیں اور ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ تقلید کر رہے ہیں۔

کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ کارل مارکس کی کتاب اور لینن اور اسٹالین کے اقوال پر بلا سوچے سمجھے

ایمان لانا اور ان کے عمل کی تبلیغ کے لئے دیوانہ وار جدوجہد میں مصروف ہو جانا تو بہت قابل ستائش اور قابل ناز ہے! لیکن قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک یا اقوال کا ذکر بھی اس قدر مکروہ ہو گیا ہے کہ اس پر ہر طرف سے لعن طعن کی بوچھار اس طرح شروع ہو جاتی ہے گویا مذہب کے خلاف اشتراکی جہاد شروع ہو گیا۔ انسان کو اپنے عقائد کی تائید میں دیوانگی کرنا ضرور، مذہبی دیوانگی کا دور گیا دہری اور اشتراکی دیوانگی کا دور آ گیا۔

جھانسی کے الیکشن میں مسٹر جناح کے نام سے کسی صاحب نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں یہ عبارت تھی " انسانوں اور قوموں کی قوت اور ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ باہم متحد اور منظم ہوں اور تمام کام باہمی مشورے سے انجام دیں اور اللہ پاک نے یہی حکم مسلمانوں کو دیا ہے جس پر عمل کرنے سے غیر مسلم آج قوی اور ترقی پذیر ہیں .... ان جملہ تحریکات سے میرا مقصد محض اس قدر ہے کہ اپنے خدا و رسولؐ کے حکم کے موافق مسلمان آپس میں متحد اور منظم ہوں اور اپنے تمام معاملات اور کاموں کو باہمی مشورے سے انجام دیں اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہیں اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالیں "

جن لوگوں نے مسٹر جناح کی تقریریں سنی ہیں اور تحریریں دیکھی ہیں وہ اس عبارت کو بیک نظر دیکھ کر یہ کہدیں گے کہ یہ مسٹر جناح کا طرز بیان نہیں ہے۔ پھر جس شخص نے یہ عبارت لکھی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس کو انشاء میں کوئی سلیقہ ہے اور نہ اس کے خیالات مرتب اور مربوط ہیں لہذا اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ یہ اشتہار مسٹر جناح کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن اگر ہوتا بھی تو اس میں وہ کونسی ایسی بات ہے جس پر پنڈت جواہر لال نہرو اس قدر بکھرے اور مسٹر جناح سے انہوں نے اس طرح محاسبہ کیا جس طرح چوری یا قتل کے جرم سے کیا جائے کیا اس میں کانگریس کو ووٹ دینا کفر بتایا گیا تھا یا مسلم لیگ کو ووٹ دینے پر جنت کی بشارت تھی؟ متحد اور منظم ہونے کے لئے کہا گیا اور تاکید میں خدا اور رسولؐ کے احکامات یاد دلائے گئے۔

...... میں اس مسلمان سے پوچھتا ہوں جو سیاست اور اقتصادیات میں لینن، اسٹیلن اور پنڈت جواہر لال کا پیرو بننا چاہتا ہے اور اس بات کا دعویدار ہے کہ سیاست اور اقتصادیات میں مذہب

کا [illegible] دخل نہیں ہونا چاہئے بلکہ سیاسی اور اقتصادی تنظیم غیر مذہبی طور پر ہونی چاہئے کہ قرآن میں مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے یا نہیں کہ وہ خدا کی رسی کو مضبوط پکڑیں ؟ اور کیوں کہا گیا ہے ؟ کیا صرف اس وقت اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں جب نماز پڑھیں یا جب جنت میں جانے کے لئے زمین سے آسمان تک زینہ لگے اور اس کے دائیں بائیں اللہ کی رسّی باندھی جائے تو اس کو اس خوف سے پکڑ پکڑ کر چڑھیں کہ نیچے نہ [illegible] جائیں ۔

یورپ کی حیرت انگیز مادی ترقی سے مسلمانوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئی ہیں اور عقل و حواس معطل ہیں [illegible]الم یہ ہے وہ وقت دور نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے تنزل کا باعث اسلام ہی کو قرار دیدیں ۔ اب ان کی [illegible]ظر میں اپنی ہر چیز ذلیل ہے اور ذی اقتدار غیر مسلم دنیا کی طرف سے جو بات آئے وہ معزز اور محترم ہے ۔ کیسی دردناک حالت ہے !

انہوں نے شاید اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ یا وہ اسلام اور قرآن کو مکمل قبول کر سکتے ہیں یا وہ مجموعی طور پر اس کی ہر چیز سے انکار کر سکتے ہیں ۔ ان کے لئے یہ تیسرا راستہ بالکل بند ہے کہ وہ قرآن میں کچھ قبول کریں اور کچھ سے انکار کردیں ۔ اقتصادیات کارل مارکس کی ، سیاست روسو کی ، معاشرت [illegible]ومیوں کی ، تمدن گاندھی جی کا ، عبادات قرآن کی اس خلط ملط کی قرآن ہرگز اجازت نہیں دے سکتا ۔

سیاسیات میں ، اقتصادیات میں ، معاشرت میں اور جملہ امور دنیا میں اسلام کا ایک خاص نقطہ نظر اور مسلک ہے وہ مجموعی طور پر ایک جامع تمدن ہے دنیا کی ہر مجلس میں ذی ہوش مسلمان ایک پارٹی کی حیثیت رکھتا ہے وہ پارٹی اس وقت برسر اقتدار نہیں ہے یہ اور بات ہے ۔ ایک زمانے میں تھی اور پھر ہو سکتی ہے ۔

شاید اس موقع پر ترکوں ، مصریوں ، عراقیوں اور ایرانیوں کی مثال پیش کی جائے یہ سب [illegible]س وقت نیشنلسٹ اور یورپ کے پیرو بنے ہوئے ہیں ۔ یہ مثالیں بالکل ہمارے کام نہیں آسکتیں ۔ [illegible]سلام عربوں یا ترکوں کی پیروی نہیں ہے ۔ ہماری ہی طرح یہ بھی حیران ہیں ، ہارے ہوئے ہیں ، اور یورپ کے اقتدار سے مرعوب ہیں ، اپنے تنزل کے اسباب پر غور کئے بغیر یورپ کے طریقہ سیاست کا

تجربہ کر رہے ہیں انجام کار یہی ہوگا کہ یا وہ ہر حیثیت سے مسلمان رہیں گے یا کچھ اور ہو جائیں گے ۔ چنانچہ اس تھوڑے ہی عرصے میں بعض بعض جگہ بازگشت کے آثار نمودار ہو چلے ہیں اس سے زیادہ اور کوئی بات معقول نہیں ہو سکتی کہ مسلمان اس لئے ناکام ہیں کہ ان کی سیاست مذہب کے تحت میں ہے کسی اصول اور نظریے کے صحیح اور غلط ہونے کی یہ کوئی کسوٹی نہیں ہے کہ وہ ہنگامی طور پر کامیاب یا ناکام ہے روس میں کمیونزم کامیاب ہے، جرمنی میں نازی ازم کامیاب ہے، اٹلی میں فسیزم کامیاب ہے، فرانس اور امریکہ میں جمہوریت کامیاب ہے، انگلستان اور جاپان میں شاہی کامیاب ہے اور ان میں سے ہر ایک اصولی حیثیت سے دوسرے کی ضد ہے ۔

مسلمان اگر دنیا میں اپنا وجود قایم رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی اپنے تمدن و مذہب کی تمام خصوصیات کے ساتھ عمل کے میدان میں آنا چاہئے ۔ اگر اپنے علم اور نشان کے ساتھ انھوں نے فتح حاصل کی تو وہ مسلمانوں کی اور اسلام کی فتح ہوگی ۔ لیکن اگر انہی افراد نے جو اس وقت مسلمان ہیں سوشلزم، نازی ازم یا کمیونزم اختیار کر لیا تو مسلمانوں کی حیثیت سے انھوں نے تو ہتھیار ڈال دئیے شکست قبول کر لی ۔ وہ کمیونزم، سوشلزم یا نازی ازم کی فتح ہوگی جس پر مسلمانوں کو خوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں ۔

بعض لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ اگر مسلمان سود لینا شروع کر دیں تو ان کی اقتصادی بدحالی دور ہو جائے اور واقعی اس کی انھوں نے تبلیغ بھی کی ۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جی ہار چکے ہیں اور جنھیں اپنے ہتھیاروں پر بھروسہ نہیں رہا ہے ۔ اگر مسلمان سود لے کر امیر ہو جائے تو وہ یقیناً مسلمان کی حیثیت سے امیر نہیں ہوا بلکہ یہودی یا بنئے کی حیثیت سے امیر ہوا قرآن کے اقتصادی نظریے کے ایک پہلو سے وہ منکر ہوا اور یہودیوں اور بنیوں سے اس نے شکست کھائی ۔ اس معاملہ میں اس نے ان کا ایمان قبول کر لیا ۔

تعجب ہے مسلمانوں میں اب اتنا دم بھی باقی نہیں رہا جتنا انگلستان کی سیاسی پارٹیوں میں ہے ۔ گلیڈ اسٹون کے بعد سے انگلستان کی لبرل پارٹی تنزل پذیر ہے کبھی کنزرویٹو اور کبھی لیبر پارٹی اقتدار حاصل کر رہی ہے مگر لبرل اپنے اصولوں سے کسی طرح انحراف نہیں کرتے ۔ کتنی ہی اقلیت میں ہوں